مکالماتِ
اقبالؒ
سعید
راشد

مکالماتِ اقبالؒ

سعید راشد

بک کارنر
چوک فیصل شہید جہلم

اب پیشِ خدمت ہے

جُراتوں کے نشان

سعید راشد
شعبہ تعلیمی تحقیق ملٹری کالج جہلم

فوٹو آفسٹ طباعت

انتساب

اے ڈی سی ادیب

اہتمام ــــــ شاہد حمید شفیق الرحمٰن

بار اوّل ــــــ دسمبر ۱۹۸۲ء

مطبع ــــــ نظامی آرٹ پریس لاہور

سرورق ــــــ حنیف رامے

ناشر ــــــ بک کارنر جہلم

قیمت ۵۰ روپے صرف

باب اوّل

داستان حیاتِ اقبالؒ

بہ روایتِ اقبالؒ

باب دوم

سیرتِ اقبالؒ

مکالماتِ اقبالؒ

کے

آئینے میں

باب سوم

افکار و نظریات و تاثراتِ اقبالؒ

ملفوظاتِ اقبال کی روشنی میں

عنوانات

باب اوّل

داستانِ حیاتِ اقبال
بروایتِ اقبال

باب دوم
سیرت اقبال
مکالماتِ اقبال کے آئینے میں

باب سوم

افکار و نظریات، تاثراتِ اقبال
ملفوظاتِ اقبال کی روشنی میں

پیش لفظ

ڈاکٹر آغا افتخار حسین ،

افکارِ عالیہ کے اظہار کے لیے مکالمات کا استعمال نہایت قدیم اور دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کی شاندار روایات ملتی ہیں ۔ مکالمہ کی اہمیت خاص طور اس لئے ہے کہ اس میں برجستگی پائی جاتی ہے ۔ تصنع کو زیادہ دخل نہیں ہوتا ۔ اس طرح مکالمات میں ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جو دیگر اصنافِ سخن میں نہیں کہی جاتیں پروفیسر سعید راشد صاحب نے اس کتاب میں علامہ اقبال کے ان مکالمات کو ایک جگہ جمع کیا ہے جو مرحوم کے احباب نے مختلف مواقع پر قلم بند کیے ۔ یہی نہیں بلکہ پروفیسر صاحب نے ان مکالمات کو اس سلیقہ سے مرتب کیا ہے کہ ان سے علامہ کی سوانح تیار ہو گئی ۔ یہ ایک نہایت مفید اور دلچسپ ادبی کارنامہ ہے ۔ ان مکالمات میں علامہ کی پہلودار اور رنگارنگ شخصیت کے ایسے گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جن کے بارے میں ان کے کلام میں صرف اشارے ہی ملتے ہیں ۔ یہ کتاب اقبال شناسی کے ادب میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے ۔

خود کلامی

سعید : مکالماتِ اقبال کا مسودہ ایک نظر دیکھنے کے بعد ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مصنف کی حیثیت سے آپ ان کی وضاحت کرنا پسند کریں گے ۔

راشد : پہلی بات تو یہ ہے کہ مَیں اس کتاب کا مصنف نہیں ، مولف ہوں صرف ترتیب و تالیف کا ذمہ دار ۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ مکالمات تو اقبال کے ہیں ۔ ان کو ملفوظات و افادات کی حیثیت سے بہت سے لوگوں نے بیان کیا ۔ مَیں نے ان کو اس طرح ترتیب و تشکیل دینے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی زندگی ، شخصیت اور افکار کی ایک تصویر کم از کم ایک خاکہ بن جائے ۔

سعید : میرا پہلا سوال تو کتاب کے نام ہی سے متعلق ہے ۔ مکالمات اقبال ، مکالمات اقبال کے مشہور زمانہ کتاب افلاطون کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے اور چونکہ مکالمات افلاطون میں افلاطون کی زبانی سقراط کے فلسفیانہ نظریات سے بحث کی گئی ہے اس لئے گمان یہ گذرتا ہے کہ مکالماتِ اقبال میں بھی اقبال کے فلسفیانہ نظریات ہی شاید اسی تکنیک سے موضوع بنائے گئے ہونگے اسی لیے مَیں کتاب کو اٹھانے کے لیے بھی آمادہ نہ تھا لیکن چند ورق الٹے تو پتہ چلا کہ یہ تو چیز ہی اور ہے ۔ اس کا نام داستانِ حیاتِ اقبال یا گفتار و کردار اقبال بھی ہو سکتا ہے ۔

راشد : مکالمات سے اس غلط فہمی کا امکان ضرور ہے جو آپ کو ہوئی آپ

کے تجویز کئے ہوئے دوسرے عنوانوں پر میں نے بھی سوچا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ عنوانات زیادہ گمراہ کن ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف مکالمات ہی ہیں۔ بعض مکالموں میں فلسفہ بھی ہے لیکن عام طور پر ان مکالموں کی حیثیت اقبال کے ملفوظات اور افادات کی ہے اور بس۔

سعید : مکالمات اقبال میں آپ نے تکنیک وہی استعمال کی ہے جو مکالمات افلاطون کی ہے۔

راشد : صرف ایک حد تک، مکالمات افلاطون کا ایک مرکزی خیال ہے، کچھ مرکزی کردار ہیں۔ مکالماتِ اقبال، اقبال کی تمام زندگی پر پھیلے ہوئے ہیں

سعید : تو مکالمات اقبال کا موضوع کیا ہے ؛

راشد : یہ اقبال کے سوانح حیات، سیرت، شخصیت اور افکار کا خاکہ ہے

سعید : لیکن اس موضوع پر بہت سی اچھی کتابیں چھپ چکی ہیں خود آپ کی ایک کتاب بھی ہے۔

راشد : جی ہاں۔ تذکرہ اقبال۔

سعید : تو پھر مکالماتِ اقبال کی وجہ جواز کیا ہے ؟

راشد : مَیں خود کیا عرض کروں۔ اس کی افادیت کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کر سکیں گے۔ لیکن مَیں اتنا ضرور کہوں گا۔ مکالماتِ اقبال کی دو خصوصیتیں، ایسی ہیں جو اس کتاب کی تالیف وطباعت کی وجہ جواز بن سکتی ہیں پہلی یہ کہ اس میں اقبال کے سوانح، سیرت، شخصیت اور افکار کی ساری کہانی اقبال کے اپنے الفاظ میں بیان کی گئی ہے گویا یہ اقبال ہے۔ دوسری یہ کہ اس میں ڈرامائی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ساری داستان مکالموں کی شکل میں ہے اس سے ظاہر ہے کہ دلچسپی میں اضافہ ہو گا۔

سعید : مکالمات کو اس ڈرامائی فارم میں ترتیب دینے کا آپ کو کیسے خیال آیا؟

راشد : میں نے دو تین تمثیلچے اقبال کی زندگی پر لکھے تھے جو صد سالہ جشن اقبال کے سلسلے میں اپنے کالج کے اسٹیج پر پیش کیے اور کامیاب رہے۔ اس لیے خیال ہوا کہ اقبال کی زندگی کو ان کے اپنے الفاظ سے ترتیب دے کر ڈرامائی شکل میں پیش کیا جائے۔ پھر اس دوران میں ایک کتاب بھی میری نظر سے گزری جس نے اس خیال کو تحریک سے بدل دیا۔

سعید : کونسی کتاب؟

راشد : مصری ادیب توفیق الحکیم کی کتاب "محمد رسول اللہ" جس کا ترجمہ عطیہ خلیل صاحبہ نے کیا ہے اور جس پر مولانا مودودی نے اچھا تبصرہ کیا اور اس کی تکنیک کو سراہا۔

سعید : تکنیک کیا ہے؟

راشد : یہی مکالماتی۔

سعید : آخر میں صرف ایک سوال اور!

راشد : فرمائیے۔

سعید : میں نے دیکھا ہے کہ آپ نے ہر منظر، ہر مکالمے کا حوالہ بھی دیا ہے۔ بظاہر تو یہ اچھی بات ہے لیکن ان حوالوں کی اہمیت اسی وقت ہوگی جب وہ معتبر ہوں۔ جن ذرائع سے آپ نے یہ مواد لیا ہے ان کی صحت کی تصدیق کا آپ نے کوئی اہتمام کیا ہے؟

راشد : سچ پوچھیے تو نہیں۔ راویوں کے ثقہ ہونے یا نہ ہونے کا میرے پاس کوئی حتمی ثبوت نہیں۔ بس حوالہ دے دیا ہے کہ کونسی چیز کہاں سے لی گئی ہے ویسے بیشتر راوی معتبر و مستند ہیں۔

سعید: کیا آپ نے کچھ زیبِ داستان کے لیے بھی بڑھایا ہے؟ مثلاً خود توفیق الحکیم اپنی کتاب میں تھوڑی بہت داستان طرازی سے نہیں بچ سکا اور محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں سوانحی مواد میں جو گل کھلائے ہیں وہ تو آپ کو معلوم ہی ہیں۔

راشد: میں نے داستان طرازی بالکل نہیں کی۔ بس کہیں ایک آدھ جملہ بڑھایا ہو گا۔ وہ بھی مکالمے کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے۔ صرف ایک جسارت کی ہے کہ اقبال کے بعض خطوط کو مکالمے کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔

سعید: مثلاً

راشد: جیسے اقبال کے خطوط عطیہ فیضی کے نام۔ کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا اور اس کی صورت جواز یہ ہے کہ آخر خطوط بھی تو مکالمات ہوتے ہیں۔ غائبانہ سہی۔

مَیں ان دنوں اقبال کی زندگی کو ایک مکمل ڈرامے کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ دعا کیجئے کہ یہ کام مکمل کر سکوں۔

سعید: اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

کتابوں کے دیباچے میں محسنوں اور معاونوں کے تذکرے کا دستور بھی ہے اس سلسلہ میں آپ کو کچھ کہنا ہے۔

راشد: جی ہاں بہت کچھ، سب سے پہلے تو ڈاکٹر آغا افتخار حسین صاحب کا شکریہ واجب ہے کہ انھوں نے عدیم الفرصت ہوتے ہوئے بھی اس مسودے کو ایک نظر دیکھا اور اس پر پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا کی۔ آغا صاحب ایسے محقق اور مفکر کا اس تالیف کے بارے میں کچھ لکھنا میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ اس کے لیے مَیں آغا صاحب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کے لیے مواد کی فراہمی میں میرے دو ادبی دوستوں ۔ سید شاہد واسطی اور ڈاکٹر غلام حسین اظہر کا تعاون بھی شریک حال رہا۔ میں ان دونوں مخلص کرم فرماؤں کا بھی ممنون ہوں۔
اس مسودے کی تہذیب و ترتیب میں میرے محسن و مرشد نعمان علی صاحب نے ازرہ کرم بڑی دیدہ ریزی کی۔ اور بڑے کار آمد مشورے دیتے ان کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں صرف احساس ہے اگر اس کتاب میں کوئی خوبی ہے تو انہی کی توجہ کا نتیجہ ہے ۔ جزاک اللہ۔

سعید راشد
شیر شاہ ہاؤس
ملٹری کالج جہلم

آبائو اجداد

راوی۔ علامہ کا تعلق کشمیر کے ایک قدیم اہل اللہ خاندان سے تھا۔ ان بزرگوں کے متعلق کچھ روایات سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔ علامہ تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی تاریخی کھوج مل جائے۔ ۵، اکتوبر سنہ ۱۹۲۵ء کو وہ سراغ مل گیا۔ اس دن اس موضوع پر اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سے ان کی یہ گفتگو ہوئی۔

اعجاز۔ السّلام علیکم! چچا جان

علامہ۔ آؤ بھئی اعجاز بیٹھو

اعجاز۔ جاوید میاں کیسے ہیں؟

علامہ۔ الحمدللہ! جاوید آج پورے ایک سال کا ہوگیا۔ تمہاری چچی قربانی دینے میں مصروف ہیں۔

اعجاز۔ پھر تو میں صحیح وقت پر آیا۔ مبارک ہو۔

علامہ۔ تمہیں بھی مبارک ہو۔ آج ایک اور دریافت سے بھی مجھے فخر اور اطمینان ہوا ہے۔

اعجاز۔ وہ کیا؟

علامہ۔ تم یہ سن کر خوش ہوگے کہ مدت کی جستجو کے بعد اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ ہمارے جدِ اعلیٰ حضرت بابا لولی حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے

تھے۔ ان کا اصل گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ ادون تھا۔ بابا صاحب بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور غیر ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے اس واسطے ترکِ دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے تھے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پاکر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے جو حضرت نورالدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں جو چرار شریف میں ہے۔

اعجاز۔ لولی حج سے کیا مراد ہے؟

علامہ۔ اس کا مطلب ہے حج کا عاشق، یہ لقب ملنے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کئی مرتبہ پیدل جاکر حج کیا تھا۔

اعجاز۔ آپ نے ابھی بتایا کہ حضرت بابا لولی حج اپنے مرشد کے جوار میں چرار شریف میں دفن ہیں۔ یہ چرار شریف کہاں ہے؟

علامہ۔ چرار شریف سرینگر کے جنوب میں بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اعجاز۔ یہ حالات کم و بیش وہی ہیں جو اکثر دادا جان سنایا کرتے ہیں۔

علامہ۔ ہاں۔ والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیت مجموعی درست ہے۔

اعجاز۔ آپ کو یہ سراغ کہاں سے ملا؟

علامہ۔ ابھی حال ہی میں خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا ایک قلمی نسخہ حسنِ اتفاق سے مجھے دیکھنے کو مل گیا۔ اس میں بابا صاحب کا تذکرہ ہے۔ غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہوگی۔

ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سارا سلسلہ موجود ہو۔

اعجاز ۔ نسلاً تو ہم کشمیری پنڈت ہیں ۔

علامہ ۔ ہاں ۔ سپرو گوت کے ۔ ۔

اعجاز ۔ سپرو کا کیا مطلب ہے ؟

علامہ ۔ یہی سوال ایک بار میں نے میاں جی (والد گرامی) سے پوچھا تھا ۔

اعجاز ۔ پھر انھوں نے کیا فرمایا ؟

علامہ ۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو براہمنۂ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف قدامت پرستی یا کسی اور وجہ سے توجہ نہ کرتے تھے اس لئے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومتِ اسلامیہ کا اعتماد حاصل کیا ۔ وہ سپرو کہلایا ۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے " س " تقدم کیلئے آتا ہے اور " پو " کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر " پڑھنا " کا ہے ۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برھمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو از راہ تعریض و تحقیر دیا تھا جنھوں نے قدیم رسومات و تعصبات قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان اور علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا ۔ جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا ۔

اعجاز ۔ ان سپرو برھمنوں میں سے کس نے اور کب اسلام قبول کیا ؟ خواجہ اعظم کی تاریخِ کشمیر اس بارے میں کچھ روشنی ڈالتی ہے ۔ ؟

علامہ ۔ یہ کتاب اس باب میں خاموش ہے ۔ اس میں بابا لولی حج کا تذکرہ ہے اور بس اپنے اجداد کے بارے میں جو کچھ میں نے میاں جی اور بے جی سے سنا وہ یہی ہے کہ کوئی ڈھائی تین سو سال پہلے کی بات ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باہر سے سرینگر تشریف لائے ان کے زہد و اتقا سے متاثر ہو کر ایک نیک خصلت

برہمن زادے نے ان کے ہاتھ پر قبول اسلام کیا اور صالح نام پایا۔ وہ اس حد تک اسم باسمی تھے کہ روشن ضمیر پیر نے اپنی بیٹی کی شادی بھی ان سے کر دی اسلام لانے کے بعد انھوں نے سلوک و معرفت اور زہد و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ وہ عوام میں صالح بابا کے نام سے مشہور ہو گئے تھے

اعجاز۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بابا صاحب سے کتنی پشتوں سے ہمارا رشتہ پہنچتا ہے۔ اور یہ کہ بابا کی اولاد میں سے سب سے پہلے کون سیالکوٹ میں آ کر آباد ہوا۔

علامہ۔ غالباً والد ماجد کے پڑدادا شیخ محمد اکبر نے جو خود بھی پیر تھے ہجرت کی اور سیالکوٹ یا اس کے مضافات میں آباد ہوئے اس نقل مکانی کے زمانے کے بارے میں کچھ اختلاف رائے ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ ہجرت اٹھارہویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں عمل میں آئی ہوگی۔ ایک بار والد نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ ہجرت کرنیوالے بزرگ ہمارے دادا شیخ محمد رفیق کے والد شیخ جمال الدین تھے۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہمارے دادا شیخ محمد رفیق کشمیری رواج کے مطابق شیخ رفیقا کہلاتے تھے اور کشمیری دھسّوں کی تجارت کرتے تھے

اعجاز۔ گویا پیری ہمارا آبائی مشغلہ اور تجارت پیشہ رہا ہے۔

راوی۔ یہ مکالمہ اس خط پر مبنی ہے جو علامہ نے ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو لکھا تھا اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی کتاب "اقبال کی صحبت" میں شامل ہے

سپہ گری کی روایت

راوی۔ تجارت کے علاوہ علامہ کے خاندان میں سپہ گری کی روایت بھی موجود تھی۔

۲۴ جنوری ۱۹۳۸ء کی صبح جب سیّد نذیر نیازی علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے پہلے انھیں اپنے وہ چند تازہ اشعار لکھوائے جو ارمغانِ حجاز میں سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد دکن کے نام، کے عنوان سے شامل ہیں۔ پھر یہ گفتگو ہوئی۔

علامہ۔ نیازی جی! اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اسی لاہور میں کیسے کیسے مقتدر اہلِ ثروت، جاہ و منصب کیلئے کیسی کیسی ذلّتیں گوارا کر لیتے ہیں۔

نذیر نیازی۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟

علامہ۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ۔ صاحب میرے پاس آئے ریٹائرمنٹ کے بعد بہتر اور برتر ملازمت کیلئے بے چین تھے۔

نذیر نیازی۔ پھر آپ نے کیا جواب دیا؟

علامہ۔ میں نے ان سے کہا۔ اللہ پر توکل رکھئے۔ آپ کے پاس ماشاء اللہ سب کچھ ہے۔

مجھے دیکھئے میرے پاس کیا ہے اور کیا تھا میں ایک ایسے شہر میں پیدا ہوا جو اس وقت شہر بھی نہیں تھا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اور جہاں سکھوں کی حکومت ختم ہوئے ابھی بیس پچیس برس ہی گزرے تھے۔ میرے دادا شیخ محمد رفیق بھی سکھوں کی فوج میں ملازم رہے تھے اور ان کی طرفداری میں انگریزوں سے لڑے تھے۔

نذیر نیازی۔ کہاں ؟

علامہ۔ گجرات میں

راوی۔ یہ گفتگو سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور" صفحہ ۹۴ پر نقل کی ہے۔

ذکر اقبال میں عبد المجید سالک نے لکھا ہے کہ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا تعلق بھی فوج سے رہا تھا۔ ان کی شادی راٹھوروں میں ہوئی تھی۔ وہ لوگ فوجی تھے انھوں نے کوشش کرکے شیخ صاحب کو بھی رسالے میں بھرتی کروا دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور رڑکی انجینئرنگ اسکول میں داخل ہوگئے وہاں سے امتحان پاس کر کے ایم ای ایس کے محکمہ میں اوورسیئر ہوگئے۔ اس محکمے میں انھوں نے بڑی ترقی کی اور اتنا روپیہ پس انداز کیا کہ انگلستان میں علامہ کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ جس کیلئے علامہ تا زندگی ان کے ممنون رہے

پنجاب میں ان دنوں علم و حکمت کا خاتمہ ہو چکا تھا میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے دینی تعلیم دلوائیں۔ انھوں نے اوّل تو مجھے محلے کی مسجد میں بٹھا دیا۔ (جہاں ایک صوفی منش بزرگ، عالم دین اور سالک و عارف مولانا غلام حسین درس دیتے تھے) پھر شاہ جی (مولانا میر حسن) کی خدمت میں بھیج دیا۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ میں ایک دن اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں میرا گزر ہو گا علماء فضلاء کی صحبت میں بیٹھنے کا موقعہ ملے گا۔ اس وقت تو یہ بھی معلوم نہیں تھا یونیورسٹی کیا ہوتی ہے، فیکلٹی کسے کہتے ہیں۔ یہ الفاظ سننے میں بھی نہیں آئے تھے

میرے والد اور شاہ جی ایک دوسرے سے مشورہ لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ والد ماجد نے میری پیدائش سے قبل ایک غیر معمولی خواب دیکھا تھا جس سے میری پیدائش کی تعبیر نکلتی تھی

نیازی وہ خواب کیا تھا؟

علامہ۔ ایک رات میرے والد گرامی نے خواب میں دیکھا کہ ایک پرندہ بہت اونچا اُڑ رہا ہے اور پھر اُڑتے اُڑتے ان کی جھولی میں آ گرا۔ یہ خواب میری پیدائش سے کچھ دن پہلے کا ہے۔ اسی لئے انھوں نے اسے اشارہ غیبی خیال کیا[1]

راوی اس خواب کو خود علامہ کے والد شیخ نور محمد نے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم سے بیان کیا۔ ان کے الفاظ یہ تھے

"میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں اوپر فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ پروں والا پرندہ اُڑ رہا ہے اس کی دلکشی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو

---

[1] اقبال کے حضور صفحہ ۹۵

اُٹھا اُٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اُترا اور میری گود میں آن گرا۔ میں نے اسکی تعبیر خود ہی کی ہے۔ کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمتِ اسلام میں ناموری حاصل کریگا۔[1]

کشف و کرامات

راوی۔ ۷ فروری ۱۹۳۸ء کی شام کا ذکر ہے کہ سید نذیر نیازی حسبِ معمول جاوید منزل میں علامہ کی خدمت میں حاضر تھے اتنے میں منشی طاہر الدین آ گئے، کچھ دستاویزات ساتھ لائے تھے علامہ سے انھیں کوئی قانونی مشورہ مطلوب تھا۔ نیازی صاحب اُٹھے اور دوسرے کمرہ میں جا کر علامہ کے بچوں کی جرمن آتالیق سے باتیں کرنے لگے۔ واپس آئے تو کیا دیکھا کہ مس کش، علامہ کی انگلیاں سہلا رہے ہیں۔

نیازی۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟

علامہ۔ محض حصول ثواب کیلئے ایسا کر رہے ہیں۔

نیازی۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست

علامہ۔ انسان کو ہمیشہ اس امر کا احساس رہنا چاہیئے کہ نیک عمل کبھی ضائع نہیں جاتا۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس کا اجر صرف آئندہ زندگی میں ملتا ہے۔

وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ

(۷۳ - المزمل - ۲۰)

---

[1] ذکرِ اقبال صفحہ ۱۰

کے ساتھ اس ارشاد کو بھی یاد رکھنا چاہیئے

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

(۹ ۔ التوبہ ۱۲۱)

اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا

میرے والد ایک روز گھر آ رہے تھے ہاتھ میں رومال تھا۔ رومال میں تھوڑی سی مٹھائی، اثنائے راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کتا بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ مٹھائی سمیت رومال اس کے آگے ڈال دیا۔ کتے نے مٹھائی کھانا شروع کر دی مٹھائی کھا چکا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پانی کی طلب ہے۔ والد ماجد نے اُسے کسی نہ کسی طرح پانی بھی پلا دیا۔ رات کو سوئے تو خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے جس میں مٹھائی کے طبق ہی طبق رکھے ہیں صبح آنکھ کھلی تو اس احساس کیساتھ کہ یہ اس نیک عمل کا ثمرہ تھا جو کل اُن سے سرزد ہوا۔ چنانچہ اس روز سے اُنھیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دن پھرنیوالے ہیں۔

نیازی۔ اور واقعی پھرے بھی؟

علامہ۔ ذرا یہ بھی سن لو کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟

نیازی۔ فرمائیے۔

علامہ۔ ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے ان کا نام تھا شیخ اکبر اُنھیں پیری اس طرح ملی کہ سن کھترا (سیالکوٹ کا ایک گاؤں) میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے اور اس لئے ان پر ہمیشہ طعن و تشنیع ہوا کرتی تھی۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو جلال آیا تو ایک سبز کپڑا نکالا جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے اور اُسے

اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے کپڑے کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ مخالفوں نے یہ دیکھا تو انھیں یقین ہوگیا کہ وہ فی الواقعہ سید ہیں۔ ان کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ دھسّوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟ اس زمانے میں معمولی دھسّوں کی قیمت دو روپے فی دھسہ سے زیادہ نہیں تھی۔ والد ماجد نے کوئی جب وہ دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں بک گئے۔ حالانکہ فی دھسہ آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی دو چار سو دھسے فروخت ہوگئے تو کافی روپیہ جمع ہوگیا۔ پس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی۔ پھر بھائی صاحب (شیخ عطا محمد) بھی ملازم ہوگئے۔[۱]

راوی۔ علامہ کے والد شیخ نور محمد جو ان پڑھ فلسفی کے لقب سے معروف تھے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ علامہ نے کشف کے چند واقعات لندن میں عطیہ فیضی کو سنائے۔

عطیہ فیضی سے اقبال کی ملاقات یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو لندن میں ہندی ٹلڈیا رکی میزبان مس بیک کے یہاں ہوئی۔ اس کے چند دن بعد کیمبرج میں دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

عطیہ۔ جب مس بیک کے یہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے حافظ میں بڑی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اور ایک بڑا اچھا فقرہ کہا تھا۔

اقبال۔ کہ جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو اس وقت ان کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر میں گم ہو جاتی ہے

---

[۱] اقبال کے حضور صفحات ۱۷۰ - ۱۶۹

عطیہ۔ جی : یہی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو حافظ سے .....

اقبال۔ لیکن میں نے بابا فغانی کے کلام کا مطالعہ کرنے کو کہا تھا۔

عطیہ۔ میں جاننا یہ چاہتی ہوں کہ فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف سے آپ کے اس گہرے شغف کا پس منظر کیا ہے ؟

اقبال۔ تصوف کا ذوق مجھے ورثے میں ملا ہے۔ یوں تو ہمارے بزرگوں میں بھی پیر و مرشد ہوئے ہیں لیکن خود ہمارے گھر کا ماحول عارفانہ اور روحانی رہا ہے۔ ابن عربی کی فصوص الحکم کا ہمارے یہاں باقاعدہ درس ہوتا تھا جس میں میں بھی کبھی کبھی بیٹھتا تھا۔ میرے والد خود بھی صاحب کشف و کرامات بزرگ ہیں۔

عطیہ۔ صاحب کشف و کرامت ؟

اقبال۔ ان کے ایک کشف کا تو میں خود شاہد ہوں ۔

عطیہ۔ مثلاً ۔

اقبال۔ میں کوئی گیارہ برس کا تھا کہ خواب کی حالت میں، میں نے کچھ شور سُنا جس سے میری نیند اُچاٹ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ والدہ سیڑھیوں سے اُتر رہی ہیں۔ میں اُٹھ بیٹھا اور خود بخود ان کے پیچھے پیچھے سامنے کے دروازے تک چلا جو آدھا کھلا ہوا تھا اور روشنی کی شعاعیں اس میں سے آ رہی تھیں۔ میری ماں اس نیم وا دروازے سے باہر دیکھ رہی تھیں میں بھی ان کے پاس کھڑا ہو گیا میں نے دیکھا کہ والد کھلی جگہ میں بیٹھے ہیں اور روشنی کا ہالہ ان کے گرد و پیش چمک رہا ہے اور جب میں نے والد تک پہنچنے کی کوشش کی تو والدہ نے مجھے روک دیا اور کہہ سن کر سونے کیلئے پلنگ پر بھیج دیا۔ صبح جب میں سو کر اٹھا تو سب سے پہلی خواہش جو میرے دل میں بیدار ہوئی وہ یہ تھی کہ والد صاحب کے پاس جاؤں اور معلوم کروں کہ وہ آدھی رات کو کیا کر رہے تھے جب میں نیچے پہنچا تو میں نے

دیکھا کہ میری والدہ پہلے ہی سے موجود ہیں اور والد ان سے بیان کر رہے ہیں کہ رات انھوں نے اس وجدانی کیفیت میں کیا دیکھا والد کہہ رہے تھے ۔

"کابل سے ایک قافلہ جو شہر کو آرہا تھا وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہے اس وجہ سے اسے ہمارے شہر سے ۲۵ میل کے فاصلے پر رکنے کی ضرورت محسوس ہوئی قافلہ میں ایک بیمار شخص ہے جس کی حالت اتنی زبوں ہے کہ قافلہ آگے نہیں جا سکتا۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ مجھے وہاں فی الفور جانا چاہیئے تاکہ میں ضروری امداد کر سکوں ۔

والد صاحب نے کوئی چیز ساتھ لی اور قافلہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے دل میں ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ جلد سے جلد قافلہ میں پہنچیں۔ خوش قسمتی سے قافلہ تک ہم توقع سے پہلے پہنچ گئے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لوگ اس بیمار شخص کی وجہ سے بیحد پریشان ہیں۔ قافلہ کی وضع قطع سے بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مالدار خاندان کے افراد پر مشتمل ہے جو علاج کیلئے کسی بڑے شہر کی طرف جا رہا ہے

جب والد قافلہ والوں کے پاس پہنچے تو والد نے سالار کارواں سے درخواست کی کہ انھیں جلد سے جلد بیمار کے پاس پہنچا دیا جائے۔ اس سے وہ اچنبھے میں آگیا اور انھیں سیدھا بیمار کے خیمے میں لے گیا یہ پوچھے بغیر کہ انھیں بیماری کا علم کیسے ہوا جب وہ بیمار کے پاس پہنچے تو والد نے دیکھا کہ مریض کی حالت بہت ہی سقیم ہے۔ جس خوفناک بیماری میں وہ مبتلا تھا اس نے اس کے اعضا کے کچھ حصوں کو کھا لیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سارا جسم آہستہ آہستہ گھل رہا ہے والد نے جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اس سے راکھ کی شکل کی کوئی چیز لیکر متاثرہ حصوں پر مل دی اور جب وہ یہ کام کر چکے تو انھوں نے اہل قافلہ کو یقین دلایا کہ بیمار اچھا ہو

جائے گا اور زندہ رہے گا۔ اور ان سے کہا کہ خدا میں یہ طاقت ہے کہ وہ ضائع شدہ اعضاء کا بدل پیدا کرے۔

بظاہر ان لوگوں کو اپنے محسن کی بات کا یقین نہیں آیا۔ میں خود بھی شک کا شکار تھا۔ لیکن چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مریض کی حالت بہتر ہونے لگی۔ خود مریض کو یقین آنے لگا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ والد کی خدمت میں معقول فیس پیش کی گئی لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور واپس چلے آئے۔ چند دن بعد قافلہ شہر میں پہنچ گیا اور معلوم ہوا کہ مریض بالکل صحت مند ہو گیا ہے۔

عطیہ۔ خوب، یہ تو کشف و کرامت کی حیرت انگیز مثال ہے۔

راوی۔ عطیہ فیضی اپنی کتاب " اقبال " میں لکھتی ہیں۔

اقبال نے مجھ سے یہ واقعہ میری پہلی ملاقات سے چند دن بعد یورپ میں بیان کیا جہاں میں فلسفہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں مقیم تھی۔

ابتدائی تعلیم

راوی۔ انیسویں صدی کے آواخر میں سیالکوٹ میں جو درس وتدریس کے جو چار مراکز تھے ان میں سے دو زیادہ مشہور تھے ایک محلہ شوالہ کی مسجد میں مولوی ابو عبداللہ غلام حسن کا مکتب۔ دوسرے مولوی سید میر حسن کی درسگاہ۔ مولوی غلام حسن کے ہاں صرف دینیات و عربیات کا درس دیا جاتا تھا۔ مولوی سید میر حسن دینیات کے علاوہ عربی و فارسی ادب بھی پڑھاتے تھے۔ گویا اوّل الذکر خالص دینی مدرسہ تھا۔ چونکہ شیخ نور محمد شوالے کی مسجد میں مولوی غلام حسن کا وعظ سننے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لئے انھوں نے اقبال کو مولوی غلام حسن کے مکتب میں بٹھا دیا۔

مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک روز گئے تو دیکھا ایک سرخ و سپید ذہین صورت لڑکا انہماک سے قاعدہ بغدادی پڑھ رہا ہے انھیں اس میں کیا بات نظر آئی کہ پوچھا۔

مولوی میر حسن۔ مولوی صاحب! یہ لڑکا کون ہے؟

مولوی غلام حسن۔ یہ میاں جی کا بچہ ہے۔

مولوی میر حسن۔ محلہ چوڑی گراں کے شیخ نور محمد؟

مولوی غلام حسن۔ ہاں وہی۔

مولوی میرحسن۔ بیٹے اِدہر تو آؤ۔

بچہ۔ جی۔

مولوی میرحسن۔ کیا نام ہے تمہارا؟

بچہ۔ کون سا نام بتاؤں گھر کا یا مکتب کا؟

مولوی میرحسن۔ دونوں۔

بچہ۔ گھر میں بے جی بالا کہتی ہیں۔ یہاں میرا نام محمد اقبال ہے۔

مولوی میرحسن۔ شاباش، جاؤ بیٹھ کے پڑھو ...... ماشاء اللہ

راوی۔ دوسرے دن مولوی صاحب کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی۔

مولوی میرحسن۔ میاں جی! آپ کا بیٹا اقبال مولوی غلام حسن کے ہاں پڑھنے جاتا ہے؟

شیخ نور محمد۔ ہاں۔ جاتا تو وہیں ہے۔ میرا ارادہ اسے صرف دینی تعلیم دینے اور خدمت اسلام کیلئے وقف کر دینے کا ہے۔

مولوی میرحسن۔ آپ اسے وہاں سے اٹھا کر میرے پاس لائیں میں اسے پڑھاؤں گا۔[1]

راوی۔ شیخ نور محمد، مولوی میرحسن کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق اقبال مولوی میرحسن کے ہاں بھیجدیئے گئے اس طرح حسنِ اتفاق سے ایک یگانۂ روزگار شاگرد کو ایک یگانہ روزگار استاد مل گیا۔

ع فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

---

[1] ذکرِ اقبال صفحہ ۱۱

ایک حادثہ

راوی۔ علامہ کی زندگی کے آواخر کی بات ہے پروفیسر حمید احمد خان اور ان کے ساتھ اسلامیہ کالج لاہور کے دو اور استاد ڈاکٹر سعید اللہ اور عبد الواحد ملاقات کے لئے آواخر ۱۹۳۷ء میں جاوید منزل حاضر ہوئے تکئے کے سہارے علامہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ بستر کے ساتھ کی تپائی پر پانچ سات کتابیں رکھی تھیں دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ جب وہ داخل ہوئے تو جاوید اور منیرہ کی جرمن گورنس ڈور النٹ علامہ کی کرسی پر منیرہ کو لئے بیٹھی تھیں۔ وہ ان کو آتے دیکھ کر اٹھیں اور مقابل کے دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

حمید احمد خان، سعید اللہ، السلام علیکم ڈاکٹر صاحب

علامہ۔ آؤ جی۔!

(تینوں کرسیوں پر بیٹھنے ہی کو تھے کہ علامہ یوں مخاطب ہوئے)

علامہ۔ کون صاحب ہیں ؟

حمید احمد خان۔ (قدرے حیرت زدہ ہو کر) جی میں ہوں حمید احمد خان، سعید اللہ اور عبد الواحد اب آپ کا مزاج کیسا ہے ؟

علامہ۔ الحمد للہ! اچھا ہوں (۔۔۔۔۔ کچھ سکوت کے بعد) ہوں۔

حمید احمد خان۔ ڈاکٹر صاحب آجکل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ لکھتے بھی ہیں ؟

علامہ۔ پڑھنا کیسا، کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اگر دیکھ سکوں تو پڑھوں۔

حمید احمد خان۔ نظر نہیں آتا۔ (بیحد حیرت و استعجاب سے)

علامہ۔ ہاں جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گزرنے پر آپ کی صورتیں کسی قدر دھندلی نظر آ رہی ہیں کہتے ہیں کہ موتیا بند اتر آیا ہے

سعید اللہ۔ ان گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ موتیا بند اتر آنے کا خطرہ ہے مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی جلد اتر آئے گا۔

علامہ۔ جی ہاں۔ عام طور پر لوگوں کا دیر سے اترتا ہے مجھے ذرا پہلے اتر آیا ہے۔ میرے والد مرحوم کو جو سو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے اسی برس کی عمر میں اترا تھا۔

حمید احمد خان۔ اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے۔؟

علامہ۔ اب اس کا آپریشن ہوگا لیکن جب تک یہ پک نہ جائے۔ آپریشن نہیں ہو سکتا۔ پکنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں۔ پانچ سال لگ جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا بہر حال لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہے۔ کیونکہ میری دائیں آنکھ تو شروع سے بیکار تھی۔

حمید احمد خان۔ (حیرت و تاسف کیساتھ)

شروع سے بیکار تھی؟

علامہ۔ دو سال کی عمر میں میری یہ آنکھ ضائع ہو گئی تھی مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک بھی تھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے جس کی وجہ سے بینائی زائل ہو گئی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جونکیں لگوائی گئی تھیں۔

تاہم میں نے اس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک آنکھ سے دن کو

۲۔ روزگارِ فقیر صفحہ ۲۰۹ ۔ ۳۔ اقبال از عطیہ بیگم ص ۱۹

تارے دیکھ لیا کرتا تھا (پراُمید تبسم کیساتھ) اگرچہ پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتاہوں جس میں وہی لطف ہے جو پڑھنے میں (ذرا سرگرمی کے ساتھ تکئے سے سر اٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے مرا حافظہ بہتر ہوگیا ہے[1]۔

ایک درویش سے ملاقات

راوی۔ اقبال سکاچ مشن اسکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں تھے ایک روز ان کی جماعت میں ایک مرد قلندر اونچے لمبے اور سرخ وسپید اپنے حال میں مست آن وارد ہوئے۔ بڑی شفقت سے ان کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پیشانی پر بوسہ دیا اور بغیر کچھ کہے سنے جس طرح آئے تھے اسیطرح تیزی سے چلے گئے۔

استاد۔ اقبال! یہ درویش کون تھے کیسے آئے؟ تم انھیں جانتے ہو؟

اقبال۔ جناب، میں ان کو بالکل نہیں جانتا۔ میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

راوی۔ بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مرد درویش نے کسی سے بھی ان کے متعلق دریافت نہیں کیا تھا۔ خود ہی سیدھے ان کے پاس جا پہنچے تھے[2]

بچپن کی باتیں

راوی۔ اقبال بچپن میں شوخ وشریر تھے۔ کبوتر اور بٹیر پالنے کا شوق بھی تھا جو

---

[1] ملفوظات اقبال۔ [2] اقبال اندرون خانہ

اس زمانے میں سیالکوٹ میں عام تھا) مولانا سید میر حسن کے بیٹے سید محمد تقی اس معاملے میں ان کے ساتھی تھے۔ ایک دفعہ مولانا نے کیا دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔

مولینا میر حسن۔ کم بخت! اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے؟

اقبال۔ حضرت! ذرا اسے پکڑ کر تو دیکھئے۔

راوی۔ اس واقعہ کو علامہ نے خود روایت کیا۔ وہ ہر فن مولا تھے۔ سالہا سال بعد ایک دفعہ جب میاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں لاہور کے اہل علم تفریح و تفنن کیلئے جمع تھے۔ علامہ نے بٹیر بازی کے فن پر ماہرانہ انداز میں گفتگو فرمائی اور ہاتھ سے بٹیر کو مٹھیانے کا طریقہ بھی بتایا۔[1]

راوی۔ اقبال کے بچپن ہی کا قصہ ہے۔ اقبال ذرا دیر سے اسکول پہنچے۔

استاد۔ اقبال! دیر سے کیوں آئے؟

اقبال جناب! اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے[2]

٭

راوی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اقبال کے بچپن کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ نصف شب کے قریب اقبال کی والدہ ماجدہ امام بی بی کی اچانک آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ اقبال دیئے کے قریب بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔

والدہ بالے بیٹے اتنی رات گئے کیا پڑھ رہے ہو، اُٹھو، سو جاؤ۔

اقبال (ساکت اور محو رہتے ہیں کوئی جواب نہیں)

والدہ (شانے سے پکڑ کر) اُٹھو بیٹے، صبح کام کر لینا سو جاؤ۔

---

[1] سرگذشت اقبال۔ [2] سرگذشت اقبال

اقبال: (کسمساکر) بے جی سویا ہوا تو ہوں۔

راوی: اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی اہلیہ کہتی ہیں کہ اس وقت تو بے جی نے انھیں جیسے تیسے بستر پر لٹا دیا لیکن اس کے بعد انھیں وہم ہو گیا روز رات کو کئی کئی بار اُٹھ کر دیکھتیں اور اُنھیں اسی حالت میں پاتیں اور اٹھا کر سلاتیں۔ صبح جب بالے سے اس کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ریاضی کے جو سوالات وہ نیند میں حل کرتے وہ بالکل صحیح ہوتے۔ بے جی کی توجہ سے ان کی یہ عادت چھوٹ گئی۔ اقبال کے حوالے سے خالد نظیر صوفی نے یہ واقعہ اپنی کتاب درونِ خانہ میں اقبال کی بھابی کے حوالے سے بیان کیا ہے[1]۔

٭

راوی: مولوی سید میر حسن کے چھوٹے صاحبزادے سید ذکی شاہ، اقبال کے بچپن کے دوست تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اقبال کو بچپن میں دو ہی شوق تھے پڑھنا اور پھر کبوتر بازی، سکول سے آنے کے بعد دونوں شوالہ تیجا سنگھ کے قریب کھلے میدان میں جاکر ان ماہر کبوتر بازوں کے اڈے پر چلے جاتے جہاں ہر شام کبوتروں کی اڑانوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ اقبال ان کبوتر بازوں کی باتیں بڑے غور سے سنتے اور کبوتر فضائے نیلگوں میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تو ان کی نگاہوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی۔ ایک شام جب کبوترو، کے یہ دیوانے اس محلے سے لوٹ رہے تھے تو دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

اقبال: یار مجھے کبوتروں سے عشق ہو گیا ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی کبوتر پال لیں۔

---

[1] سرگزشتِ اقبال

ذکی شاہ۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کبوتر رکھے کہاں جائیں گے؟

اقبال۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں نہ والد اجازت دیں گے اور نہ شاید شاہ جی یہ پسند کریں اب کیا کیا جائے؟

راوی۔ یہ معصوم بچے اسی اودھیڑبن میں رہتے تھے کہ کبوتر پالیں تو کیسے پالیں۔ آخر ان کے شوق کی تکمیل کی ایک راہ نکل آئی۔ مولوی میر حسن کے بڑے صاحب زادے سید تقی شاہ نے چار جوڑے کبوتر پال لئے اور گھر کی چھت پر ان کیلئے کابک بنا دی گئی۔ کبوتروں کے بیٹھنے کیلئے چھاتہ بھی تیار ہوگیا۔ تو اقبال ان کبوتروں کے پاس کافی وقت گزارنے لگے۔

ایک دفعہ سردیوں کے موسم میں اقبال ذکی شاہ کے مکان کی چھت پر دھوپ میں بیٹھے مولوی میر حسن سے کچھ پڑھ رہے تھے۔ مولوی میر حسن نے اقبال سے پوچھا۔

مولوی میر حسن۔ اقبال، فارسی کا کام ختم ہوگیا؟

اقبال۔ (اقبال کی نظریں کبوتروں میں ہیں اور کسی سوچ میں محو ہیں)

مولوی میر حسن۔ اقبال! کیا سوچ رہے ہو تم نے میرا سوال نہیں سنا؟

اقبال: جی، شاہ جی، کیا فرمایا آپ نے؟

مولوی میر حسن۔ (مسکراکر) اقبال علم کتابوں میں تلاش کرو۔ کبوتروں کی پرواز صرف عملی جدوجہد کی تحریک کر سکتی ہے[1]

راوی سید ذکی شاہ ہی سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم تین چار دوست سیر کیلئے شہر سے دور نکل گئے سڑک کے کنارے کھیت میں ایک خستہ حال بوڑھا کسان ہل چلا رہا تھا۔ اس کے اردگرد کے کھیتوں میں گندم کی پکی ہوئی سنہری بالیاں لہلہا رہی تھیں۔ اقبال بوڑھے کسان کے قریب جا پہنچے پھر دونوں میں یہ باتیں

---

[1] روایاتِ اقبال

ہوئیں ۔

اقبال۔ بابا! گندم کے یہ کھیت کس کے ہیں ؟

کسان۔ یہ کھیت تو میرے ہیں لیکن ان کے سینے پر لہلہانے والی گندم نہ جانے کس کی ہے ؟

اقبال۔ اگر صرف زمین ہی تمہاری ہے اور فصل تمہاری نہیں تو تم خون پسینہ ایک کیوں کر رہے ہو ؟

کسان۔ اگر تم کسی کسان کے بیٹے ہو تو چند سال ٹھہر جاؤ اس سوال کا جواب تمہیں خود بخود مل جائے گا[1]

ث

راوی۔ علامہ کے استاد سید میر حسن شاہ کے بیٹے سید ذکی شاہ کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب مڈل میں پڑھتے تھے گرمیوں کے موسم میں ایک روز شاہ صاحب اسکول میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے ۔

میر حسن شاہ۔ اقبال! پانی لاؤ ۔

اقبال بہت اچھا

میر حسن شاہ۔ (دو گھونٹ پی کر) پانی سخت گرم ہے اقبال سچ بتانا کہاں سے لائے ہو۔ باہر کے مٹ سے ؟

اقبال۔ جی ہاں !

میر حسن شاہ۔ تم دنیا کے کام کے نہیں ہو ![2]

ث

---

[1] روایاتِ اقبال [2] روایاتِ اقبال

راوی۔ مولوی میر حسن کے صاحبزادے ذکی شاہ راوی ہیں کہ ایک دفعہ اقبال ہمارے گھر کیلئے سودا سلف لے کر بازار سے لوٹے تو مولوی صاحب دروازے پر کھڑے کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کو دیکھ کر کہا۔

مولوی میر حسن۔ اقبال میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ بازار سے ہمارا سودا نہ لایا کرو

اقبال۔ کیوں جناب، میرا قصور؟

مولوی میر حسن۔ تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں ہو۔

اقبال۔ جناب! میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔[1]

ؑ

راوی۔ بچپن میں اقبال کا عرف "بالا" تھا۔ ان کی والدہ انھیں بالا کہہ کر ہی پکارتی تھیں۔ اور یہ عرف قریبی دوستوں میں بھی رائج تھا۔ اس زمانے کے اقبال کے ایک دوست تھے خوشی محمد عرف خوشیا جو اسی نام سے معروف ہوئے ان خوشیا سے بالے کا بڑا یارانہ تھا۔ دونوں اکٹھے سکاچ مشن اسکول جاتے، خوشیا کے مکان کے تھڑے پہ بیٹھ کے دونوں شطرنج کھیلتے اور کھیل تماشے ساتھ ساتھ دیکھتے ایک روز خوشیا اور بالا میں یہ گفتگو ہوئی۔

خوشیا۔ یار چلو، ذرا نٹوں کا تماشا دیکھنے چلتے ہیں۔

بالا۔ تم جاؤ میں تیجا سنگھ کے مندر جا رہا ہوں وہاں آج گرہ باز کبوتروں کا بڑا زبردست مقابلہ ہے۔

خوشیا۔ یار چھوڑو کبوتر بازی کو، کس جھنجھٹ میں پڑ گئے ہو۔

بالا۔ خوشیا کبوتروں کو نیلے آسمان پر اڑتا ہوا دیکھ کر میرے اندر ایک

[1] روایات اقبال

عجیب سا جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود بھی بلندیوں پر اُڑ رہا ہوں۔

خوشیا۔ اچھا۔ بھئی تُو تو آسمان کی بلندیوں پر اُڑ۔ اپن تو مٹی کے بندے ٹھہرے۔ پر یار اگلے جمعے امام صاحب کا میلہ ہے اس میں ضرور چلنا ہے۔

بالا ۔ ہاں۔ یہ بات مانی، امام صاحب کا میلہ ضرور دیکھیں گے۔

خوشیا۔ اور یار ذرا چھپ کے چلیں گے صرف ہم دونوں ہوں گے زیادہ بندے ہوں تو کھپ مچ جاتی ہے مزہ نہیں آتا۔

بالا ۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

خوشیا ۔ یار، گھر سے کچھ پیسے بھی لے لینا، کچھ کھائیں پیئیں گے۔

راوی۔ چنانچہ دونوں دوست امام صاحب کا میلہ دیکھنے گئے۔ اقبال گھر سے دو آنے لائے تھے اور خوشیا لڑ جھگڑ کر آٹھ آنے۔ میلے میں داخل ہونے سے پہلے خوشیا نے اپنی اٹھنی بھی بالے کے حوالے کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ بالا پیسوں کو احتیاط سے رکھتا تھا اس کی اٹھنی اس طرح محفوظ رہے گی میلے میں کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد دونوں میں یہ باتیں ہوئیں۔

خوشیا۔ یار کچھ کھانا پینا چاہیئے۔

بالا ۔ کھانا کیا، ابھی تو گھر سے آئے ہیں۔

خوشیا۔ یار مجھے تو بھوک لگنے لگی۔

بالا۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔

خوشیا۔ تیرا جی چاہے نہ چاہے اپن کا تو چاہتا ہے۔ اگر اپنے پیسے بچانے کا خیال ہے تو بچا، میری اٹھنی تو نکال۔ گرم گرم جلیبی کھانی ہے۔

بالا۔ لیکن میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں۔

خوشیا۔ پھوٹی کوڑی نہیں کیا مطلب ؟

بالا ۔ مطلب یہ کہ وہ جو نابینا فقیر اللہ کے نام پہ دے جا بابا کی صدا لگا رہا تھا۔ بچارے کی بری حالت تھی میں نے پیسے اس کو دیدیئے

خوشیا۔ اپنے یا میرے بھی ؟

بالا ۔ کہہ تو رہا ہوں، سارے پیسے اپنی دونی، تمہاری اٹھنی دونوں۔

خوشیا۔ (غصے سے) اپنا پیٹ کاٹ کر دوسرے کی جھولی میں ڈال دینا کون سی عقلمندی ہے ؟ اگر دینا ہی تھا تو اپنی دونی دیتے۔ میری اٹھنی دینے کا تمہیں کیا حق تھا ؟ یہ سراسر زیادتی ہے بد دیانتی ہے۔

راوی۔ خوشیا کا بیان ہے کہ بالا بد دیانتی کا طعنہ سنتے ہی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ اور میرے ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ دونوں میں دو مہینے بول چال بند رہی۔ خوشیا کا خیال تھا کہ غلطی بالے کی ہے بالے کو بے عزتی کا رنج تھا۔ خوشیا کہتا ہے کہ دو اڑھائی مہینے کے بعد کی بات ہے ایک روز میں سیر سپاٹے کے بعد گھر پہنچا تو میری والدہ نے مجھے بتایا کہ بالا آیا تھا اور تمہارے لئے یہ اٹھنی دے گیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت شرمندگی ہوئی اسی وقت مولوی کرم حسن کے گھر پہنچا اور بالے کو آواز دی فوراً باہر آیا اور گلے لگ گیا۔ پھر دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

خوشیا۔ بالے، یہ تو نے کیا کیا ؟

بالا ۔ خوشیا تیری اٹھنی تجھے مل گئی۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

خوشیا۔ یار میں خود شرمندہ تھا دوستی یاری میں اٹھنی کی کیا بات ہے

بالا ۔ خوشیا، بات کی بات ہے، اٹھنی کی بات نہیں غلطی میری تھی۔

خوشیا۔ لیکن یار۔

بالا۔ چھوڑو خوشیا بات ختم ہوئی چلو شطرنج کی ایک بازی لگاتے ہیں[1]
(دونوں نوعمر دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے جاتے ہیں)

ایک اہم واقعہ

راوی۔ اپنی فارسی مثنوی رموزِ بیخودی میں علامہ نے اپنے بچپن کا ایک اہم واقعہ لکھا ہے ایک ہندی فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا اور کسی صورت ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ان کو جو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کر دیا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا وہ نیچے گر پڑا۔

علامہ کے والد شیخ نور محمد نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اُٹھے سخت آزردہ ہوئے۔

شیخ نور محمد۔ یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال۔ یہ یہاں سے ٹلتا کیوں نہیں تھا؟

شیخ نور محمد بیٹے! کل آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت میدانِ حشر میں جمع ہوگی اس میں ملتِ بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔ بیٹے جب تیرے لئے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہوگا اس وقت حضور مجھے کہیں گے اللہ نے ایک مسلمان نوجوان تیرے سپرد کیا تھا تاکہ تُو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے

---
[1] اوراقِ گم گشتہ

لیکن اس نوجوان نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک کام بھی نہ کر سکا یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔؟

بیٹے! ذرا خیال کر کہ اُمت خیرالبشر (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہوگی۔ خدا کیلئے میری سفید ریش کا لی نہ کر، میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر، اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کل کے سامنے اس بندہ عاجز کو رسوا نہ کر[1]۔

شاعری کی ابتدا

راوی۔ جس سال علامہ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ مشہور شاعر میر غلام بھیک نیرنگ بھی فرسٹ ائر میں داخل ہوئے۔ دونوں نے تین سال ہوسٹل میں ساتھ گزارے۔ دونوں میں بقول نیرنگ اکثر یہ گفتگو ہوتی۔

نیرنگ۔ رات مشاعرہ میں تمہاری غزل خوب رہی اور کیوں نہ رہتی۔ آخر داغ سے تلمذ ہے۔

اقبال۔ نیرنگ! غزل وزل کیا؟ میری خواہش تو کچھ اور ہے میرا جی چاہتا ہے کہ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ اور پیراڈائزری گینڈ کے رنگ میں، میں بھی واقعات کربلا کو نظم کروں تاکہ پیراڈائزری گینڈ کا جواب ہوجائے۔

راوی میر غلام بھیک نیرنگ بیان کرتے تھے اس زمانے میں اقبال اپنی

---

[1] اسرار خودی ص ۱۵۰

اس آرزو کا بار بار ذکر کرتے رہتے تھے اور یہ کہ وہ پروفیسر آرنلڈ سے بہت متاثر تھے[1]

راوی۔ فقیر سید نجم الدین نے سن رکھا تھا کہ ایک بار علامہ نے میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی کوشش کی تھی، انھوں نے تصدیق چاہی۔

نجم الدین۔ کیوں ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے میڈیکل کالج میں داخلے کی کوشش کی تھی؟

علامہ۔ ہاں! میں نے ڈاکٹر بننے کی ایک بار کوشش کی تھی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ای۔ اے۔ سی (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری) کا امتحان پاس کیا لیکن میڈیکل ٹیسٹ میں آنکھ کی خرابی کیوجہ سے رہ گیا۔

❁

راوی ۹۵-۱۸۹۴ء کی بات ہے اقبال گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتے تھے۔ کواڈرینگل ہوسٹل کے ایک کمرہ میں بنیان پہنے ٹخنے تک کا تہمد باندھے فرش پر بیٹھے حقہ پیتے شعر کہتے اور پہبتیاں کستے رہتے تھے۔ داغ سے تلمذ تھا اور شعروں کا انداز یہ۔

برسرِ زینت جو شمع محفل جانانہ ہے
شانہ اس کی زلفِ پیچاں کا ہر پروانہ ہے

پائے ساقی پر گرایا جب گرایا مجھے
چال سے خالی کہاں یہ لرزشِ مستانہ ہے

---

[1] اوراقِ گم گشتہ

بھاٹی دروازے کے اندر بازارِ حکیماں میں انجمنِ اتحاد کے زیرِ اہتمام حکیم امین الدین بیرسٹر کے یہاں ہر ہفتے مشاعرہ ہوتا تھا جس کا انتخاب ماہنامہ شورِ محشر میں شائع ہوتا تھا۔ احباب اقبال کو بھی کھینچ کر ان مشاعروں میں لے جانے لگے ان مشاعروں میں مرزا ارشد گورگانی اور میر ناظر حسین ناظم بھی کبھی کبھی شرکت کرتے تھے۔

اقبال نے جب اپنی پہلی غزل اس مشاعرہ میں پڑھی تو دودمانِ تیموری کی یادگار مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔

اقبال۔ موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا گورگانی (اُچھل کر) اقبال، اس عمر میں یہ شعر۔

راوی۔ اس شعر سے اقبال کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا۔

٭

راوی۔ علامہ کبھی کبھی گورنمنٹ کالج کے ماحول کا ذکر کیا کرتے تھے ایک روز کالج کا ذکر چل رہا تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی شریکِ محفل تھے

عبداللہ چغتائی آپ کچھ عرس کے بارے میں فرما رہے تھے۔

علامہ۔ ہاں! گورنمنٹ کالج جہاں اب مسجد تعمیر ہوئی ہے اس کے قریب ایک خانقاہ کسی بزرگ کی تھی۔ جہاں سال میں ایک بار عرس ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر ہیر وارث شاہ پڑھی جاتی تھی زمانہ طالب علمی میں، میں بھی وہاں جاتا رہا ہوں [۲]

نوجوانی کی شوخیاں

راوی۔ ذکی شاہ کا بیان ہے اقبال لاہور میں پڑھتے تھے (۹۸-۱۸۹۷ء) ایک مرتبہ وہ لاہور سے آئے تو خوشی کے عالم میں تھے۔ ترنگ میں یہ مصرعہ گنگنا رہے ہیں

اقبال۔ ؎ شانہ اُس کی زلفِ پیچاں کا ہر پروانہ ہے

میر حسن۔ (ایک چپت رسید کر کے) ایسی حرکتیں ہمارے سامنے[1]

راوی۔ علامہ کے ہم وطن اور دور کے رشتہ دار خواجہ برکت علی ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر جنرل راوی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے محلے میں اکبر خان نامی ایک شخص کی بوٹوں کی دکان تھی اُس کے بیٹے کی شادی تھی مجرا ہو رہا تھا داغ کی غزل تھی جس کا قافیہ تھا۔

"نظر آئے، گھر آئے"

اقبال نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک پرزے پر یہ شعر لکھا۔

ہے میری زبان پر یہ دعا چور ہو الہٰی
اکبر کی دکان پر نہ کوئی شو نظر آئے

مغنیہ پڑھی لکھی ہوشیار تھی اُس نے اسی طرز میں یہ شعر بھی سنا دیا۔ محفل نے اقبال کی بذلہ سنجی سے خوب لطف اُٹھایا۔

راوی۔ ایک دفعہ فقیر وحید الدین خاطر خدمت تھے۔ علامہ اپنے استادِ گرامی

[1] اقبال کی صحبت میں۔ [2] اقبال کی صحبت میں۔ روایاتِ اقبال ۵۴،

مولوی سید میر حسن کا ذکر کر رہے تھے۔

علامہ۔ اسوۂ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ شاہ جی ہیں۔ بڑے وضع دار مستغنی اور اللہ لوگ، ایک دفعہ ایم اے او کالج علی گڑھ کی پروفیسری پیش کی گئی۔ انھوں نے جواب میں لکھا مرے کالج سیالکوٹ کی آمدنی سے میری تین پشتوں یعنی میرے والدین میری اولاد اور خود میں نے پرورش پائی ہے اس لئے میں کالج کو نہیں چھوڑ سکتا۔

وحید الدین۔ کبھی آپ نے مولوی صاحب کو کلام بھی سنایا۔؟

علامہ۔ مولوی صاحب کو اپنا کلام سنانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں صرف ایک بار ان کے سامنے ایک مصرعہ منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا وہ بھی اتفاقی طور پر۔

وحید الدین۔ وہ کیا موقعہ تھا؟

علامہ۔ ہوا یوں کہ مولوی صاحب کسی کام کیلئے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں سے تھا اور جس کا نام احسان تھا ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے اقبال اسے گود میں اٹھالو۔ میں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ کچھ دور جا کے میں تھک گیا تو میں نے بچے کو ایک دکان کے تختے پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو اُلٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آکر فرمایا۔ اقبال اس کی برداشت بھی دشوار ہے۔ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا: "تیرا احسان بہت بھاری ہے"[1]

---

[1] روزگار فقیر، ۵۷

انگلستان کا پہلا سفر!

راوی۔ فلسفہ اور قانون کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ولایت جاتے ہوئے علامہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو دہلی پہنچے۔ خواجہ حسن نظامی اور میر غلام بھیک نیرنگ نے خیر مقدم کیا۔ اور وہاں یہ گفتگو ہوئی۔

علامہ۔ سب سے پہلے میں حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دینا چاہتا ہوں تاکہ التجائے مسافر پیش کر سکوں۔

خواجہ حسن نظامی۔ اس سے بڑھ کر کیا بات ہوگی چلئے،

اقبال (فاتحہ کے بعد)

چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو!
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں!
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو!
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھکو!

(نظم پڑھنے کے بعد)

علامہ۔ خواجہ صاحب! اب ذرا مرزا غالب کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے۔

میرنیرنگ۔ کیا شاعروں کا حج یہیں ہوتا ہے ؟

علامہ۔ بجا ہے۔ شاعروں کا قبلہ وکعبہ تو یہی ہے۔

خواجہ۔ آیئے تو پھر اس ویران گوشے میں آیئے (مرزا غالب کے مزار پر سب فاتحہ پڑھتے ہیں۔

علامہ۔ تو یہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے، ویرانی سی ویرانی ہے۔

خواجہ۔ آپ پسند کریں تو یہ لڑکا ولایت کچھ سنائے آپ کو ؟

اقبال۔ ضرور، بالضرور۔ سناؤ میاں صاحبزادے مرزا صاحب کی کوئی چیز سناؤ۔

ولایت۔ عرض کرتا ہوں۔

دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی !

دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی !

راوی۔ جب گلوکار اس شعر

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں

اُٹھیے بس اب، کہ لذتِ خوابِ سحر گئی !

پر پہنچا تو علامہ سے ضبط نہ ہو سکا آنکھیں پرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دیکر اس حسرت کدے سے رخصت ہوئے [1]

☆

راوی۔ انگلستان جاتے ہوئے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو جب علامہ اقبال کا جہاز عدن کے قریب پہنچا تو ساحلِ عرب کے تصور نے علامہ کو بے چین کر دیا۔ سرزمینِ عرب کو مخاطب کر کے کہا۔

---

[1] سرگزشتِ اقبال - ۵۲

"اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو تُو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا فسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔

تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور مسلمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔

کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں چلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس متبرک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی[1]

عطیہ فیضی سے ملاقات

راوی

اقبال ستمبر ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے اور تقریباً تین برس انگلستان اور جرمنی میں گزار کر فلسفہ اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں لے کر ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ یہ کوئی معمولی تعلیمی سفر نہ تھا کہ صرف پی ایچ ڈی اور بیرسٹری اس کا ثمر ہو۔ یورپ کے ان تین سالوں نے اقبال کو بدل کے رکھ دیا۔ ذہنی و فکری

[1] مقالاتِ اقبال ۸۴۔

اعتبار سے بھی اور جذباتی اعتبار سے بھی۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا۔ "یورپ نے مجھے مسلمان بنا دیا" لیکن اقبال کی جذباتی زندگی پر بھی اس کا اثر کم نہیں تھا۔ سیالکوٹ اور لاہور کی سماجی اور علمی زندگی بہرحال محدود نوعیت کی تھی۔ لندن، کیمبرج اور ہائیڈل برگ (جرمنی) میں ان کا واسطہ نہ صرف بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے پڑا جو اپنے اپنے دائرہ میں استاد کا درجہ رکھتے تھے بلکہ وہاں پہنچ کر سماجی تعلقات میں بھی وسعت اور رنگارنگی پیدا ہوئی۔ اور دو اتفاق ایسے ہوئے جنہیں حسنِ اتفاق سے زیادہ بہت کچھ کہنا چاہیئے۔ پہلا اتفاق یہ ہوا کہ اس زمانے میں انگلستان میں شیخ عبدالقادر اور سیّد علی بلگرامی کے علاوہ ہندوستان کی ایک غیر معمولی خاتون عطیہ فیضی فلسفہ و ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں انگلستان میں مقیم تھیں عطیہ فیضی کا تعلق ریاست جنجرہ بمبئی کے ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان سے تھا۔ وہ خود بھی حد درجہ ذہین، فطین اور شائستہ تھیں۔

فلسفہ و ادب فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ ذوق نے اُنکی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ یہ دور اُن کے جمال و کمال کے عروج کا تھا۔ ان عطیہ فیضی سے اقبال کا تعارف ہوا۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، ذہن تخیّل طبعی جودت اور فلسفہ و ادب کا شوق، اس لئے دونوں نے ایک دوسرے کو شدت سے متاثر کیا۔ اس تعارف کے اثرات کم از کم اقبال کی زندگی میں بہت دور رس ہوئے۔ قیامِ یورپ کا دوسرا حسین اتفاق یہ تھا کہ جب اقبال ہائیڈل برگ (جرمنی) اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری کے لئے گئے تو نہ صرف عطیہ فیضی بھی وہاں موجود تھیں بلکہ ان کے مقالے کی نگرانی کیلئے جو دو جرمن پروفیسرین فراسینے شل اور فرالائن ویگے ناست مقرر ہوئیں

وہ بھی نہ صرف حسین تھیں بلکہ علم وفضل کا بحر بیکراں بھی، جمال صورت اور کمالِ علم فن و سیرت کا یہ عجیب امتزاج تھا جس نے انھیں زندگی کے ایک نئے تجربے سے دوچار کیا۔

عطیہ فیضی نے اپنی ڈائری میں اقبال سے اپنی پہلی ملاقات اور بعد کی رسم و راہ کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔ حیات اقبال کے مطالعہ میں یہ باب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کیلئے عطیہ فیضی کی کتاب "اقبال" دیکھنی چاہیئے۔ اس کتاب سے چیدہ چیدہ واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

عطیہ فیضی لکھتی ہیں کہ

یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مجھے لندن میں ہندوستانی طلبہ کی مشہور میزبان خاتون، مس بیک کا پیغام ملا کہ میں ایک ذہین اور طباع طالب علم سے ملاقات کروں جن کا نام محمد اقبال ہے جو کیمبرج سے خاص طور پر مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔ مجھے کچھ تعجب اور تجسس ہوا اس لئے کہ اس سے پہلے میں نے یہ نام نہ سنا تھا۔ بہرحال میں گئی اور اُن سے یہ گفتگو ہوئی۔

عطیہ فیضی۔ مسٹر اقبال! میں یہ جاننا چاہوں گی کہ اس ملاقات کی وجہ کیا ہے؟

اقبال۔ آپ لندن اور ہندوستان میں اپنے سفر کی ڈائری کے باعث بہت مشہور ہو چکی ہیں۔ اس لئے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں آپ سے ملاقات کروں۔

عطیہ فیضی۔ میں یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے کی زحمت صرف اس لئے گوارا کی کہ آپ مجھے یہ تحسین پیش کریں۔ مذاق کو بالائے طاق رکھیئے اور بتائیے کہ اس کی تہہ میں حقیقی مقصد کیا ہے؟

اقبال۔ میں آپ کو مسز سید علی بلگرامی کی طرف سے دعوت دینے آیا ہوں

کہ آپ کیمبرج میں ان کی مہمان بنیں اور میرا مشن یہ ہے کہ میں بغیر کسی رکاوٹ کے آپکی منظوری ان تک پہنچا دوں۔ اگر آپ انکار کر دیں گی تو اس ناکامی کا داغ مجھ پر لگے گا۔ جسے میں نے آج تک قبول نہیں کیا اور اگر آپ دعوت منظور کر لیں گی تو آپ درحقیقت میزبانوں کی عزت افزائی کریں گی۔

عطیہ فیضی   اگر آپ کا اتنا اصرار ہے تو میں ضرور آؤنگی۔

اقبال۔   کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ادبیات میں آجکل آپ کی دلچسپی کا رُخ کس طرف ہے ؟

عطیہ۔   میں ایران کے کلاسیکی شعراء کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ حافظ ان دنوں میری دلچسپی کا مرکز ہے۔

اقبال   ابھی محفل میں جو چند اشعار حافظ کے آپ نے پڑھے ان سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا۔ کہ حافظ آپ کا پسندیدہ شاعر ہے۔

عطیہ۔   حافظ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

اقبال۔   میں حافظ کا بڑا مداح ہوں عدیہ ہے کہ جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں اس وقت ان کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت شاعر کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔

عطیہ فیضی۔   بہت خوب یہ تو کوئی شاعر ہی کہہ سکتا ہے !

اقبال۔   مس فیضی اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ آپ بابا فغانی کے کلام کا مطالعہ ضرور کریں۔ ان کی بہت کم تصانیف ہندوستان میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ وہ ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہیں۔

راوی   عطیہ مزید لکھتی ہیں۔ " اقبال کو حسب خواہش اپنے آپ کو

دلچسپ اور خوشگوار بنانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا ۔ سوسائٹی میں وہ بہت زندہ دلی کا ثبوت دیتے تھے اور حاضر جوابی یا تعریف میں وہ کبھی نہیں جھجکتے تھے اگرچہ بسا اوقات ان کے مذاق میں طنز کا رنگ نمایاں ہوتا تھا[1]

راوی ۔ عطیہ فیضی سے پہلی ملاقات کے بعد اقبال نے عطیہ فیضی کو لندن کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی تاکہ وہ ان چند جرمن اسکالروں سے مل سکیں جن کے ساتھ وہ کام کر رہے تھے ۔

عطیہ فیضی ۔ مسٹر اقبال! اس ڈنر کی ترتیب اور تزئین میں آپ نے جس مہارت اور نزاکت کا ثبوت دیا ہے اس کی تعریف کئے بغیر میں نہیں رہ سکتی ۔

اقبال ۔ میں دو شخصیتوں کا مجموعہ ہوں ۔ ظاہری شخصیت کار آمد اور عملی ہے اور باطنی شخصیت خواب دیکھنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے

راوی ۔ اس دعوت کے جواب میں جو پارٹی عطیہ فیضی نے دی اس میں زبان اور فلسفہ کی مشہور طالبات ، چند مفکر اور موسیقی دان بھی شریک تھے ، پارٹی میں اقبال نے بڑی زندہ دلی کا مظاہرہ کیا اقبال نے فی البدیہہ مزاحیہ شعر کہے ۔

عطیہ فیضی ۔ ذرا ٹھہریئے میں ان دل چسپ اشعار کو کہیں نوٹ کر لوں ۔

اقبال ۔ یہ باتیں اس قسم کے خاص موقعوں کیلئے ہوتی ہیں اور ان کا مقصد اسی وقت ختم ہو جاتا ہے ۔ جب وہ زبان سے ادا ہوتی ہیں[2]

☆

---

[1] "اقبال" از عطیہ بیگم ص ۲۳-۲۲ [2] اقبال از عطیہ بیگم

قیامِ لندن کے دوران سیاسی سرگرمیاں

راوی۔ لندن کے دورانِ قیام میں اقبال مسلم طلباء کی اجتماعی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ اس زمانے میں مسلم طلباء کی ایک انجمن قائم تھی جس کا نام اسلامک سوسائٹی تھا اس کے بعض نوجوان ممبروں کا خیال تھا کہ اس کا نام پین اسلامک سوسائٹی رکھ دیا جائے۔ انجمن کے دوسرے ممبروں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا بحث چل رہی تھی کہ اس کے سیکرٹری حافظ محمود شیرانی نے اقبال سے ملاقات کی۔

محمود شیرانی۔ ایک تجویز یہ ہے کہ انجمن کا نام اسلامک سوسائٹی سے بدل کر پین اسلامک سوسائٹی رکھ دیا جائے بعض کو اس پر اعتراض ہے۔

اقبال۔ ان کے اعتراض کی نوعیت کیا ہے ؟

محمود شیرانی۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ انجمن ایک غیر سیاسی ادارہ ہے اس کا خاص مقصد ہندوستان کے مسلم طلباء کو معاشرتی سہولتیں فراہم کرنا ہے وہ پین اسلام ازم کے تصور سے بدکتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ تحریک مشرق وسطیٰ میں برطانوی مفادات کیلئے ایک خطرہ ہے اس لئے اگر پین اسلامک سوسائٹی نام رکھا گیا تو انجمن ایک سیاسی ادارہ بن جائیگی اور ہم انگریزوں کی برہمی کا شکار ہونگے۔ آپ کی اس ضمن میں کیا رائے ہے ؟

اقبال ۔ میں پین اسلامک کے الفاظ شامل کرنے کے حق میں ہوں۔

راوی ۔ مرزا جلال الدین بھی جو اس زمانے میں سوسائٹی کے جائنٹ سیکرٹری تھے لکھتے ہیں کہ ۔

" اقبال پین اسلامک سوسائٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے اقبال نے لندن میں اسلام پر جو چھ لیکچر دیئے ان میں سے پہلا لیکچر اس سوسائٹی کے زیر اہتمام کیکسٹن ہال میں ہوا اور جب مئی ۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ کی برطانوی شاخ کا افتتاح ہوا تو اقبال برطانوی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن چنے گئے تھے ۔

قیامِ لندن کے دو اہم تغیرات

راوی۔ بانگِ درا کے دیباچہ میں سر شیخ عبدالقادر نے ان دو بڑے تغیرات کا ذکر کیا ہے جو اقبال کے خیالات میں قیام یوروپ کے دوران آئے ۔۔ وہ ان دو تغیرات سے متعلق دو واقعات کے عینی شاہد تھے ۔

اقبال کے قیام یوروپ کے تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے۔ جن میں شیخ عبدالقادر کا وہیں قیام تھا اور وہ اکثر اقبال سے ملاقات کرتے رہتے تھے ایک دن دونوں میں یہ گفتگو ہوئی ۔

اقبال۔ شیخ صاحب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں شاعری ترک کر دوں اور قسم کھالوں کہ شعر نہیں کہوں گا۔ اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے۔

دیباچہ بانگِ درا ۔

اسے کسی اور مفید کام میں صرف کروں ۔

شیخ عبدالقادر آپ کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے بلکہ آپ کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے اس لئے ایسی مفید اور خدا داد طاقت کا بیکار کرنا درست نہ ہوگا ۔

اقبال ۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو قومیں کچھ کر رہی ہیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے ۔

شیخ عبدالقادر ۔ شعر و ادب کا قومی تعمیر میں اپنا حصہ ہوتا ہے ادیب و محقق بھی ایک فرض ادا کرتے ہیں ۔ آرنلڈ صاحب کو دیکھئے وہ کس لگن سے برسوں سے تحقیق میں مصروف ہیں ۔

اقبال ۔ یقیناً وہ ایک عظیم انسان ہیں ۔

شیخ عبدالقادر ۔ تو چلئے فیصلہ ان پر چھوڑتے ہیں اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو آپ اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں اور اگر وہ آپ سے اتفاق کریں تو بیشک آپ شعر گوئی ترک کر دیں ۔

اقبال ۔ مجھے پروفیسر آرنلڈ کا فیصلہ منظور ہوگا ۔

راوی ۔ چنانچہ دونوں پروفیسر آرنلڈ کے یہاں حاضر ہوئے ۔

عبدالقادر ۔ پروفیسر صاحب آج ہم آپ سے ایک اہم مسئلہ کا فیصلہ کروانے آئے ہیں ۔

اقبال ۔ جی ہاں استاد مکرم میں آپ سے ایک اہم معاملہ میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں ۔

آرنلڈ بتایئے وہ اہم موضوع کیا ہے ؟

عبدالقادر مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بیدار مغز شاعر دوست اقبال ترک شاعری

پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

آرنلڈ۔ آخر کیوں؟

اقبال۔ تاکہ جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور مفید کام میں صرف کروں۔

آرنلڈ۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کیلئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں۔ وہ وقت جو آپ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ آپ کیلئے بھی مفید ہے اور آپ کے ملک و قوم کیلئے بھی۔[1]

٭

راوی۔ شیخ عبدالقادر نے اقبال کے قیام یوروپ کا دوسرا اہم واقعہ اس امر کو بنایا ہے کہ انھوں نے فارسی کو اظہارِ بیان کا ذریعہ بنایا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی۔ انھوں نے اپنی کتاب "ایران کا فلسفہ مابعد الطبیعات" لکھنے کیلئے جو تحقیق کی اس کو بھی اس تغیرِ مذاق میں دخل رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلہ میں اُردو کا سرمایہ بہت کم ہے اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔

مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے۔

شیخ عبدالقادر۔ آپ سے ملئے یہ شیخ محمد اقبال، ہندوستان کے مشہور شاعر جو آجکل آپ فلسفہ ایران پر تحقیق کر رہے ہیں۔

دوست۔ بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔

اقبال۔ میرے لئے مسرت کا مقام ہے کہ آپ ایسے علم دوست اور فارسی ادب کے شائق سے نیاز حاصل ہوا۔

شیخ عبدالقادر۔ ان کی مشہور قومی نظم "ہمالہ" میں نے ہی سب سے پہلے مخزن میں شائع کی تھی۔ ان کے ترانہ ہندی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

کی تو بڑی شہرت ہے۔

دوست۔ جی ہاں آپ نے ان کا غالب پر مرثیہ مجھے دکھایا تھا اس کی فارسی ترکیبیں بہت خوب تھیں۔

اقبال۔ شکریہ۔

دوست۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ فارسی اشعار سنانے کی گزارش کروں۔

اقبال۔ میں فارسی میں نہیں کہتا۔

دوست۔ فارسی میں نہیں کہتے آپ؟ نہیں نہیں غالبؔ کے مرثیہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ آپ فارسی میں نہیں کہتے، تکلف کر رہے ہیں آپ۔

شیخ عبدالقادر۔ نہیں صاحب، نہیں، شیخ صاحب تکلف نہیں کر رہے ہیں مجھے بھی

کبھی فارسی اشعار سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔

دوست۔ کیا واقعی آپ فارسی میں نہیں کہتے۔؟

اقبال۔ سوائے ایک آدھ شعر کے کبھی فارسی میں لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

راوی۔ دوسرے دن صبح شیخ عبدالقادر کے مکان پر یہ گفتگو ہوئی۔

عبدالقادر آئیے شیخ صاحب آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟

اقبال۔ شیخ صاحب رات کی دعوت میں آپ کے فاضل دوست کی فرمائش میرے دل میں چبھ سی گئی۔ دعوت سے واپس آکر بستر میں آکر لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ اور فارسی میں شعر ہوتے رہے۔

عبدالقادر۔ فارسی میں؟ سبحان اللہ۔

اقبال۔ دو غزلیں ہو گئی ہیں اور ابھی نزول جاری ہے۔

عبدالقادر۔ واہ واہ۔ میں کافی منگاتا ہوں آپ سنائیے۔

راوی۔ شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

"اقبال نے دونوں غزلیں مجھے زبانی سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا جس کا انھوں نے کس طرح امتحان نہیں لیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آکر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے رہے مگر طبیعت کا رُخ فارسی کی طرف ہو گیا۔"[1]

ؔ

راوی۔ عطیہ فیضی نے پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ۹ جون ۱۹۰۷ء کی ایک دعوت کا ذکر کیا ہے جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔

---

[1] بانگِ درا، ص ۱۶

آرنلڈ۔ جرمنی میں ایک نایاب عربی مخطوطہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ (اقبال سے مخاطب ہو کر) اقبال! میں تمہیں وہاں بھیجنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

اقبال۔ مجھے؟

آرنلڈ۔ جی ہاں! تمہیں اس لئے کہ تم ہی اس ذمہ دارانہ کام کیلئے موزوں ترین شخص ہو۔

اقبال۔ لیکن جناب والا۔ میں اپنے استاد کے سامنے بالکل مبتدی کی حیثیت رکھتا ہوں۔

آرنلڈ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے بڑھ جائیگا۔

اقبال۔ اگر آپ کی بھی رائے ہے تو اپنے استاد کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر میرے لئے چارہ نہیں۔

آرنلڈ۔ میں خوب جانتا ہوں اس باب میں تمہیں مجھ پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔[1]

راوی۔ ۲۷ جون ۱۹۰۷ء کو مس شولی نام کی ایک جرمن خاتون نے عطیہ فیضی کو ہندوستانی وضع کے ڈنر پر مدعو کیا۔ لندن میں ہندوستانی کھانے ایک نعمت تھے۔ عطیہ فیضی نے یہ دعوت بخوشی قبول کرلی بعد کو معلوم ہوا اقبال اسی جرمن خاتون کے یہاں رہتے ہیں اور انہی کے کہنے پر کھانے کی دعوت

[1] اقبال از عطیہ بیگم ص ۲۷

دی گئی تھی۔

عطیہ فیضی۔ مس شوبلی! کھانا بہت ہی اچھا ہے اور ہندوستانی کھانوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر پورا اُترتا ہے مبارکباد قبول کیجئے۔

مس شوبلی۔ اس کی مبارک باد آپ ہمارے نوجوان فلسفی اور شاعر مسٹر اقبال کو دیجئے کہ کھانا انھیں کے زیر ہدایت تیار کیا گیا ہے۔

عطیہ فیضی۔ تو آپ کو بہت سی مبارکبادیں مسٹر اقبال، آپ تو اس فن میں بھی طاق ہیں۔

اقبال۔ شکریہ! میں تو ہر قسم کے ہندوستانی کھانوں کا تھوڑا بہت اہتمام کرسکتا ہوں۔

عطیہ فیضی۔ کھانا تو خوب رہا اب کیا پروگرام ہے؟

اقبال۔ کھانا تو ملاقات کا بہانہ تھا۔ میرا حقیقی منشاء یہ تھا کہ میں آپ کو اپنا (پی ایچ ڈی) کا مقالہ سناؤں اور آپ کی تنقید سے استفادہ کروں۔

راوی۔ عطیہ فیضی لکھتی ہیں کہ:

"اقبال نے انھیں اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا جسمیں بڑی تحقیق اور جانفشانی سے کام لیا گیا تھا۔ جب وہ پڑھ چکے تو اُنھوں نے میری رائے طلب کی اور جو کچھ میں نے کہا۔ وہ انھوں نے مقالہ میں شامل کرنے کے لئے قلمبند کرلیا۔"

٭

راوی۔ عطیہ فیضی لکھتی ہیں

۲۹۔ جون کو لیڈی ایلیس کے یہاں ایک فیشن ایبل پارٹی دی گئی

جہاں اقبال کو دیکھ کر مجھے قدرے اچنبھا ہوا جب میں ان سے مصروفِ گفتگو تھی عین اسی وقت مس سروجنی داس جو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس تھیں اور ضرورت سے زیادہ ہیرے جواہرات سے لدی ہوئی تھیں اور بھدے طریقے سے بنی ٹھنی تھیں ایک دم اندر آگئیں مجھے اور ہر اس شخص کو جو ان کی راہ میں آیا کلیتاً نظر انداز کرتے ہوئے اور پیکرِ جذبات بنی ہوئی سیدھی اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

سروجنی داس۔ میں صرف آپ سے ملنے کیلئے آئی ہوں۔

اقبال۔ یہ صدمہ اس قدر فوری اور اچانک ہے کہ مجھے تعجب ہوگا اگر میں اس کمرہ میں سے زندہ باہر نکل سکا۔

اقبال جرمنی میں

راوی۔ اپنی ڈائری میں عطیہ فیضی لکھتی ہیں۔

"یہاں (ہائیڈل برگ میں) اقبال علم اور انکساری کا پتلا بنے ہوئے تھے حالانکہ لندن میں وہ بے حد خود رائے اور خود پسند نظر آتے تھے۔ پروفیسر ویگے ناست اور سینے شل دو صاحبِ علم اور صاحبِ جمال خواتین اقبال کی استاد تھیں اور وہ انہیں سے فلسفے اور دوسرے ادق مضامین میں سبق لیا کرتے تھے یونیورسٹی کے کام کے علاوہ ہر طالب علم کیلئے لازمی تھا کہ کشتی رانی، کلاسیکی موسیقی، گانا، باغبانی، سائیکل چلانا، درختوں پر چڑھنا سیکھے اور جب انہیں

یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کے ساتھ ملا دیا جائے تو سارا نصاب نہایت دلچسپ چیز بن جاتا ہے۔ اقبال کو بھی تمام شعبوں میں شرکت کرنی پڑتی تھی اور وہ ان سب میں ہوش مندانہ طریقے سے دلچسپی لیتے تھے البتہ دو چیزیں تھیں جن میں وہ پھسڈی رہا کرتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کی آواز گانے کے لئے بالکل موزوں و مناسب نہ تھی اور دوسرے یہ کہ وہ حاضری میں وقت کی پابندی کبھی نہیں کرتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ دن بھر کی باضابطہ تعلیم کے بعد ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک قہوہ خانہ میں جا نکلے جو قریب ہی دریا کے کنارے واقع تھا اور طلبا کے گروپ نے دونوں نوعمر خواتین پروفیسر فراویگے ناست اور فرالائن سینے شل سے جرمن، یونانی اور فرانسیسی پر بحث و مباحثہ شروع کر دیا۔ یہ لڑکیاں تینوں زبانیں جانتی تھیں اور میں محسوس کرتی تھی کہ وہ درحقیقت بحرالعلوم ہیں جو کچھ وہاں کہا جاتا تھا اقبال اسے نہایت گہری توجہ کے ساتھ سنتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سننے میں اس قدر محو ہو جایا کرتے تھے کہ جب سبق ختم ہو جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا طرزِ عمل لندن کے طرزِ عمل سے کس قدر مختلف تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے وہ ان تمام درختوں سے جن کے پاس سے وہ گزرتے تھے اور اس گھاس سے جس پر وہ چلتے تھے علم کی خوشہ چینی کر رہے ہیں۔

فرالائن سینے شل جس طریقے سے فلسفیانہ مسائل کی تشریح کرتی تھیں وہ اقبال کو بہت مرغوب تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی تعلیمات سے روحانی فیض حاصل کر رہے ہیں کبھی کبھی جب اقبال کے جوابات صحیح نہ ہوتے

تو فرا لائن سینے شل ..... الیسی نرمی سے ان کی اصلاح کر دیتیں کہ اقبال سکول کے بچے کی طرح اپنی انگلیوں کے ناخن کاٹنے لگ جاتے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ انھوں نے وہ بات کیوں نہ کہی جو انھیں کہنی چاہیئے تھی ۔

اقبال کی سیرت کے اس پہلو سے میں پہلے واقف نہ تھی اس لئے کہ جو خود پسندی اور طنازی ان میں لندن میں پائی جاتی تھی یہاں بالکل معدوم تھی ۔

راوی ۔ ۲۲ اگست ۱۹۰۷ء کی صبح وہ واقعہ پیش آیا جس کو بطورِ خاص عطیہ فیضی نے موضوع بنایا ہے۔

عطیہ فیضی لکھتی ہیں

اس دن ایک پکنک پارٹی مطالعہ اور تفریح کیلئے ترتیب دی گئی تھی ۔ اور سب اسی مقصد سے تیار ہو کر آئے تھے ہماری پارٹی بڑھتی گئی جوں جوں ہم پکنک میں شریک ہونے والوں کو ان کے گھروں سے لیتے گئے اقبال کی جائے قیام راستہ میں تقریباً سب سے آخر میں تھی جب ہم وہاں پہنچے تو انھیں حالتِ انتظار میں پانے کے بجائے انھیں عجیب حالتِ استغراق میں دیکھا ۔ وہ اکڑے ہوئے بیجان سے بیٹھے تھے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی ایک کتاب پر جمی تھیں جو ان کے سامنے پڑی تھی اور وہ گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے خبر تھے ۔ سب لوگ انھیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئے کہ پروفیسر اقبال کو کیا ہو گیا ہے ۔ کیا رات کی ٹھنڈ میں وہ جم کر رہ گئے ہیں کیا ان کی طبعی حالت بحال ہو سکے گی ؟

فرا یبینے شل اور فرالائن ویگے ناست تو پریشان ہوگئیں۔ وہ میرے پاس آئیں اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں ہمت کر کے اس میز تک پہنچی جہاں اقبال حالت استغراق میں گردو پیش کے حالات سے بالکل بے خبر بیٹھے تھے وہ میرے پکارنے بھی نہ بولے تو میں نے فوراً پروفیسر کی مدد سے انہیں جھنجوڑا تو ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔

اقبال۔ آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ ؟

عطیہ فیضی۔ (اردو میں جھڑک کر) اقبال ہوش میں آؤ تم اس وقت روحانیت سے مبرا جرمنی کے ایک شہر میں ہو۔ ہندوستان میں نہیں جہاں اس قسم کی حرکات کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔

راوی۔ اقبال پھر آپ میں آگئے اور پارٹی میں شامل ہوگئے[۱]

٭

راوی۔ ۲۰۔اگست ۱۹۰۷ء کا دن ہائیڈل برگ میں ہانخ فروکس کی سیر کے لئے مقرر کیا گیا جس میں کسی بادشاہ نے تمام مذاہب کی عبادت گاہیں جن میں مسجد بھی بنی تعمیر کی تھیں۔ مسجد پر ہر جگہ لفظ اللہ عربی میں کندہ تھا اس کے علاوہ کچھ آیات بھی کھدی ہوئی تھیں۔

حاضرین۔ نہ جانے کیا لکھا ہے ؟ شاید اس جگہ کے بارے میں کچھ معلومات ہوں۔ پروفیسر اقبال آپ عربی جانتے ہیں آپ پڑھ کر بتائیے کہ کیا اسرار ہے ؟

اقبال۔ ابھی بتاتا ہوں (کچھ دیر انہماک سے کتبوں کو دیکھ کر، حاضرین ان

---

[۱] اقبال از عطیہ بیگم ص ۴

ہیں اس جگہ کی تاریخ لکھی ہے۔

حاضرین۔ بتایئے کیا واقعات ہیں؟

اقبال۔ داستان کچھ یوں ہے کہ جس بادشاہ نے یہ جگہ تعمیر کی تھی اُسے اتفاق سے ایک حور مل گئی اور وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے حور نے کہا۔ میں آپ کی ملکہ بننے کیلئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے بادشاہ نے یہ شرط پوری کر دی۔ چنانچہ یہ مسجد تعمیر ہوئی اور یہیں ان کا نکاح پڑھایا گیا۔

راوی۔ عطیہ فیضی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ،

"ہم ہندوستانی تو خوب ہنسے لیکن اقبال نے شروع سے لیکر آخر تک یہ داستان جس سنجیدگی سے سنائی وہ شنیدنی تھی دوسرے تیسرے دن کے پکنک میں سب نے پھولوں کے تاج پہنے فراپروفیسر ویگے ناست اقبال کے ساتھ اپنے ملک کا دیہاتی ناچ ناچیں جس میں دوسرے طلبہ بھی شریک ہو گئے لیکن اقبال اس فن میں بہت کچے تھے اس لئے ان کے ناچ کو دیکھ کر بہت ہنسی آئی"[1]

راوی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہائیڈل برگ میں مس فرالائن ویگے ناست فرالائن سینے شل اور فرالائن کیدرنات ورزش گاہ میں جسمانی کلچر کی ورزشوں میں مصروف تھیں۔ فرالائن ویگے ناست کی بانہیں ورزش کی ضرورت کے مطابق عطیہ فیضی کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھیں کہ اتنے میں اقبال سامنے آگئے اور انھیں گھورنے لگے اور پھر بت کی طرح ساکت کھڑے ہو گئے۔

فرالائن ویگے ناست۔ اقبال! اس طرح گھور گھور کے آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم ص ۴۴

اقبال — میں یکایک ہیئت داں بن گیا ہوں اس لئے تاروں کے اس جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

راوی۔ — اس واقعہ کے دوسرے دن عطیہ فیضی ہائیڈل برگ سے واپس ہندوستان روانہ ہوگئیں۔ اقبال یوروپ ہی میں رہے لیکن خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ جون ۱۹۰۸ء میں عطیہ فیضی اپنے بہنوئی ہز ہائی نس نواب سیدی احمد خان آف جنجیرہ اور بہن رضیہ سلطان نازلی کی معیت میں پھر یوروپ گئیں اور اقبال ان سے ملنے آئے۔

عطیہ فیضی — (تعارف کراتے ہوئے) پروفیسر اقبال فلسفی و شاعر۔ اور آپ ہیں ہز ہائی نس نواب سیدی احمد خان اور نازلی بیگم آف جنجیرہ۔

اقبال۔ — کیسے مزاج ہیں آپ لوگوں کے؟

نواب اور بیگم جنجیرہ — آپ فرمایئے، تشریف رکھئے۔

نواب سیدی احمد خان — پروفیسر اقبال! بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔

بیگم نازلی۔ — عطیہ آپ کی ذہانت، فلسفہ دانی اور شاعری کی بڑی تعریف کرتی رہتی ہے۔

اقبال — کرم فرمائی ہے ان کی، یہ خود ہمہ صفت موصوف ہیں۔

بیگم نازلی۔ — (آٹو گراف نکال کر) مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کچھ لکھ دیں۔

لہ۔ "اقبال" از عطیہ فیضی۔

اقبال. بسروچشم، لایئے (لکھتے ہیں.)

ے

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیض آستاں بوسی سے گل بر سر قمر
روشنی لیکر تری موج غبار راہ سے!
دیتا ہے پنہائے شب کو نوری چادر قمر
کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفل اختر قمر
شمع بزمِ ملّت را چراغ طور کن
ظلمت خانہ مارا سراپا نور کن [1]

*

رادی. یوروپ میں یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ عطیہ فیضی کے بمبئی چلے آنے کے بعد بھی اقبال انھیں برابر خط لکھتے رہے بہت سی نظمیں بھی بھیجیں.
ان میں ایک نظم وہ ہے جس کا مطلع ہے. ے
جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
اور آخری شعر ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی!
اے خنک روزے کہ خاشاک مرا درسوختی!

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم ص ۳۶

یہ پوری نظم عطیہ فیضی نے اپنی ڈائری میں نقل کی ہے۔ نظم کے آخر میں اقبال نے لکھا ہے "میونک - جرمنی دور افتادہ اقبال"[1]

٭

وکالت کی ابتدا

راوی۔ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو علامہ کا نام عدالت عالیہ کے وکلاء کی فہرست میں شامل کر لیا گیا اس طرح اقبال اس بار روم میں داخل ہوئے جو اس عہد کے بڑے بڑے وکلاء سے بھرا ہوا تھا جنھوں نے آگے چل کر بڑا نام پایا جیسے سر میاں محمد شفیع، جسٹس شاہ دین، سر میاں فضل حسین چیف جسٹس شادی لال، اقبال کو مقدموں کی تیاری میں غیر معمولی محنت کرنی پڑتی تھی پھر ان کی نجی زندگی ایک نہایت ہی تکلیف دہ دور سے گزر رہی تھی۔ پریکٹس شروع کرتے ہی انھیں گورنمنٹ کالج میں جز وقتی پروفیسری بھی مل گئی۔ ۱۹۱۱ء تک یہ سلسلہ بھی چلا۔ ان سب امور نے انھیں شعر و شاعری سے قدرے دور ہی رکھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک علامہ نے بہت ہی کم کہا۔ اس زمانے کی خاص یادگار شذرات اور عطیہ فیضی کے نام خطوط ہیں۔ اس زمانے میں دوست احباب اور عقیدتمند شاعری اور کلام کے مجموعے کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے۔

---

[1] اقبال از عطیہ بیگم ص - ۳۶

شاطر مدراسی — آپ کا مجموعۂ کلام کب شائع ہو رہا ہے ؟

علامہ۔ — میں کیا اور میرا کلام کیا۔ مجھے ان اوراقِ پریشان کے جمع کرنے کی فرصت ہے نہ حقیقت میں ان کی ضرورت ہے محض دوستوں کے دل بہلانے کیلئے کبھی کبھی کچھ لکھتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ گذشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوتا ہے اور اب تو میں پیشہ ہی اس قسم کا اختیار کرنے کو ہوں جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔

تلوک چند محروم — کیا آپ آج کل کچھ کہہ نہیں رہے ؟

علامہ۔ — افسوس ہے کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں۔

سرکشن پرشاد۔ — کیا شاعری کا شغل ترک ہی کر دیا۔ ؟

علامہ۔ — بھائی ۔ گدھا۔ یعنی پیٹ دم بھر کیلئے مہلت نہیں دیتا۔ لاؤ چارا، لاؤ چارا۔ خدا اسے غارت کرے ...... قانونی مشاغل میں اشعار کیلئے کہاں سے وقت نکلے۔ دل اور دماغ دونوں کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پیٹ کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر کوئی خیال یا ایک تاثر اپنے اندر نہ داخل ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے مگر شکایت نہیں کہ ہمارے مذہب میں شکایت ہی کفر ہے۔[1]

[1] سرگزشتِ اقبال ص ۷۶۔

گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری

راوی۔ ولایت سے آنے کے بعد وکالت کے ساتھ ساتھ علامہ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی جز وقتی پروفیسری عارضی طور پر قبول کر لی تھی۔ محکمہ تعلیم نے عدالتِ عالیہ سے اجازت لے لی تھی کہ علامہ مقدمے میں کالج کے وقت کے بعد پیش ہوں۔ علامہ صبح چھ بجے سے نو بجے تک لیکچر دیتے اس کے بعد وکالت کرتے کچھ عرصے کے بعد حکومت کیطرف سے پیشکش ہوئی کہ وکالت چھوڑ دیں اور شعبہ فلسفہ کی صدارت قبول کر لیں۔ علامہ نے دوستوں سے مشورہ کیا۔

علامہ۔ اس پیشکش کے بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟

میاں شاہ دین۔ سرکاری ملازمت میں قوتِ عمل کے سلب ہونے کا امکان ہے۔

شیخ عبدالقادر۔ دوسرے محکمہ تعلیم میں ترقی کے امکانات بہت محدود ہیں۔

مرزا جلال الدین۔ اگر سرکاری ملازمت ہی پر نگاہ ہو تو وکالت ہی کیوں نہ رکھی جائے جس میں ترقی کے جملہ مدارج میں جج کا عہدہ بھی ہے۔

راوی۔ علامہ کے یارِ غار جلال الدین لکھتے ہیں۔

"اس پر انہوں نے کالج سے تعلقات منقطع کر لئے اور وکالت پر اکتفا کی۔[1]

☆

راوی علامہ کی پریکٹس تسلی بخش نہیں تھی اس لئے بہتر ملازمت کی تلاش میں بھی رہتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں ریاست الور بھی گئے۔

سرکشن پرشاد۔ پھر الور کی ملازمت کا کیا ہوا؟

علامہ سر علی امام نے مہاراجہ الور سے میری ملاقات کا اہتمام کرایا تھا کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے کیلئے بات ہو جائے۔ میں الور گیا بھی وہاں پہنچ کر کچھ تو مہاراجہ الور کے بارے میں بعض ناگفتہ بہ باتیں سن کر طبیعت مکدر ہوئی۔ دوسرے مہاراجہ نے کہا تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوگی اس لئے واپس چلا آیا۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کیلئے تو اس قدر رقم کافی بلکہ اس سے زیادہ ہے تاہم چونکہ میرے ذمے اوروں کی ضروریات کو پورا کرنا بھی ہے اس واسطے ادھر ادھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے۔ بڑے بھائی جان جنھوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا اب پنشن پا گئے ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمے ہیں اور ہوتے چاہیں خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔

---

[1] ۔ سرگزشتِ اقبال ص ۷۷

سرکشن پرشاد   میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایسے آدمی کو فکرِ معاش سے آزاد ہونا چاہیئے اگر آپ منظور کریں تو ایک معقول وظیفے کا اہتمام ہو سکتا ہے۔

علامہ   آپ کی فیاضی کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے مگر یہ بات مروت اور دیانت سے دور ہے کہ اقبال آپ سے ایک پیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے۔ جس کی اہمیت اس مشاہرے کے بقدر ہو۔[۱]

٭

اضطراب کا دور

راوی۔   ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کا زمانہ علامہ پر سخت جذباتی اضطراب کا تھا۔ ازدواجی زندگی کی تلخیوں سے ان پر یاسیت کا عالم طاری تھا شدید احساسِ تنہائی کا شکار تھے۔ اس دور میں وہ اپنا حالِ دل صرف دو ہستیوں سے کہتے تھے جن میں سے ایک اکبر الہ آبادی تھے۔

اکبر الہ آبادی   آج کل آپ خاموش کیسے ہیں؟ وارداتِ قلبی کا کیا عالم ہے؟

علامہ۔   لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔

طعنہ زن ہے ضبط، اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے!

---

[۱] سرگزشتِ اقبال ۷۸۔

لارڈ بیکن کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہو اتنی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ ماہ (ستمبر ۱۹۱۱ء) میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشان رہا اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے اور میری طبع سلیم میرے لئے شکنجے کا کام دے گئی۔

اکبر الٰہ آبادی سماجی اور قومی دلچسپیوں کا کیا حال ہے؟

علامہ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں، نام و نمود پر مرنیوالے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلوتہی کرتا ہوں

راہی۔ یہ مکالمہ اور اس سے پچھلا مکالمہ اس مکاتبت پر مبنی ہے، جو سر کشن پرشاد، اکبر الٰہ آبادی، اور اقبال کے درمیان اس دوران، ہوئی۔ [۱]

اس زمانہ میں انھوں نے نظم یا نثر میں کچھ زیادہ لکھا بھی نہیں سوائے اس ڈائری کے جو افکار پریشاں کے نام سے انگریزی میں لکھتے رہے۔ اقبال کی ذہنی و جذباتی کیفیت کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک عطیہ فیضی کو رقم کئے۔ چونکہ خطوط بھی ایک طرح سے مکالمات ہوتے ہیں۔ اس لئے ان خطوط کی تاریخی اور سوانحی اہمیت کے پیش نظر انہیں مکالمے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اقبال سب سے پہلے تو میں انتہائی خلوص سے معذرت کروں گا کہ

[۱] سرگزشت اقبال ص ۸۷

میں آپ کی والدہ کی رحلت کے موقعہ پر تعزیت کیلئے حاضر نہ ہو سکا۔ کیونکہ میری انتہا درجے کی پیشہ وارانہ مصروفیت مانع ہوئی۔ ورنہ ضرور آتا۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ایرانی فلسفہ مابعد الطبیعات پر میری کتاب شائع ہو گئی ہے بہت جلد آپ کو اس کی ایک جلد پیش کروں گا۔

عطیہ فیضی۔ غزلیات کے بارے میں کیا خبر ہے؟

اقبال۔ غزلیات کو بھی بہت جلد شائع کر رہا ہوں وہ یہیں ہندوستان میں چھپیں گی لیکن ان کی جلد بندی جرمنی میں ہوگی اور ان کا انتساب ایک ہندوستانی خاتون کے نام ہوگا۔

عطیہ فیضی۔ بہت خوب! اچھا یہ تو بتایئے کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کی پیش کردہ فلسفے کی پروفیسری کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ علی گڑھ کے مسلمانوں کے تعلیمی مقصد کو ترقی دینے کیلئے آپ ایسے آدمی کی ضرورت ہے۔

اقبال۔ آپ نے ایک دکھتی رگ کو چھیڑا ہے تو سنیئے! ہاں میں نے علی گڑھ کی فلسفہ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اسی طرح چند دن ہوئے لاہور گورنمنٹ کالج میں تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ میں کسی قسم کی ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جاؤں لیکن میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرضدار ہوں۔ اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے والدین مجھ پر ایک بیوی زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انھیں

میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بالخصوص جبکہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت کرنے پر بالکل رضامند ہوں لیکن میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت اور خوشی حاصل کرنے کا حق ہے اگر سوسائٹی مجھے وہ حق دینے سے انکار کر دے تو میں اس کا کھلم کھلا مقابلہ کروں گا۔ اس تمام صورت حال کا واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے کتابوں کے یہ مردہ بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے۔ میری روح میں کافی آگ پنہاں ہے جو انھیں بھی جلا سکتی ہے اور تمام سماجی رسوم کو بھی۔

عطیہ فیضی۔ یہ نہ بھولئے کہ ایک اچھے خدا نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔

اقبال۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر اس زندگی کے واقعات ایک مختلف نتیجے کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں۔ کسی اچھے خدا کی بجائے ذہنی طور پر کسی بااختیار جابر قوت پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ براہ کرم ان خیالات کے اظہار کیلئے معاف کیجئے۔ ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں میں تو صرف اپنی روح کے بوجھ کو اتار دینا چاہتا تھا۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جرأت کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت سے کیوں انکار کیا۔؟

عطیہ فیضی۔ آپ بہت دل گرفتہ ہیں اتنی زیادہ قنوطیت اچھی چیز نہیں، ایسا کر کے آپ سخت کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں جو آپ کے مرتبے کے انسان سے

فروتر ہے۔ زندگی کے بارے میں یہ منفی رویہ تو آپ کی استاد فرا پروفیسر ویگے ناست کے خیالات کے بھی منافی ہے۔ ہاں خوب یاد آیا کوئی خط سینے شل یا ویگے ناست کا آیا۔؟

اقبال۔ ویگے ناست کا خط آیا تھا میں اس لڑکی کو بجد پسند کرتا ہوں وہ کس قدر اچھی اور سچی ہے میں نے اُسے خط لکھا ہے اور اچھے بوڑھے فرا پروفیسر کو بھی۔

عطیہ فیضی۔ آپ حوصلہ سے کام لیجئے مشکلات تو انسان کا ورثہ ہیں۔

اقبال۔ آپ کی تسلی کا شکریہ۔

عطیہ فیضی۔ یہ تسلی زبانی نہیں میں خود آپ سے بہت سے سوالات پوچھنا چاہتی تھی۔

اقبال۔ تو پھر پوچھتی کیوں نہیں؟ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاتا میرا ایمان ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے گذشتہ رات کا خواب آپ کو سناتا ہوں۔ محض یہ دیکھنے کیلئے کہ آپ کیا تشریح کرتی ہیں۔

گزشتہ رات میں بہشت میں پہنچا اور دوزخ کے دروازوں میں سے گذرنے کا اتفاق ہوا میں نے اس جگہ کو خوفناک طریقے پر سرد پایا۔ جب فرشتوں نے مجھے متعجب دیکھا تو انھوں نے کہا یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے لیکن ہر شخص اپنے انگارے اپنے ساتھ لاتا ہے اس لئے یہ شدت سے گرم ہوجاتی ہے اس ملک میں جہاں کوئلے کی کانیں بہت زیادہ نہیں ہیں جتنے انگارے جمع کرنے ممکن ہیں ان کے جمع کرنے کی تیاری میں مصروف ہوں۔

فرمائیے کیا تشریح کرتی ہیں آپ؟

عطیہ فیضی۔ تشریح کیا کروں؟ آپ سخت ذہنی اذیت کا شکار ہیں وہ آپ کی شگفتہ دلی کیا ہوئی؟ وہ آپ کے ایک بڑے اچھے دوست تھے شیخ عبدالقادر کیا ان سے گپ شپ نہیں ہوتی۔

اقبال۔ چیف کورٹ کے بار روم میں ہر روز انھیں دیکھتا ہوں لیکن آجکل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔

میری اپنی بدنصیب ذات ان مصیبت انگیز خیالات کی کھان بنی ہوئی ہے۔ جو سانپ کی طرح میری روح کے عمیق اور تاریک سوراخوں سے باہر نکلتے ہیں میرا خیال ہے کہ میں سپیرا بن جاؤں گا اور بازاروں میں اس طرح گھومتا پھروں گا کہ متجسس لڑکوں کی جماعت میرے پیچھے ہوگی۔

عطیہ فیضی۔ آپ شدید قسم کے قنوطی ہو گئے ہیں۔

اقبال۔ نہیں، میں یاس پسند نہیں میں آپ سے کہتا ہوں کہ تکلیف نہایت ہی لذیذ چیز ہے۔

اپنی بدقسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ خوش و خرم ہیں آپ دیکھتی ہیں کہ میں اپنی مسرت کس طرح چھپ چھپ کر حاصل کر لیتا ہوں۔

عطیہ فیضی جرمنی میں تو آپ ایسے نہ تھے۔

اقبال۔ جرمنی کے وہ دن جب آپ وہاں تھیں اور ویگے ناست، سینے شل .... آہ۔ وہ دن جو پھر کبھی نہ آئیں گے۔

٭

راوی۔ ع۔ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔ ملال یا مایوسی

کی انتہا پر پہنچ کر اقبال کو اپنی بیقراری میں قرار سا آنے لگا تھا یا فلسفی شاعر پر غالب آنے لگا تھا۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے دسمبر ۱۹۱۱ء تک اقبال کم و بیش متواتر عطیہ فیضی کو لکھتے رہے۔ اور ان کے جوابات آتے رہے ان خطوط میں وہ زیادہ سنبھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پاسبان عقل کی گرفت زیادہ مضبوط ہو رہی ہے اور وہ جذباتی انتشار کے بھنور سے نکلتے نظر آتے ہیں۔ ذیل کا مکالمہ اس دور کی مکاتبت کے اہم اقتباسات پر مبنی ہے۔

عطیہ فیضی۔ سچ پوچھیے تو میں آپ کو کچھ نہیں سکی۔

اقبال۔ آپ تو آپ میں خود بھی اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔

۵

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

یہ میں نے چند سال پہلے کہا تھا۔ بہت سے لوگ میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔

عطیہ فیضی۔ تضاد فکر کی یا تضاد عمل کی۔

اقبال۔ بہر حال جو کچھ بھی لوگ میرے متعلق خیال کرتے ہیں میں نے اُسے خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ آپ اسے عنقریب مخزن میں دیکھیں گی۔

عطیہ فیضی۔ کس عنوان سے؟

اقبال۔ "زہد اور رندی" نظم کا عنوان ہوگا مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگوں کا رویہ میرے ساتھ ہمدردانہ نہیں۔

علامہ فیضی۔ آپ نے پچھلے خط میں بھی اشارہ کیا تھا کہ شمالی ہند کے لوگ آپ کا کماحقہ احترام نہیں کرتے اور جیسا کہ حق ہے آپ کی تعریف نہیں کرتے۔ مجھے یہ جان کر بڑی تکلیف ہوئی۔

اقبال۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اس بات سے تکلیف ہوئی۔ میں آپ سے برملا کہتا ہوں کہ مجھے دوسرے لوگوں کے احترام کی کچھ پرواہ نہیں ہے میں دوسروں کے سانس سے زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار!
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

میں سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں میرا دل اور میری زبان ایک دوسرے کے کلیتاً ہمنوا ہیں لوگ ریاکاری کا احترام بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی۔ اگر ریاکاری سے مجھے شہرت، احترام اور تعریف حاصل ہوتی ہے تو میں اسے پسند کروں گا کہ میں ایسی حالت میں مر جاؤں جب کہ مجھے جاننے والا اور میرا ماتم کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔

پبلک کے بہت سے پیروں والے عفریت کو اپنے احترام کا تحفہ دوسروں کو دینے دیجئے جو مذہب اور اخلاق کے بارے میں چھوٹے مطمح نظر کی مطابقت میں عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں میں ان رسوم و رواج کا احترام کرنے کی غرض سے جو انسانی دماغ کی فطری آزادی کو دباتے ہیں اپنے آپ کو جھکا نہیں سکتا۔

بائرن، گوئٹے اور شیلے کا ان کے زمانے کے لوگوں نے مطلق احترام نہیں کیا۔ اور اگرچہ شاعرانہ اعتبار سے میں ان سے کہیں کم ہوں تاہم میں فخر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے ان سب کی رفاقت حاصل ہے۔

عطیہ فیضی۔ آپ اتنے انکسار سے کیوں کام لے رہے ہیں کوئی آپ کا تبحر آرنلڈ سے پوچھے، سینے شل، ویگے ناست جیسی یگانۂ روزگار فاضلوں سے پوچھے، خود میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

اقبال۔ آپ کو سیکھنے سکھانے کی کبھی ضرورت ہی نہ تھی مجھے یاد ہے کہ میں نے افلاطون سے آپ کا تعارف کرایا تھا اور بس۔ میں نے فلسفہ افلاطون اس قدر کم پڑھا ہے کہ میں منصفانہ طور پر اس عزت کے حصول کا دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے آپ کو کچھ سکھایا۔

عطیہ فیضی۔ بہرحال مجھے یقین ہے ایک دن دنیا آپ کی پرستش کریگی۔

اقبال۔ میں یہ خواہش ہی نہیں رکھتا ہوں کہ میری پرستش کی جائے اس لئے کہ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میں پرستش کا موضوع نہیں بن سکتا۔ میرے رگ و ریشے میں تو پرستش کرنے کا فطری رجحان گہرے طریقے سے پیوست ہو چکا ہے لیکن اگر میری روح کے عمیق خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں اور وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کبھی سامنے آجائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کریگی وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دیگی اور آنسوؤں کی شکل میں خراجِ تحسین ادا کرے گی۔

مجھ میں خامیاں ضرور ہیں لیکن ریاکاری اور بے اعتنائی مجھ میں نہیں ہے

عطیہ فیضی۔ گو بے پرواہ ضرور ہیں۔

اقبال۔ مجھے بے پرواہ یا ریاکار نہ کہیئے کنایتاً بھی نہیں اس لئے کہ اس سے میری روح کو تکلیف پہنچتی ہے اور میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ آپ

میری فطرت سے ناواقف ہیں۔ کاش میں اپنے دل کو اندر سے دکھا سکتا تاکہ آپ بہتر طریقے سے میری روح کا مشاہدہ کرسکتیں جس کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ ریا کاری اور بے پروائی کی وجہ سے اس پر تاریکی چھا گئی ہے۔ میں بد قسمتی سے ایسا شخص ہوں جو اپنی دلی محبتوں کو ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود وہ عدم اظہار کے باعث بہت عمیق رہتی ہیں۔ اگر کوئی موقعہ آیا تو کبھی یقیناً آپ کو بتاؤں گا کہ میں اپنے دوستوں سے کس قدر شدید محبت کرتا ہوں اور میرا دل ان سب کیلئے کس قدر گہرے طریقے سے بیتاب رہتا ہے لوگ زندگی کو پیارا سمجھتے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے۔ لیکن مجھ میں حوصلہ ہے کہ میں اسے مفت نذر کر دوں جب کبھی دوسروں کو اس کی ضرورت ہو۔

عطیہ فیضی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے دل میں میری خواہشات کا احترام نہیں ہے۔

اقبال۔ بلا شبہ آپ کا یہ احساس عجیب و غریب ہے اس لئے کہ ہمیشہ سے میری یہ عادت رہی ہے کہ میں آپ کی خواہشات کا احترام کروں اور آپ کو ہر ممکن طریقے سے خوش کروں مگر بعض اوقات ایسا کرنا میرے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے اور حالات کی قوت مجھے مختلف سمت میں جانے پر مجبور کر دیتی ہے بہر حال میں وہ ہر کام کرنے کیلئے تیار ہوں جس سے آپ خوش ہوں۔

عطیہ فیضی۔ میں نے جو ملامت کی تھی وہ اس اندیشے سے کی تھی کہ کہیں آپ حیدرآباد یا کسی ہندوستانی ریاست کی ملازمت کے سنہری جال میں نہ پھنس جائیں۔ اور آپ کی شاعرانہ جینئس خاک میں نہ مل جائے۔

اقبال۔ آپ کی ملامت کا بہت بہت شکریہ، ملامت سے زیادہ دوست کی اور کوئی چیز اُٹھانے کے قابل نہیں ہوتی مہربانی فرماکے میرے حیدرآباد دکن، جانے کے بارے میں کوئی نتائج اخذ نہ کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل و دماغ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی میں ابھی تک وہی شخص ہوں ایک نہ ایک دن آپ خود دیکھ لیں گی۔

عطیہ فیضی۔ میرا اندیشہ تھا کہ ریاست کے حکام کی خاطرداری سے آپ رام نہ ہو جائیں۔ مجھے کچھ یہ بھی خیال تھا کہ آپ ضرورت سے زیادہ عملی آدمی بنتے جا رہے ہیں۔

اقبال۔ مجھے بیحد ملال ہے کہ آپ ایک حد تک مجھ سے بدظن ہو گئی ہیں آپ مجھے الزام دیتی ہیں کہ میں دنیادار عملی آدمی بن گیا ہوں شاید اس میں صداقت کا عنصر موجود ہو لیکن جب آپ تمام حالات سے باخبر ہو جائیں گی اس وقت اس کیلئے کچھ نہ کچھ وجہ جواز پائیں گی دوسرے امور میں، میں ابھی تک خواب دیکھنے والا شخص ہوں۔

دوسرے میں نے یہ کب کہا تھا کہ نظام کی قدرشناسی میری عزت افزائی کا باعث ہے آپ جانتی ہیں کہ میں ان تمام باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کیا کرتا۔

میں نہیں چاہتا کہ بہ حیثیت شاعر کے پہچانا جاؤں اگرچہ بدقسمتی سے لوگ اسی حیثیت سے مجھے جانتے ہیں ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ نیپلز سے ایک اطالوی بیرونیس کا خط میرے پاس آیا تھا اس نے مجھ سے میری چند نظمیں معہ انگریزی ترجمہ کے طلب کی تھیں۔ لیکن شاعری کے متعلق میں اپنے دل میں کسی قسم کا ولولہ محسوس نہیں کرتا اور اس کی

ذمہ دار آپ ہی ہیں۔

میں ایک ہندوستانی والیٔ ریاست کی قدر شناسی کی کیا پرواہ کر سکتا ہوں۔ جبکہ غیر ممالک کے صاحب کلچر اشخاص کی قدر شناسیاں مجھے ملتی رہتی ہیں۔

نہیں، مائی ڈیئر مس عطیہ! آپ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں اور ایسا ظالمانہ طرزِ عمل اختیار نہ کریں جیسا کہ آپ نے میری توقعات کے خلاف (حال ہی میں) کیا ہے۔ (خدا کیلئے) آپ اس وقت تک انتظار کریں جب تک ساری حقیقت آپ کے سامنے نہ آجائے۔ ایسا کرنا محض متصفانہ ہوگا اور آپ یقیناً منصف ہیں اگرچہ آپ بعض اوقات ظالم اور بیدرد نظر آتی ہیں ...... ان دنوں کی یاد میں .... دن جو فطرت میں مردہ ہو چکے ہیں لیکن میرے دل کی دنیا میں زندہ ہیں۔ میرا پیغام آپ اپنی عالی مقام بہن اور بہنوئی (نواب اور بیگم آف جنجیرہ) کو ضرور پہنچادیں اور ان سے کہہ دیں کہ وہ میری کوتاہی کو بے اعتنائی پر محمول نہ فرمائیں اور یہ نہ سمجھیں کہ کوئی اور ہستی میرے دل میں زیادہ محبوب جگہ کی مالک ہے یا میرے اندازے میں زیادہ بلند مقام کی مالک ہے۔

عطیہ فیضی۔ آپ کی اتنی پرخلوص وضاحت کے بعد تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے آپ کی نئی نظموں کی نقل لوں۔

اقبال آپ یہ نظمیں لے کر کیا کریں گی؟ یہ تو ایک زخمی دل کی دردبھری چیخیں ہیں ان میں مسرت کی کوئی بات نہیں جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔

خندہ ہے بہرِ طلسمِ غنچہ تمہیدِ شکست
تو تبسم سے میری کلیوں کو نامحرم سمجھ

درد کے پانی سے ہے سرسبزیٔ کشتِ سخن
فطرتِ شاعر کے آئینہ میں جوہر غم سمجھ

عطیہ فیضی۔ نظموں کا کوئی مجموعہ تو مرتب ہوا ہوگا؟

اقبال۔ میں کیا بتاؤں؟ آپ کو شاید علم نہیں میں ان دنوں بہت ہی پریشان رہا ہوں۔ میری بدقسمتی ایک وفادار کتے کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے اور میں نے اس خاتون کو پسند کرنا سیکھ لیا ہے۔ یہ سبب اس کی نہ تھکنے والی وفاداری سے جو اسے اپنے بدنصیب اور ناشاد یا دشا؟ سے تھی۔

نظموں کے مجموعے کی مانگ ملک بھر سے ہے ایک دوست نے یہ سارا کام کرنے کی آمادگی ظاہر بھی کی ہے یعنی تمہید لکھنا انھیں ہندوستان کے بہترین چھاپہ خانہ میں چھپوانا اور کتاب کی جلد بندی جرمنی میں کرانا۔ لیکن میرے دل میں اب شاعری کا کوئی ولولہ باقی نہیں رہا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی دیوی کو قتل کر دیا ہے اور مجھ سے میرا سارا تخیل چھین کر مجھے بے بال و پر بنا دیا ہے۔ شاید گورستانِ شاہی، میری آخری نظم ہو۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں گویا اس نظم کا لکھنا میرے فرائض میں داخل ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اگر یہ مکمل ہو گئی تو کچھ عرصے تک ضرور زندہ رہے گی۔

راوی۔ خدا کا شکر ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مزار پر لکھی گئی یہ نظم اقبال کی آخری نظم ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ اقبال کے ذہنی سفر کی

راہ میں ایک نئی سمت کا اشارہ بنی۔ اقبال ذہنی اور جذباتی انتشار کے بھنور سے جلد نکل آئے۔ ان کی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اس نئے رجحان کا سراغ سب سے پہلے اس خط میں ملتا ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی ہی کو ۷۔جولائی ۱۹۱۱ء کو لکھا اور ان کو بتایا کہ وہ اپنے والد کی فرمائش پر بوعلی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی میں لکھنے کی ابتدا کر رہے ہیں۔ اس کے ابتدائی اشعار بھی انھوں نے لکھ کر بھیجے یہی وہ مثنوی تھی جو چند سال بعد اسرارِ خودی کے نام سے شائع ہوئی۔

دوسری اور تیسری شادی!

راوی: علامہ کی پہلی شادی میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد ۱۸۹۴ء میں گجرات کے سول سرجن ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی مریم بی بی سے ہوئی تھی۔ یہ والدین کی پسند کی شادی تھی۔ ان سے علامہ کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا آفتاب اور ایک بیٹی معراج بیگم، بدقسمتی سے علامہ کی ان پہلی بیوی سے نبھی نہیں۔ دونوں بچے زیادہ تر ننھیال ہی میں رہتے تھے۔ معراج بیگم نے اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ آفتاب سے بھی علامہ کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ یوروپ سے واپس آنے کے بعد علامہ کی زندگی بہت تلخ ہوگئی تھی۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے دوسری شادی کا ڈول ڈالا ابھی نکاح ہی ہوا تھا کہ اس رشتے میں کچھ پیچیدگیاں پڑ گئیں چنانچہ انہیں

تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ پھر حسنِ اتفاق سے دوسرے رشتے کے معاملات سلجھ گئے۔

اِن ڈرامائی واقعات کی تفصیل علامہ نے مہاراجہ سر کشن پرشاد کو سنائی۔

سر کشن پرشاد۔ "پہلی بار جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے شادی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ آپ نے تیسری شادی کب کی ؟

علامہ۔ تیسری شادی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی۔ ۱ اگست ۱۹۱۳ء ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرتناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کیلئے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں اسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش دوسری شادی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لاہور کے ایک معزز کشمیری گھرانے کی اس لڑکی سے تین سال پہلے میرا نکاح ہوا تھا ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ لاہور ہی کے ایک وکیل نبی بخش نے سازش کر کے کچھ گمنام خطوط میرے نام بھجوائے جن میں اس عفیفہ پر بہتان تراشی کی گئی تھی میں مخمصے میں پڑ گیا۔ کئی سال گزر گئے اس عرصے میں لدھیانے کے نولکھا گھرانے سے ایک معقول رشتہ آیا میں نے مجبوراً قبول کر لیا۔ یہ شادی کرنے کے بعد ایک نیا بحران پیدا ہوا۔ مختلف وسائل سے اس سازش کا پردہ چاک ہوا جو کشمیری گھرانے کے اس لڑکی کے خلاف ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ لڑکی کا دامن ہر اعتبار سے پاک ہے۔ میری اس منکوحہ

نے مجھے ایک خط بھی لکھا جس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ میں نے ایک بہتان پر یقین کر لیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے۔ اب میں دوسرے نکاح کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی میں اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روزِ قیامت دامنگیر ہوں گی۔

اب میں مجبور تھا اور اخلاقاً بھی پابند کہ اس خاتون سے شادی کروں چنانچہ علماء سے مشورہ لے کر دوبارہ نکاح کر لیا۔ یہ داستان ہے میری تیسری شادی کی۔ اب تینوں میرے ساتھ ہیں۔

ملّی و سیاسی شاعری کا آغاز

راوی۔ جنگِ طرابلس (۱۹۱۲ء) کے دنوں میں علامہ نے ایک نظم لکھی عنوان تھا "حضورِ رسالت مآبؐ میں" علامہ نے یہ نظم شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ حکیم یوسف حسن کا بیان ہے کہ علامہ کے نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، سر فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایسے اکابر آتشیں تقریریں کر چکے تھے جن میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں کے غیض و غضب کا اظہار کیا گیا تھا اس کے بعد جب علامہ نے اپنی نظم اپنے پرسوز ترنم سے شروع کی تو مجمع پر ایک سحر آسا سکوت چھا گیا۔ جب علامہ نے پوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر

پڑھا۔

مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں!
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی!

تو لوگوں کا تجسّس اور بھی بڑھ گیا اور جب علامہ نے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

تو بقولِ حکیم یوسف حسن مجمع بے قابو ہوگیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے نالہ و شیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جوش اتنا تھا کہ لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور فرش پر تڑپنے لگے۔ ایک عجیب منظر تھا۔ پُرسوز و ایمان افروز۔

اس واقعہ کے تیسرے دن حکیم یوسف حسن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے دوسرے لوگ بھی تھے حاضرین میں کسی نے شاہی مسجد کی نظم کا ذکر چھیڑ دیا۔

حاضرین۔ اللہ اکبر، کیا منظر تھا۔ شاہی مسجد کے مناروں نے ایسا ایمان افروز جوش و ولولہ کب دیکھا ہوگا۔

حکیم یوسف حسن۔ ایسی موثر اور دلدوز نظم میں نے پہلے کبھی نہیں سنی۔

حاضرین۔ نظم سی نظم تھی جوش و جذبے کا ایک طوفان تھا۔ خیریت گزری ورنہ جو حال بھاٹی کا تھا اس سے اندیشہ تھا کہ لوگ بے قابو ہوکر ہنگامہ برپا نہ کردیں۔

علامہ۔ اچھا ہی ہوا مسلمان اپنے آپ میں رہے۔ ورنہ میں چاہوں تو اپنے شعروں سے آگ لگا دوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت

راوی۔ ۱۹۱۵ء میں علامہ کی فارسی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی جس کی تسوید میں وہ چند سال سے مصروف تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد صدرِ اعظم حیدرآباد دکن سے علامہ کے مخلصانہ اور بے تکلفی کے تعلقات تھے کچھ اس وجہ سے بھی کہ مہاراجہ تصوف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ مثنوی شائع ہوئی تو انھوں نے اس میں بڑی دلچسپی ظاہر کی۔

سرکشن پرشاد۔ اس مثنوی کو لکھنے کا خیال آپ کو کیسے پیدا ہوا؟ خواجہ حسن نظامی وغیرہ اہلِ تصوف اس پر خصوصًا حافظ پر تنقید والے حصے پر جو اعتراضات کر رہے ہیں اس سے آپ بے خبر تو نہیں ہوں گے۔

علامہ۔ یہ مثنوی جس کا نام اسرارِ خودی ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بیخودی کی طرف ہے مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کیلئے کیوں انتخاب کیا گیا جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہولے گا میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ

احساس ہے کہ میرا بھی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد یہی ہے۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب ومطلوب بنا دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ وبرباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے۔ مگر

ع من صدائے شاعر فرداستم

ناامید استم زیاران قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال، یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے اُگے گا ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بار آور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمد للہ[1]

پ

راوی۔ ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی شائع ہونے کے بعد کا قصہ ہے۔
فقیر سید نجم الدین علامہ سے ملنے گئے تو دیکھا وہ زار و قطار رو رہے ہیں۔

نجم الدین۔ خیر باشد، خیریت تو ہے؟

علامہ۔ اللہ کا شکر ہے سب بہ عافیت ہیں۔

---

[1] سرگزشتِ اقبال

نجم الدین. پھر اس اشکباری کا سبب ؟

علامہ. لو یہ خط پڑھو.

نجم الدین. (خط پڑھ کر) یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ پروفیسر نکلسن نے جو آپ کے استاد بھی رہ چکے ہیں آپ سے مثنوی کے ترجمے کی اجازت طلب کر لی ہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی مثنوی نے قابل مستشرق کو متاثر کیا ہے اس کے ترجمے سے یورپ کے اہل علم بھی آپ کے کلام و پیام سے متعارف ہو سکیں گے۔

علامہ. (جو اس گفتگو کے دوران سر جھکائے بیٹھے تھے) مجھے تو اسی بات پر رونا آگیا کہ جس قوم کے دل میں احساسِ خودی پیدا کرنے کیلئے میں نے یہ کتاب لکھی تھی وہ نہ تو پوری طرح اس کا مطلب سمجھ سکتی ہے اور نہ اسکی قدر کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ میرے پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتاب میں نے ان کیلئے نہیں لکھی [۱]

٭

راوی. ولایت سے آنے کے بعد علامہ اپنی نجی زندگی کی ناآسودگیوں کے باوجود قومی مسائل سے لاتعلق تو نہیں تھے۔ شکوہ، خطاب بہ نوجوانانِ اسلام، حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور فاطمہ بنت عبداللہ ایسی نظمیں ظاہر کرتی ہیں وہ ملی سیاست میں پوری نظری دلچسپی لے رہے تھے لیکن عملی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کو انھوں نے پسند نہیں کیا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ خاموش ضرور تھے کچھ افتادِ طبع کی وجہ

[۱] ، روزگار فقیر جلد دوم ص ۶۳ - ۱۶۲

ہے اور کچھ معاشی اور نجی الجھنوں کی وجہ سے۔

علی برادران محمد علی، شوکت علی سے علامہ کے قریبی تعلقات تھے۔

شوکت علی۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ آپ علی گڑھ کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوں آپ کا کلام ہمارے لئے گرمیِ ایمان کا ذریعہ ہے۔

علامہ بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر اس وجہ سے کہ روٹی کھانے کی مجبوری ہے۔

تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصے سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔

راوی۔ انجم اسلم لکھتے ہیں کہ میری طالب علمی کے زمانے میں مرزا جلال الدین بیرسٹر کے یہاں ادبی مجلس کا اجلاس ہوتا تھا میں بھی کبھی کبھی حاضر ہوتا۔ علامہ اقبال طلبہ کو اپنے اردو اشعار کے معنی اور مطالب سمجھاتے اور طلبہ نوٹس لیتے جاتے۔ کبھی کبھی علامہ کی تقریر میں سیاست بھی راہ پا جاتی خوب بحث ہوتی۔ پنجاب کے آئی جی مسٹر بنیٹ علامہ سے ارادت رکھتے تھے ایک ملاقات میں دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

مسٹر بنیٹ۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی ادبی مجلس کیسی جا رہی ہے؟

علامہ۔ مجلس کیا دس پانچ طلبہ اکٹھے ہو جاتے ہیں انھیں دو چار اشعار سمجھا دیتا ہوں۔

مسٹر بنیٹ اور کچھ حالاتِ حاضرہ اور سیاست پر تبصرہ بھی؟

علامہ۔ ہاں وہ بھی کبھی کبھی لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا؟

مسٹر بنیٹ ڈاکٹر صاحب ادبی مجلس کے چار طلبہ مخبری کا کام بھی کرتے ہیں میرے پوچھنے کا مطلب بھی یہی تھا کہ میں عرض کر دوں کہ صورت حال کیا ہے

علامہ۔ شکریہ! یاد آیا میں نے ایک سفارشی خط لکھا تھا آپ کو۔

مسٹر بنیٹ آپ حکم دیں اور میں کام نہ کروں۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد کو حوالدار کے عہدہ پر ترقی دے دی ہے۔

علامہ۔ ہیڈ کانسٹیبل! وہ تو بیکار تھا۔ سپاہی بھرتی ہونا چاہتا تھا۔

مسٹر بنیٹ (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب! اس کا نام دنیا ہے۔ وہ خفیہ پولیس کا آدمی تھا دو سال سے آپ کے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھنے کے لئے متعین تھا۔

راوی۔ بقول ایم اسلم خوشی محمد کا قصہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے ایک سنجیدہ صورت جوان آدمی علامہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا آتے ہی ہاتھوں کو بوسہ دیتا پھر پاؤں دبانے بیٹھ جاتا تھا۔ وہ کبھی دن کے وقت کبھی شام سے پہلے آجاتا اور رات کے آٹھ نو بجے تک بیٹھا رہتا مہذب اور خاموش سا تھا۔ علی بخش سے خوب گھل مل گیا تھا۔ کہتا تھا بیکار ہوں۔ ایک روز علی بخش نے علامہ سے سفارش کی کہ آپ خوشی محمد کو پولیس میں نوکر کرا دیں۔ علامہ نے مسٹر بنیٹ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا

ث

راوی۔ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستان کا تعاون حاصل کرنے کیلئے

انگریزی حکومت نے حق ارادیت دینے کیلئے بڑے بڑے چوڑے وعدے کئے تھے۔ جنگ کامیابی سے ختم ہوئی تو انگریزوں نے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات نافذ کیں جو توقعات اور وعدوں سے بدرجہا کم تھیں۔ ان کے خلاف بددلی پھیلی تو اس کو دبانے کیلئے ایک کالا قانون رولٹ ایکٹ کے نام سے ۱۹۱۹ء میں مسلط کر دیا تھا جس کے ذریعے حکومت کو ہر قسم کے جارحانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی تھی گویا قانون کی حکومت عملی طور پر ختم کر دی گئی تھی۔ اس کے خلاف جو احتجاج ہوا تو جلیانوالہ باغ میں بے دریغ گولی چلی۔ سینکڑوں افراد مارے گئے اس کے ردعمل کے طور پر لاہور میں ہڑتالیں جلسے جلوس شروع ہوئے علامہ اس زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے ان کے ساتھ ان کی بھتیجی وسیمہ مبارک بھی رہتی تھیں ان کے بیٹے خالد نظیر صوفی اپنی کتاب "اقبال درونِ خانہ" میں لکھتے ہیں

یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے میری والدہ محترمہ اس وقت سات برس کی تھیں وہ بیان کرتی ہیں :-

ان دنوں ہم انارکلی میں رہتے تھے ایک روز بازار سے بڑا عظیم الشان جلوس نکلا۔ بیشمار نوجوان بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے رولٹ بل ہائے ہائے کے فلک شگاف نعرے لگائے جا رہے تھے ہم سب نے دریچوں سے اس کا نظارہ کیا ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ بازار میں سے پھر شور اُٹھا۔ ہم سب کھڑکیوں کی طرف لپکے تو ایسا دل فگار منظر آیا کہ روح کانپ اُٹھی۔ چند فوجی گاڑیاں جن میں خون سے لت پت لاشیں بڑی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں آہستہ آہستہ بازار سے گزر رہی تھیں ہر طرف شور تھا کہ جلوس پر گولی چل گئی۔ بڑے بڑے خوبصورت نوجوان جو

ابھی چند لمحے پیشتر رولٹ بل ہائے ہائے کے نعرے لگاتے ہوئے گزر رہے تھے خون میں نہلا دیئے گئے۔

سردار بیگم (بیگم اقبال) زار و قطار رو رہی تھیں۔

بیگم اقبال۔ ظالموں نے کتنی ماؤں کے لال موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔

علامہ۔ (جو سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے گلوگیر آواز میں)

...... میرے مولا کو یہی منظور ہے سر تابی کی مجال نہیں وہ ان شہداء کی قربانیاں ضرور قبول کرے گا۔ جنھوں نے عروسِ آزادی کی مانگ کیلئے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے۔

٭

فکرِ شعر کا انداز

راوی۔ مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ:

"بعض اوقات اقبال پر ایک معنی خیز سکوت سا چھا جاتا اور وہ یوں دکھائی دینے لگتے گویا اور ہی دنیا میں چلے گئے ہیں پھر وہ یکلخت چونک پڑتے گویا نیند سے بیدار ہوئے ہیں اس حالت کے ظاہر ہوتے ہی ہم سمجھ جاتے کہ ان کے دل پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔"

سنہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے امرتسر میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا تھا جس میں مولانا محمد علی شوکت علی سید سے بردولی جیل سے رہا ہو کر آ رہے تھے اس جلسہ میں شرکت کیلئے نواب سر ذوالفقار علی خان، اقبال اور میں نواب صاحب کی موٹر میں امرتسر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم باتیں کرتے جا رہے

تھے کہ اچانک اقبال پر وجدانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ انھیں خاموش پاکر نواب صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔

نواب سر ذوالفقار۔ لو بھئی یہاں تو فکرِ شعر ہو رہی ہے۔

اقبال۔ (کچھ دیر بعد چونک کر) ہاں صاحب اب کہیئے کیا ارشاد ہے؟

مرزا جلال الدین۔ کوئی شعر موزوں ہوئے ہوں تو سنائیے

اقبال۔ ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے، اِک لہو کی بوند ہے!
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

راوی۔ امرتسر کے جلسہ میں علامہ نے یہی اشعار اپنے خاص انداز میں پڑھے۔

❊

راوی۔ امرتسر کے جلسے جلوسوں کے بعد یہ دونوں بھائی لاہور آئے۔ ان کا جلوس لاہور ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا اور کشمیری بازار سے ہوتا ہوا تمام بڑے بڑے بازاروں سے گزرا۔ نمازِ عصر کے وقت یہ جلوس انارکلی بازار میں تھا جب جلوس اقبال کے مکان کے سامنے پہنچا تو دونوں بھائی

اقبال کے مکان پر چلے گئے جہاں انھوں نے پہلے نماز پڑھی پھر سیاست حاضرہ پر کچھ گفتگو ہوئی۔

محمد علی شوکت علی۔ ہم تو جیل کی مصیبت جھیلتے ہیں اور آپ کا کلام اس سلسلے میں مہمیز کا کام کرتا ہے مگر آپ ہیں کہ اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں۔

علامہ۔ (مسکرا کر) مولانا "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

راوی۔ چونکہ اس زمانے میں علی برادران کانگریسی تھے۔ اس لئے علامہ ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے ۱؎

راوی۔ جسٹس شادی لال کی میاں سر محمد شفیع سے چشمک چل رہی تھی۔ چونکہ اس کو معلوم تھا اقبال بھی میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ ان کو اپنی طرف موڑنا چاہتا تھا۔ مرزا جلال الدین اقبال کے بڑے ذاتی دوست تھے اس نے اس سے بات کی۔

مرزا جلال الدین۔ کراچی میں شادی لال ملے تھے ان سے باتیں ہوئیں کہنے لگے مرزا صاحب میاں شفیع اقبال کو بہت سخت سست کہا کرتے ہیں اور ہر جگہ ان کے کردار پر حملے کرتے پھرتے ہیں۔ یہ بات اقبال کے مستقبل کیلئے مضر ہے اگر وہ میرے ساتھ مل کر کام کریں تو بہت اچھا ہو۔

علامہ۔ مرزا صاحب! شادی لال کا اپنا ذاتی مطلب ہے وہ میاں فیملی کا حریف ہے اور بعض مسلمان خاندانوں کو ساتھ ملا کر اس خاندان کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان لوگوں کے جھگڑے میں الجھیں ہم شادی لال کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

راوی۔ سر شادی لال اس بے رخی کو بھولے نہیں۔ جب ۱۹۲۵ء

۱؎ اقبال کی صحبت میں ص ۴۰۵

میں اقبال کی ججی کا سوال اٹھا تو اُنھوں نے چیف جسٹس کی حیثیت سے وہ مشہور طنزیہ فقرہ کہا۔

ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ قانون داں کی حیثیت سے نہیں۔[1]

نام و نمود سے گریز!

راوی۔ ۱۹۲۲ء میں علامہ انارکلی چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر ایک نہایت بوسیدہ سی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے وہ اس قابل نہ تھی کہ علامہ اس میں رہتے۔ بوسیدہ بھی تھی اور بدوضع بھی۔

عبدالمجید سالک ترکِ موالات کے سلسلے میں جیل کاٹ کے آئے تو علامہ سے ملنے گئے۔

سالک حضرت کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو بہت ہی بوسیدہ ہے۔

علامہ۔ جی ہاں۔ یہ تو صرف میری دعاؤں کے سہارے کھڑی ہے ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات نہیں۔

راوی۔ اس کوٹھی کے بارے میں ایک روز مرزا جلال الدین بیرسٹر نے علامہ سے کہا۔

مرزا۔ اب جب کہ آپ نے مکان بدل لیا ہے میکلوڈ روڈ کی یہ

[1] اقبال کی صحبت میں۔

کوٹھی بہرحال انارکلی کی رہائش سے زیادہ سکانیت رکھتی ہے اس کی آرائش کی طرف بھی توجہ دیجئے۔ کم ازکم اس کے مرونہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائننگ ہی میں تقسیم کر دیجئے۔

علامہ۔ میں کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں الجھنا نہیں چاہتا۔

مرزا۔ کبھی کبھی حکام کو اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ اکل و شرب کی دعوت ہے وہ اکثر بڑے بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے۔ اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں ان کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ رہتا ہے۔

علامہ۔ میں ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اوّل تو انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی میری دلچسپیوں کے دائرہ سے باہر ہے دوسرے اگر کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہوا تو اس دردِ سر کا فائدہ؟

توکل باللہ

راوی۔ شیخ اعجاز احمد ۱۹۲۲ء میں انکم ٹیکس افسر مقرر ہو کر ٹریننگ کیلئے پشاور بھیجے گئے وہاں ایک عیسائی افسر کے متعصبانہ رویے سے نالاں تھے انھوں نے علامہ سے مشورہ کیا۔

علامہ۔ ٹریننگ میں کیا تکلیف ہے؟

اعجاز احمد۔ عیسائی افسر کا رویہ بہت معاندانہ ہے۔ اس سے پریشان ہوں

علامہ۔ انسان کا رزق عمرو زید کے ہاتھ میں نہیں۔ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے اور ہر قسم کی فکروں سے نکال دینی چاہیئے۔ خدا کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لئے باعث آزار ہے۔

اعجاز احمد۔ اگر بات نہ بنی تو۔؟

علامہ۔ انسان کو اپنی صحت اور حالت کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیئے اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں

اعجاز احمد ان حالات میں آپ کیا کرتے ؟

علامہ۔ میرے تمام معاملات جان و مال اور روپیہ اللہ کے سپرد ہیں جب سے میں نے ایسا کیا ہے مجھے کوئی تردد نہیں ہوتا اس کی مرضی میری مرضی ہے۔

☆

سر کے خطاب کا شاخسانہ

راوی۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ کو سر کا خطاب ملا۔ چونکہ خطابات انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں ملا کرتے تھے کچھ اس وجہ سے اور خاص طور پر تحریک ترک موالات کے پس منظر میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اقبال اس سنہری زنجیر کو قبول کریں گے اس لئے اپنے اور بیگانوں کو حیرت ہوئی بلکہ افسوس بھی۔ شکوک و شبہات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ زمیندار اخبار میں طنزیہ اشعار بھی چھپے۔ دوست احباب

خاص طور پر متردّد ہوئے۔

میر غلام بھیک ڈاکٹر صاحب! سر ہونا مبارک ہو لیکن ساتھ ہی آپ کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ اسلامی دنیا آپ سے کیا توقعات رکھتی ہے۔

علامہ۔ جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساسات سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے خدائے ذوالجلال جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔

راوی۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو علامہ نے لکھا۔

" یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں! کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

٭

راوی۔ بعد کے انکشافات نے ثابت کر دیا کہ سر کا خطاب سرکار کی وفاداری کا صلہ نہیں تھا بلکہ اقبال کے علمی کارہائے نمایاں کے اعتراف کی علامت تھا۔

خطاب ملنے کی کہانی یوں ہے

پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال نے علامہ کو بلایا۔

سر شادی لال۔ حکومت پنجاب نے مجھ سے خطابات کیلئے سفارشات طلب کی ہیں اور میں آپ کیلئے "خان صاحب" کا خطاب تجویز کر رہا ہوں۔

علامہ۔ میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں اس لئے آپ سفارش کی زحمت نہ فرمایئے۔

سر شادی لال۔ اتنی جلد فیصلہ نہ کیجئے۔ ذرا کچھ دن سوچ لیجئے۔

علامہ۔ میں سوچ چکا ہوں۔ مجھے خطاب کی کوئی ضرورت نہیں۔

(دو تین دن بعد)

علی بخش۔ چیف جسٹس صاحب کا آدمی آیا ہے آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

علامہ۔ بلاؤ اُسے۔

پیغامبر۔ (اندر آتے ہوئے) آداب عرض

علامہ۔ آداب عرض۔ فرمایئے۔

پیغامبر۔ چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں زحمت کیجئے ذرا آکر مجھ سے مل لیجئے۔

علامہ۔ آپ انھیں میرا پیغام دیجئے کہ اگر خطاب کے بارے میں بات کرنی ہے تو وہ بیسود ہے۔ کیونکہ میں اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کر چکا ہوں۔ بہرحال اگر کوئی اور کام ہے تو حاضر ہو سکتا ہوں۔

راوی۔ اس زمانے میں سر ایڈورڈ میکلیگن پنجاب کے گورنر تھے ان سے علامہ کے عزیز دوست نواب ذوالفقار علی خان کے بڑے مراسم تھے ایک دن دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

ذوالفقار علی۔ مشہور بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو سر کا خطاب مل چکا ہے

تعجب کی بات ہے کہ اقبال اس قدر دانی سے محروم ہیں حالانکہ وہ بہت بڑے شاعر ہیں اور مسلمانوں کے محبوب رہ نما ہیں ۔

گورنر ۔ اچھا ہم انھیں خان بہادر کا خطاب دلا دیں گے ۔

ذوالفقار علی ۔ وہ خطاب تو ان کے شایانِ شان نہیں ہے ۔

گورنر پھر شمس العلماء کا خطاب کیسا رہے گا ؟

ذوالفقار علی ۔ یہ بھی مناسب نہیں ۔

راوی ۔ ان ہی دنوں برطانیہ کا ایک مشہور صحافی جو ادیب بھی تھا ۔ دنیائے اسلام کی سیاحت کے بعد افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوا ۔ اور گورنر پنجاب میکلیگن کا مہمان ہوا ۔ اس نے ایک تو اسرارِ خودی کا یہ انگریزی ترجمہ پڑھ رکھا تھا جو پروفیسر نکلسن نے کیا تھا ۔ دوسرے اسلامی ملکوں کے علمی اور ادبی حلقوں سے اقبال کے علمی اور شاعرانہ کمالات کا چرچا سن آیا تھا ۔ تیسرے اپنی ایک کتاب کے بارے میں علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا اس نے گورنر کو مشورہ دیا کہ اقبال کو چائے پر مدعو کیا جائے تاکہ ان سے ملاقات ہو سکے ۔ گورنر نے انھیں مدعو کر لیا ۔ اسی دن مرزا جلال الدین بیرسٹر جو ان کے بڑے بے تکلف اور گہرے دوست تھے ملنے آ گئے ۔

مرزا جلال الدین ڈاکٹر صاحب ! سنا ہے کہ گورنر میکلیگن نے آپ کو چائے پر بلایا ہے ۔

علامہ ۔ مرزا ۔ بات تو یہی ہے لیکن شاید میں نہ جا سکوں ۔

جلال الدین ۔ کیوں ۔ ؟

علامہ ۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں حکام سے ملنا پسند نہیں کرتا دوسرے ان دنوں

میرے پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف ہے چلنے پھرنے سے بچتا ہوں۔

جلال الدین: چلنے پھرنے کی آپ کو ضرورت نہیں، گورنر ہاؤس تک میں اپنی کار میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔ لیکن آپ جایئے ضرور۔ گورنر نے خود دوستانہ دعوت دی ہے اس کا رد کرنا مروّت سے بعید ہوگا۔

علامہ: کچھ دل نہیں مانتا۔

جلال الدین: دل مانے نہ مانے، جایئے ضرور، مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔ کل میں گاڑی لیکر آؤں گا۔

علامہ: تمہارا اصرار ہے تو یوں ہی سہی۔

☆

راوی: مرزا جلال الدین بیرسٹر علامہ کو گورنمنٹ ہاؤس چھوڑ آئے۔ گورنر نے علامہ کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ اخبار نویس سے ان کا تعارف کرایا۔ اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ علامہ اور اخبار نویس کے درمیان کافی دیر چائے کی پیالی پر علمی گفتگو ہوتی رہی۔ جب رخصت کا وقت قریب آیا تو گورنر کا پیغام ملا کہ جانے سے پہلے مجھ سے ملتے جایئے اقبال ان کے کمرے میں گئے۔

گورنر: اقبال: مجھے انتہائی افسوس ہے کہ حکومت نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تساہل روا رکھا ہے میں اس وقت خطابات کی سفارش کر رہا ہوں میری خواہش ہے کہ آپ کیلئے "سر" کے خطاب کی سفارش کی جائے۔

علامہ: میں معذرت چاہوں گا، میں خطابات اور اعزازات کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اور یوں بھی اسلام معاشرتی امتیازات کی حوصلہ افزائی

نہیں کرتا۔

گورنر۔ (خاموش لیکن چہرے سے تکدر کے آثار نمایاں ہیں غالباً یہ سوچ کر کہ اقبال ملکی فضا کے پیش نظر گریز کر رہے ہیں)

اقبال۔ اگر اس انکار سے حکومت کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو مجھے تامل نہیں۔

گورنر۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔

...... ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ شمس العلماء کیلئے اس سال پنجاب سے کسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے گا میں نے بعض مسلمان معززین سے اس سلسلے میں تجاویز طلب کی ہیں اگر آپ کے ذہن میں کوئی نام ہو تو بتادیں۔

علامہ۔ میں صرف اس شرط پر نام تجویز کروں گا کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے۔

گورنر۔ (کچھ تامل کے بعد) اچھا نام بتائیے۔

علامہ۔ مولوی سید میر حسن شاہ۔

گورنر۔ میں اس نام سے واقف نہیں۔ انھوں نے کون کون سی کتابیں لکھی ہیں؟

علامہ۔ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہے وہ میرے استادِ محترم ہیں۔

گورنر۔ ٹھیک ہے۔

علامہ۔ اب یہ عرض کروں کہ مولوی میر حسن درویش قسم کے بزرگ ہیں سرکارِ دربار میں حاضری ان کے بس کا روگ نہیں اس لئے اعلانِ خطاب کے بعد اُنھیں

لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔

راوی۔ چنانچہ یہی ہوا جب خطاب کا اعلان ہوا تو گورنر نے سندِ خطاب مولوی صاحب کے فرزند سیّد علی تقی شاہ کے سپرد کردی جو گورنمنٹ ہاؤس میں ڈاکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔

راوی۔ جب علامہ کو سر کا خطاب مل گیا تو لاہور کے شہریوں کی طرف سے انھیں مقبرۂ جہانگیر میں ایک شاندار عصرانہ دیا گیا جس میں گورنر بھی مدعو تھے اقبال نے اس موقعہ پر انگریزی میں تقریر کی۔

علامہ۔ میں ان دنوں جرمن شاعر گوئٹے کے دیوانِ مغرب کے جواب میں "پیامِ مشرق" لکھ رہا ہوں۔ چونکہ آپ میں سے بعض نے اشعار سنانے کی فرمائش بھی کی ہے اس لئے طلوعِ اسلام کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

آخر میں، میں سب کو بتا دوں کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اعلائے
کلمۃ الحق سے نہیں روک سکتی۔

راوی۔ یہ ہے علامہ کو سر کا خطاب ملنے کی کہانی جس کو علامہ کے قریبی
دوستوں اور نیازمندوں عبدالمجید سالک، فقیر وحید الدین اور مرزا
جلال الدین بیرسٹر کے بیانات سے ترتیب دیا گیا[1]

*

راوی۔ علامہ نے پیام مشرق کو امیر امان اللہ خان والیٔ افغانستان کے
نام معنون کیا تھا جو بعض لوگوں کو کھٹکتا تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے
دوران گفتگو پوچھا۔

چغتائی۔ آپ نے پیام مشرق کو امیر امان اللہ خان کے نام کیوں معنون کیا؟

علامہ۔ میں اس کتاب کو کسی آزاد مسلمان سلطان کے نام معنون کرنا
چاہتا تھا اور اس زمانے میں امیر امان اللہ سے زیادہ موزوں شخصیت
کس کی ہو سکتی تھی!

*

راوی۔ ایک روز مرزا جلال الدین حاضرِ خدمت تھے۔

مرزا۔ ڈاکٹر صاحب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انجمن حمایت اسلام
اور اسلامیہ کالج جیسے اداروں میں اہم عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے
بھی ان کی کارروائیوں سے آپ اتنی بے رخی کیوں برتتے ہیں؟

علامہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت سے امداد لینے کی وجہ سے دونوں کا

---

[1] سرگزشتِ اقبال صفحہ ١٦٢

دائرہ عمل محدود ہوچکا ہے ان اداروں کی ترقی کیلئے کسی نئے لائحہ عمل کا تجویز کرنا ناممکن ہے۔

*

راوی۔ ۱۹۲۷ء میں علامہ شملہ گئے تو سیسل ہوٹل کے قریب مشہور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو سے ملاقات ہوگئی۔ دوران گفتگو یہ بات بھی ہوئی۔

علامہ۔ آپ سے اتفاقیہ ملاقات سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

مسز سروجنی۔ میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی مسز جناح (بیگم قائداعظم محمد علی جناح) جو انگریزی ادب کی فاضل ہیں۔ آپ سے ملنے کی مشتاق ہیں۔

*

علیحدہ مسلم قومیت کا مسئلہ

راوی۔ ۲۸-۱۹۲۷ء سائمن کمیشن کی دھوم کا زمانہ تھا۔ کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے سوال پر مسلم زعماء بھی دو حصوں میں بٹ گئے تھے علامہ کا تعلق اس مکتبہ فکر سے تھا جو تعاون کے حق میں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اصل مسئلہ آزادی کا نہیں، ہندوؤں کی مسلمانوں پر بالادستی کا ہے وہ کہتے تھے کہ درحقیقت ہندو آزادی نہیں چاہتے۔ انگریزوں کے سائے میں ہندوستان کی حکومت چاہتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کا قومی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ لاہور ہی میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اس مسئلہ پر ان

اختلاف رکھتے تھے اور ان سے کھل کر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن علامہ کے ایک دوست حکیم جلال الدین، حکیم محمد حسن قرشی کے ساتھ وسط دسمبر ۱۹۲۷ء کی ایک شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم قرشی نے اس ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

حکیم جلال الدین۔ ڈاکٹر صاحب! یہ ہمارے دوست محمد حسن قرشی عجز طبیب ہیں یہ آپ سے سیاست حاضرہ پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ۔ فرمائیے کیا مسئلہ ہے؟

حکیم قرشی۔ اسلام اور غلامی متضاد چیزیں ہیں اسی لئے قرآن میں محکوم مسلمانوں کیلئے کوئی ضابطۂ حیات تجویز نہیں کیا گیا بلکہ غلامی کو تعزیر قرار دیا گیا۔ اس حالت میں کیا یہ مسلمانوں پر لازم نہیں کہ مسلمان جہادِ آزادی میں سب سے آگے ہوں۔

علامہ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہیئے مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ تحریک کے نتیجے میں مسلمان آزاد ہوسکیں گے؟ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندو کے غلام ہو جائیں گے

حکیم قرشی اس خطرے کے سدِباب کیلئے مسٹر محمد علی جناح نے چودہ نکات مرتب کئے ہیں۔ محمد علی جوہر کی کوششوں سے انھیں دہلی کانفرنس میں منظور بھی کرلیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ مدراس میں کانگریس بھی انھیں منظور کر لے گی۔

علامہ۔ ہندو اس وقت اپنے آپ کو مضبوط کرنے کیلئے سنگھٹن کر رہے ہیں اور اسی لئے وہ جگہ جگہ فسادات کو ہوا دے رہے ہیں تاکہ جو احساس کمتری

ہندوؤں میں پایا جاتا ہے اُس کو دور کیا جائے. ہندو ذہن کا جو مطالعہ
میں نے کیا ہے اس کے پیش نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی جناح
اور محمد علی جوہر لاکھ زور لگائیں ہندو کسی ایسے سمجھوتے پر ہرگز رضامند
نہ ہوں گے جس سے مسلمانوں کا قومی وجود مستحکم ہوتا ہو بلکہ میرا تو خیال یہ ہے
کہ اگر مسلم زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلا شرط مفاہمت
کی پیشکش کریں جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت
نکالنے کی کوشش کریں گے۔

حکیم قرشی. ہندوؤں کی ذہنیت اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو
مسلم اتحاد کے بغیر انگریز سے جنگ نہیں لڑی جا سکتی اور اس جنگ سے
ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریز کے کمزور ہو جانے کی صورت میں اسلامی
ممالک پر انگریز کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ آپ کے نظریے
کے مطابق برصغیر کے مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے تو ہو جائیں،
ہم تو پہلے ہی سے غلام ہیں۔ ہماری قربانی سے کم از کم دوسرے اسلامی
ممالک تو آزاد ہو سکیں گے۔

علامہ. حقیقت یہ ہے کہ ہندو نہیں چاہتا کہ وہ انگریز کو برصغیر سے نکال
کر اس سے قطع تعلق کر لے. اس کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ ہے کہ داخلی
آزادی حاصل کر کے مسلمانوں اور دیگر اقوام پر حکومت کرے. اس طرح
برطانیہ مطلق کمزور نہیں ہوگا بلکہ ہندوؤں کی اعانت سے زیادہ قوی ہو
جائے گا اگر کانگریس برصغیر کے لئے واقعی کامل آزادی کی طلبگار ہو تو مجھے
اس کا ساتھ دینے میں تامل نہ ہوگا۔

حکیم قرشی. آپ کی رائے میں حصول آزادی کیلئے کیا پروگرام ہونا چاہیئے؟

علامہ۔ میری رائے میں اس امر کیلئے جدوجہد کرنی چاہیئے کہ برصغیر کے ہرباشندے کو اسلحہ رکھنے کی اجازت ہو اور اگر کانگریس اس غرض کے لئے قانون کی خلاف ورزی کرے تو میں اس تحریک میں شامل ہوں گا۔

راوی۔ علامہ کی اس گفتگو سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ۱۹۲۷ء میں بھی علامہ یہی چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمان مستقل قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں اور اپنے قومی وجود کی ہر قیمت پر حفاظت کریں اور ہندو ذہنیت کے بارے میں جو نتیجے انھوں نے نکالے تھے بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ وہ بالکل صحیح تھے۔

☆

راوی۔ علامہ کے ایک بیدار مغز عقیدتمند تھے سید محمد سعید الدین جعفری جج کے عہدے پر فائز تھے اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے یا مکاتیب کے ذریعے اہم استفسارات کرتے رہے۔ سید صاحب کے نام علامہ کے دو ایک ایسے تاریخی خط جو ۱۹۲۳ء میں لکھے گئے تھے دستیاب ہوئے ہیں ان میں علامہ نے سید سعید جعفری کے بعض اعتراضات اور استفسارات کا جواب دیا ہے گویا مکتوبات نہیں مکالمات ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر ان کو ایک مکالمے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سید سعید الدین۔ نیشنلزم قوم پرستی کا ایک جدید نظریہ ہے اور قوموں کی ترقی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے اس سے آپ کو اس شدت سے اختلاف کیوں ہے؟

علامہ۔ میرے نزدیک اسلام نوع انسانی کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے

اور نسل و قومیت کے مصنوعی (مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید) امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے اس وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحت بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کیلئے یہ ایک بڑی لعنت ہے اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطہ خیال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔

سید سعید الدین۔ لیکن ہمیشہ سے تو آپ کا نقطہ نظر بھی یہ نہیں تھا۔

علامہ۔ ابتدا میں، میں بھی قومیت پر یقین رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی پیدا کی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر برائی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔

سعید الدین۔ تو کیا دینِ اسلام، ایک پولٹیکل یا قومی تحریک نہیں ہے؟

علامہ۔ ہرگز نہیں بلکہ اسلام ایک قدم ہے نوعِ انسانی کے اتحاد کی طرف یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت اور مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے میں جو کچھ اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمتِ بنی نوعِ انسانی ہے اور کچھ نہیں۔

میرے نزدیک عملی نقطہ خیال سے صرف اسلام ہی انسان دوستی کے نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے باقی ذرائع محض

فلسفہ ہیں۔ خوشنما ضرور ہیں مگر ناقابلِ عمل ۔

سعیدالدین۔ لیکن میرا اور میرے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ خالص اسلامی حقائق پیش نظر رکھنے اور ان کو نمایاں کرنے سے ہندوستان کی اقوام میں فرق پڑے گا۔

علامہ۔ یہاں تک تو آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کا طریق اختیار کرنا چاہیئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کیلئے سراپا شفقت ہے مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کیلئے بھی یہی ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصلی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریق یہی ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھ سکتا۔ جس کی بنا دیانت پر ہو اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔

غرض کہ میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور وفکر کا نتیجہ ہے اس وقت اقوامِ انسان کیلئے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتہً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوعِ انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔

مسلمانوں کیلئے تو سیاست سے پہلے اشاعتِ اسلام کا کام ضروری ہے تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔

سعیدالدین۔ آخر میں، ایک اور استفسار، زمانۂ حال میں اسلام کا مطالعہ کیسے

کیا جائے اور کس کے ذریعے سے کیا جائے ؟

علامہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانہ حال کی روشنی میں مطالعہ کئے جانے کا محتاج ہے پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور حکماء میں ابن رشدؒ، غزالیؒ اور رومیؒ کا، مفسرین میں معتزلی، نقطہ نظر سے زمخشری، اشعری نقطہ نظر سے رازی، اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی سے استفادہ کرنا چاہیئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی زبان میں اچھی دست گاہ پیدا کر لیں تو اسلام کی جدید تفسیر و توضیح میں بڑی مدد دے سکیں گے میں اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔[1]

٭

راوی۔ ۱۹۲۷ء میں عبدالرشید طارق پہلی بار علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اس کے بعد اکثر فیضیاب ہوتے رہے۔ بادہ شبانہ کے کے عنوان سے انھوں نے علامہ کی محفلوں کا حال لکھا ہے۔

عبدالرشید طارق اور ان کے بھائی جب پہلی بار اپنے دادا حاجی احمد بخش کے ساتھ علامہ کے یہاں پہنچے تو علامہ نے پوچھا۔

علامہ۔ حاجی صاحب! یہ کون ہیں؟

---

[1] اوراقِ گم گشتہ صفحہ ۲۰ - ۱۱۹

حاجی احمد بخش: میرے پوتے ہیں آپ کو دیکھنا چاہتے تھے یہ لوگ مدت سے مصر تھے کہ آپ سے نیاز حاصل کریں۔ ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں، اور آپ ہی کے اشعار گنگناتے رہتے ہیں۔

علامہ: (حقے کی نے کو منہ میں لیکر اور ہلکے ہلکے کش لگا کے مسکراتے ہوئے۔) حاجی صاحب! نوجوانوں کی آئندہ نسلیں میری مٹھی میں ہیں۔

❁

راوی: ۱۹۲۹ء میں افغانستان میں امیر امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور بچہ سقہ برسر اقتدار آگیا تھا جرنیل نادر خان پیرس میں افغان سفیر تھے۔ جب وہ اپنے ملک کو بچہ سقہ کے تسلّط سے بچانے کیلئے آئے تو وہ پشاور جاتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ علامہ ان سے اسٹیشن پر ملے اور کچھ گفتگو کرنے کے بعد انھیں ایک طرف لے گئے

علامہ: میں نے زندگی بھر میں دس ہزار روپے کی پونجی جمع کی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے چندے کے طور پر قبول فرمالیں۔

نادر خان: آپ کی پیشکش سر آنکھوں پر لیکن میں اسے قبول نہ کرسکونگا۔

علامہ: آپ ضرور قبول کیجئے یہ ایک حقیر نذر ہے ایک بڑے کام کے لئے۔

نادر خان: اگر آپ کو بہت اصرار ہے تو میں یہ وعدہ کردں گا کہ مجھے جب اشد ضرورت ہوگی تو میں یہ رقم منگوالوں گا۔ فی الحال اسے اپنے پاس رکھیئے۔

علامہ: بہت بہتر جو آپ کی مرضی۔ میرے پاس جو ہے حاضر ہے[1]۔

---

[1] صحیفہ اقبال ۳۳ء۔

راوی۔ علامہ جب ٹیپو سلطان شہید کی تربت کی زیارت سے واپس آئے تو میجر سعید محمد خان نے علامہ کے سامنے تجویز پیش کی۔

میجر سعید میں چاہتا ہوں کہ آپ کے نام سے ایک فوجی اسکول منسوب کیا جائے۔

علامہ ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس فوجی اسکول کا نام ٹیپو فوجی سکول رکھیں۔

ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔

جنوبی ہندوستان میں اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے۔ یہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں [1]

خواتین سے خطاب

راوی۔ جب جنوری ۱۹۲۹ء میں علامہ اپنے انگریزی خطبات کیلئے مدراس گئے تو انجمنِ خواتینِ اسلام مدراس نے آپ کو سپاسنامہ پیش کیا جس میں منجملہ اور باتوں کے اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ علامہ کی تحریروں نے خواتین کے دلوں

---

[1] اقبال نامہ ۲۴۶

میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا جواباً آپ نے فرمایا۔

علامہ۔ میں آپ کے ایڈریس کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اگر میری تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے تو ربِ کعبہ کی قسم میں اپنی مراد کو پہنچ گیا میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بڑی حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔

اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی۔ مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو۔ یا بہنوں کی محبت اس کے دل میں اپنا نشان نہ چھوڑتی ہو وہ خوش نصیب شوہر جن کو نیک بیویاں ملی ہیں خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقا میں کس حد تک اس کی مددگار و معاون ہے۔ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔

قرونِ اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ حضرت عائشہ پردہ میں بیٹھ کر لوگوں کو درس دیتی رہیں۔ خلفاءِ عباسیہ کے عہد میں ایک موقعہ پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ خلافتِ اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلام تمام معاملات میں اعتدال مدِنظر رکھتا ہے

انسانوں کی زندگی مدنی ہے یعنی انسان مل کر زندگی بسر کرتے ہیں

اس لئے انسانوں کو مختلف جماعتوں سے مختلف فرائض متعلق ہیں زندگی میں ایک سلسلۂ فرائض انسانی مردوں کا ہے اور ایک عورتوں کا یہ فرائض بھی تو خدائی احکام کی رو سے ہیں اور بعض خود وضع کردہ ہیں بعض فطری طور پر ہیں عورت کے بہ حیثیتِ عورت اور مرد کے بہ حیثیتِ مرد، بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف تمدنی ضروریات پر مبنی ہے مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ مدنی زندگی کیلئے جو احکام ہوں گے وہ فرائض کو مدِنظر رکھ کر ہوں گے۔

ٹ

راوی۔ علامہ کے مدراس کے قیام کے دوران مدراس کی مسلم خواتین نے علامہ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا۔ تمام مستورات پردے میں تھیں۔ سپاسنامہ کے بعد کسی خاتون نے پوچھا۔

خاتون۔ کچھ پردہ کے بارے میں فرمایئے۔

علامہ غضِ البصر، یعنی چشم پوشی سے کام لینا چاہیئے اور یہ امر مرد اور عورت دونوں کیلئے ہے

خواتین۔ آپ اپنی کوئی نظم سنایئے۔

علامہ۔ مجھے تو اپنا کلام اچھی طرح یاد بھی نہیں ہے اور نہ ہی میرے ہمراہ کوئی کتاب ہے۔

خواتین۔ بانگِ درا یہاں موجود ہے (اندر سے کئی نسخے باہر پہنچائے گئے۔

علامہ۔ تو سنئے (تحت اللفظ) فاطمہ بنت عبداللہ۔

فاطمہؓ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

☆

راوی۔ علامہ کے مشہور انگریزی خطبات جو اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ نو کے نام سے شائع ہوئے وہ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں جنوبی ہند کے شہر مدراس میں دیئے گئے تھے۔ ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو مدراس کے اخبار سوراجیہ کے ایک نامہ نگار نے آپ سے انٹرویو لیا۔ اس کو علامہ کے ہم عصر اور دوست منشی محمد دین نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا۔ اس کے حوالے سے یہ انٹرویو پیش کیا جاتا ہے۔

نامہ نگار۔ میں تعلیم مذہب اور سیاست کے موضوع پر آپ کے خیالات اخبار سوراجیہ کیلئے نوٹ کرنا چاہتا ہوں۔

علامہ۔ فرمائیے۔

نامہ نگار۔ پہلے تو آپ مذہب اور سیاست کے تعلق پر کچھ روشنی ڈالئے۔

علامہ۔ میں مذہب کو سوراج (آزادی) پر مقدم خیال کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسے سوراج سے واسطہ نہ ہوگا جو مذہب سے بے نیاز ہو۔

نامہ نگار۔ اور تعلیم سکولر ہو یا مذہبی

علامہ۔ میں اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ

ہماری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہونی چاہیئے۔ یوروپ میں تعلیم کا خالصتہً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک بھی ان تلخ تجربات سے دوچار ہو۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ باشندگانِ ایشیا یوروپ کے خالص مادی رویے کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے مسئلہ یہ درپیش ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یک جا کیا جائے۔

نامہ نگار: ترکی کے حال اور مستقبل کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

علامہ: روحانی اور مادی امور کو یکجا کرنے کے مسئلہ سے ایشیا میں سب سے پہلے ترکوں کو واسطہ پڑا تھا۔ اگرچہ وہ روحانیت اور مادیت کے مطلوبہ نتائج کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے مگر انھوں نے اس ضمن میں پوری کوشش کی۔

میرا پختہ عقیدہ ہے کہ باشندگانِ ہند اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے یقیناً اہل ثابت ہوں گے کیوں کہ ان کی مذہبی روایات موجود ہیں۔ روحانیت اور مادیات کو یک جا کرنے میں ترکوں کی ناکامی کی زبردست وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یوروپ کی نقالی شروع کر دی تھی اور اسلامی روایات کو ترک کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ بھی عام طور پر مذہب کے دلدادہ ہیں اس لحاظ سے ترکی کے مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس زمانے میں وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زمانہ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے۔

نامہ نگار: نئی نسل مذہب کو سیاست سے علیحدہ دیکھنا چاہتی ہے۔

علامہ۔ ہمارے نوجوانوں کی یہ باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہیئے۔ یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا کچھ نہیں [۱]

☆

راوی۔ علامہ ۱۹۲۹ء میں اپنے انگریزی لیکچرز کیلئے مدراس تشریف لے گئے تھے وہاں ان کا استقبال کرنے والوں میں حجاب امتیاز علی بھی تھیں جو اس وقت مدراس کے سینٹ تھامس کانونٹ اسکول میں پڑھتی تھیں اور حجاب اسمٰعیل نام تھا۔ حجاب امتیاز علی نے علامہ سے اس ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے جو نیرنگ خیال کے اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے۔

(مدراس کے قریب بس برج اسٹیشن پر سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ)

مسٹر اسمٰعیل۔ ڈاکٹر صاحب یہ میری بچی حجاب ہے آپ کے قومی ترانے اس کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ اس کو آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔

علامہ۔ (حجاب کے انگریزی لباس کو قدرے حیرت سے دیکھتے ہوئے) آؤ بیٹھو

حجاب۔ (جھجکتے ہوئے بیٹھتی ہیں) شکریہ

---

[۱] صحیفہ اقبال جلد نمبر ۱

علامہ۔ (سگریٹ کا ڈبہ کھول کر حجاب کو سگریٹ پیش کرتے ہیں)

ایک مسلم لیگی کارکن } (مسکرا کر) سگریٹ ؟ ابھی تو یہ سینٹ تھامس کانونٹ میں پڑھتی ہیں۔

علامہ۔ کانونٹ میں عیسائیت کا آپ نے اب تک کتنا اثر قبول کیا ہے ؟

حجاب۔ بہت تھوڑا سا۔

علامہ (ہنس پڑتے ہیں) اچھا

حجاب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔

علامہ۔ پوچھیے۔

حجاب آپ اتنے دلنشیں ترانے مثلاً

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

کیسے لکھ لیتے ہیں ؟

علامہ۔ اب میں مان گیا کہ عیسائیوں کے کانونٹ کا آپ نے ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا جبھی تو آپ کا "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" پر ایمان ہے۔

آپ کے عقائد، آپ کے طرز ادا اور آپ کی باتوں کو سن کر میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں کہ آپ کا نام شیریں ہونا چاہیے۔

(سید محمد اسماعیل کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

کیوں سید صاحب آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہے ؟

اسی دن مدراس کے سب سے بڑے ہوٹل بساٹو ہوٹل میں علامہ کے اعزاز میں استقبالیہ لنچ پر علامہ نے حجاب کو اصرار سے اپنے پاس جگہ دی۔ جب بیرے نے حجاب اور علامہ کے سامنے رکھے ہوئے گلاسوں میں مختلف قسم کی شراب ڈالنی شروع کی تو

حجاب۔ (بیرے سے) میرے لئے لیمونیڈ لے آؤ۔

علامہ۔ آپ صرف لیمونیڈ پیئیں گی ؟

حجاب۔ ہاں میں شراب نہیں پیتی، آپ پی لیتے ہیں۔ ؟

علامہ۔ (ہنس کر) بالکل نہیں، آپ کو شاید معلوم نہیں میں نے اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں بھی شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا۔

(حجاب امتیاز علی لکھتی ہیں کہ یہ فقرہ سن کر آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے انھوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں)

راوی۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں علامہ مدراس کے لیکچر خطبات کے بعد بنگلور بھی گئے اور سلطان ٹیپو شہید سے متعلق یادگاریں دیکھیں دریا دولت کی ایک دیوار پر سلطانی افواج کے سپہ سالار سید غفار کی تصویر دیکھ رہے تھے کہ کسی نے بتایا کہ "الکلام" کے مدیر سید غوث محی الدین جو پاس کھڑے ہوئے تھے ان ہی کے پڑپوتے ہیں

علامہ۔ (فرطِ عقیدت سے سید غوث کو گلے لگاتے ہوئے) آپ اس نامور شہید کی یادگار ہیں ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اب آپ کے ہاتھ میں قلم ہے آپ قلم سے وہی کام لیجئے۔

راوی۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں جب علامہ بنگلور گئے تو سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر تخلیہ میں دو ڈھائی گھنٹے مراقبہ کرتے رہے۔ حکم تھا کہ جب تک میں باہر نہ آؤں مجھے بلایا نہ جائے۔ جب فاتحہ اور مراقبے سے فارغ ہوکر باہر آئے اور سماع کی محفل ختم ہوچکی تو میسور کے مشہور قومی کارکن محمد ابا سیٹھ نے پوچھا۔

محمد ابا۔ آپ روضہ سلطان شہید میں اتنی دیر راز و نیاز میں مصروف رہے آپ کو وہاں سے کیا فیض حاصل ہوا؟

علامہ۔ میرا ایک لمحہ بھی وہاں بیکار نہیں گزرا۔ ایک پیغام تو یہ ملا ہے

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست!
ہمچو مرداں جان سپردن زندگیست!

(زندگی دنیا میں مردوں کی طرح جینے کا نام ہے ایسا نہ ہوسکے تو مردانہ وار جان قربان کر دینا حیاتِ جاودانی ہے)

راوی۔ علامہ ٹیپو سلطان شہید سے کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جاوید نامہ میں بھی ٹیپو کا تذکرہ موجود ہے فردوسِ بریں کے کاخِ سلاطین میں ٹیپو کی روح سے ملاقات ہوتی ہے ٹیپو کے دیار کے دریا کاویری کو زندہ رود کے نام سے یاد کیا ہے اور اپنے لئے بھی یہی لقب اختیار کیا ہے۔

راوی۔ بنگلور کے قیام کے دنوں میں ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو علامہ کو وہاں کی مسلم لائبریری اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا اس کے جواب میں علامہ نے فرمایا۔

علامہ۔ اگر آپ اردو سے نابلد رہے تو مذہبی اور دینی باتوں سے بالکل محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ترجمے کے ذریعہ کافی مذہبی لٹریچر اردو میں محفوظ ہو چکا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبان ہی کے ذریعے بولنے والے کی فراست کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی اقوام کو داخل ہونا پڑے گا۔ اور نئی دنیا کے طرزِ عمل کو اختیار کرنا پڑے گا جو ان کی زندگی کو آسائش سے بدل دے گا۔ جو قوم نئی دنیا کا ساتھ دینے سے گریز کرتی ہے وہ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق ہی حاصل ہے۔

مسلمانوں کے پاس کلام پاک ایک ایسا قانون موجود ہے جس پر عمل کیا گیا تو وہ نہایت آسانی سے ترقی کر سکتے ہیں قرآن پاک ہمیں میانہ روی سکھاتا ہے یہی مسلمانوں کا اصول ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی آواز کا بہت اثر ہے لیکن انھیں بتائیے کہ صرف آواز ہی سے نہیں اپنے چلن سے بھی دوسروں کو سبق دیں کہ دنیا میں عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

راوی۔ عبدالرشید طارق اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔

"ایک روز میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، بدرالدین بدر، پنجابی کے مشہور شاعر بابو کرم اور سراج الدین نظامی علامہ کے یہاں بیٹھے تھے۔ چونکہ نئے انڈیا ایکٹ کی آمد تھی اس لئے کانگریس اور مسلم لیگ کا ذکر چھڑ گیا اور یہ گفتگو ہوئی۔

یکے از حاضرین } پنڈت جواہر لال نہرو تو مخلص ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی کانگریس کے شانہ بشانہ جہادِ حریت میں شریک ہوں اس سلسلے میں

آپ کی رائے کیا ہے ؟

علامہ۔ ہاں ! جواہر لال مخلص ہیں مگر ساری کانگریس مخلص نہیں۔ وہ خالص ہندوؤں کی جماعت ہے اس لئے ہر حال میں انہی کے حقوق اور مفاد کو مدِنظر رکھتی ہے اگر مسلمان اِکے دُکے ہو کر کانگریس میں شامل ہوں۔ تو ملت اور اس کے مفاد سے غداری کریں گے۔ اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کریں گے۔ یہ بات نہیں ہونی چاہیئے۔

مسلمانوں کو اپنی سیاسی شخصیت کو کسی صورت میں بھی کھونا نہ چاہیئے اور انھیں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جب تک کانگریس بہ حیثیت ایک قوم کے ان کے سیاسی وجود کو تسلیم نہ کرے اس میں ہرگز شامل نہ ہوں اور علیحدہ رہ کر اپنے حقوقِ آزادی کیلئے لڑیں۔ میرا ایمان ہے کہ مسلمان کے دل میں آزادی کی تڑپ ہندو سے زیادہ ہے۔

صوفی تبسم۔ ڈاکٹر صاحب یہ ہیں بابو کرم پنجابی میں بہت اچھا کہتے ہیں۔

بابو کرم۔ جی ہاں ! کچھ تک بندی کر لیتا ہوں۔

صوفی تبسم۔ بابو صاحب کچھ سنائیے۔

علامہ۔ ہاں سناؤ جی۔

بابو کرم (بابو کرم پنجابی کی چند نظمیں سناتے ہیں۔)

علامہ۔ خوب بابو صاحب آپ کی پنجابی بڑی ستھری اور ٹھیٹھ ہے آپ اگر مولانا روم کی مثنوی کی کچھ حکایات خالص پنجابی میں منتقل کرنے کی کوشش کریں تو ضرور کامیاب ہوں گے۔ صوفی صاحب آپ کو موزوں حکایات بتا سکتے ہیں۔ یہ فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں کی خدمت ہوگی۔

بابو کرم۔ بہت اچھا جناب ضرور کوشش کروں گا۔

علامہ۔ پنجابی نظم میں تصوّف کے بڑے بڑے ذخیرے پنہاں ہیں فارسی کے بعد یہ دوسری زبان ہے جو تصوّف سے مملو ہے بابا فرید کا ایک شعر ہے۔

اُٹھ وے فریدا جاگ سویرے تے جھاڑو دے مسیت
توں سُتا تے رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

٭

راوی جنوری ۱۹۳۰ میں عبدالرشید طارق، صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم۔ اور سیّد الطاف حسین جاوید منزل میں بیٹھے تھے روسی عالم موسیٰ جار اللہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے دین، سیاست، وطنیت پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر مولانا جار اللہ نے جاوید نامہ نکال کر کہا۔

موسیٰ جار اللہ۔ اس شعر کی وضاحت فرمائیے

ایں ز حج بیگانہ آں از جہاد

علامہ۔ بہاؤ اللہ ایرانی، اور مرزا غلام احمد قادیانی

راوی۔ اس کے بعد علامہ نے ان دونوں کے ایجاد کئے ہوئے مذاہب ان کے اسباب وعلل اور اثرات ونتائج پوری تفصیل سے سمجھائے۔

٭

راوی۔ ۱۹۳۱ء کے وسط میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کی کتاب "لائف ان دی اسٹارز" (ستاروں میں زندگی) شائع ہوئی۔ علامہ نے اس کتاب کو بنیاد بنا کر لاہور کے ایک انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ

کی ۳۰ جولائی کی اشاعت میں ایک طویل مکتوب لکھا اس میں انھوں نے برعظیم کی سیاست کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر برطانیہ نے اگلی گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ اختلاف سے کوئی ناجائز فائدہ اُٹھایا تو یہ برطانیہ اور ہندوستان دونوں کیلئے برباد کن ثابت ہوگا۔ اگر حکومت نے سیاسی اقتدار ہندو کے حوالے کر دیا تو مسلمان مجبور ہو جائیں گے کہ وہی حربے سوراجی یا اینگلو سوراجی حکومت کے خلاف استعمال میں لائیں جو گاندھی نے حکومت برطانیہ کے خلاف برتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے یہ بتانے کیلئے کہ مسلمان قوم کو اپنی جیب میں نہیں سمجھنا چاہیئے یہ لکھا۔

اس سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورا اسلم ایشیا روس سے ہم آغوش ہونے پر مجبور ہو جائے اور اس سے مشرق میں برطانوی سیادت پر زد پڑیگی۔ میں نہیں سمجھتا کہ روسی طبعًا غیر مذہبی لوگ ہیں بلکہ اس کے برعکس میرے خیال میں ان میں مضبوط مذہبی رجحانات موجود ہیں اور روسی ذہن کی منفی کیفیت غیر معینہ عرصے تک کیلئے جاری نہیں رہنے گی۔

کیونکہ کوئی معاشری نظام لادینی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات پرسکون ہوئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کا موقعہ ملا، وہ ایک نظام کیلئے ایک مثبت بنیاد تلاش کر لیں گے۔

اگر بالشوزم میں خدا کا تصور شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے قریب قریب مماثل ہو جاتا ہے اس لئے مجھے اس بات پر حیرت نہیں ہوگی کہ آگے چل کر اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر چھا جائے نتیجے کا انحصار میرے نزدیک کافی حد تک اس پوزیشن پر ہوگا جو مسلمانوں کو نئے آئین میں ملے گی۔ اس بیان کی بنا پر بمبئی کے نیشنلسٹ انگریزی روزنامے بمبئے کرانیکل

کے نامہ نگار نے علامہ سے انٹرویو لیا۔

نامہ نگار۔ کیا آپ برطانوی سامراج کو خدا پرست سمجھتے ہیں؟

علامہ۔ جو ممالک استحصال میں مصروف ہیں وہ خدا پرستی کی نفی کرتے ہیں۔

نامہ نگار۔ کیا آپ کا خیال اب بھی یہی ہے کہ اگر بالشوزم میں خدا کا تصور شامل کیا جائے تو وہ اسلام بن جاتا ہے۔؟

علامہ اسلام ایک اشتراکی (سوشلسٹک) انداز کا دین ہے۔ قرآن مجید مطلق سوشلزم اور نجی املاک کے تصورات کے بین بین تعلیم دیتا ہے
ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ جدید ضمیر سامراج اور بالشوزم میں بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی سلطنتوں کے دن بیت چکے ہیں اور مطلق سوشلزم کے معنوں میں سوشلزم میں بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔
یہ ممکن ہے کہ معاشی نقطہ نگاہ میں بنیادی اختلاف کی وجہ سے روس اور برطانیہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ صحیح الخیال لوگوں کی ہمدردیاں انصاف کیطرف ہونگی۔

نامہ نگار۔ زمین کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

علامہ۔ الارض للّٰہ قرآنی تعلیم کے مطابق زمین اللہ کی ہے۔

نامہ نگار۔ پین اسلام ازم کے بارے میں آپ کا تصور کیا ہے؟

علامہ۔ پین اسلام ازم کی اصطلاح سب سے پہلے ایک فرانسیسی اخبار نویس نے وضع کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اسے ایک خطرہ بنا کر اسلامی ملکوں کے خلاف یورپین جارحیت کیلئے وجہ جواز قرار دیا جائے اس کے بعد پین اسلام ازم سے مراد ایک سازش تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ قرار دیا گیا اور مقصد یہ بنایا گیا کہ یورپی قوموں کے خلاف اسلامی ملکوں

کی ایک یونین بنائی جائیگی اس سازش کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ اور
پروفیسر براؤن جیسے نامی گرامی مستشرق نے ثابت کردیا تھا کہ ان معنوں
میں پین اسلام ازم کا تصور نہ قسطنطنیہ میں موجود تھا نہ کہیں اور۔
بہرحال یہ تصور سید جمال الدین افغانی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے
میں نہیں جانتا کہ انھوں نے یہ اصطلاح استعمال کی تھی یا نہیں لیکن یہ
یہ درست ہے کہ انھوں نے یورپی جارحیت کے خلاف افغانستان ایران
اور ترکیہ کو متحد ہونے کی تلقین کی تھی لیکن یہ ایک خالص دفاعی تجویز ہی
تھی۔ اور میرے نزدیک جمال الدین افغانی کا موقف بالکل صحیح تھا۔
اگر پین اسلام ازم سے ایک ایسا عالمی معاشری تجربہ مراد لیا جائے
جس میں نسل رنگ، اور ذات پات کے تصورات نابود ہوں تو یہ حقیقت
میں اسلام ہی کا دوسرا نام ہے ان معنوں میں پین اسلام ازم صرف اتحادِ
اسلامی ہی نہیں اتحادِ انسانی بھی ہے اور ہر مسلمان اس پر یقین رکھتا ہے
بلکہ اس میں پین کا لفظ بھی سراسر فالتو ہے۔

نامہ نگار — عرب ملکوں کی فیڈریشن کی تجویز کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

علامہ۔ — وحدتِ عربیہ کی تجویز اچھی ہے لیکن اس کے راستے میں بہت
بڑی مشکلات حائل ہیں۔ عربی زبان کا مستقبل روشن ہے اور یہ عرب
قوموں میں اسلام کے بعد سب سے بڑے رشتے کی حیثیت رکھتی ہے۔

*

راوی۔ — ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب علامہ گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے
جا رہے تھے تو بمبئی میں ان کی ملاقات عطیہ بیگم سے بھی ہوئی۔ انھوں نے

۱۰ ستمبر کو ایوان رفعت میں علامہ کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں بمبئی کے بعض سربرآوردہ اصحاب بھی مدعو تھے۔ دعوت کے دوران بعض حاضرین نے اصرار کیا۔

حاضرین: ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیں کوئی پیغام دیجئے۔ ہم آپ کے خیالات سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔

علامہ: میں نے جو کچھ کہنا تھا ابھی انگریزی میں کہہ چکا ہوں۔

حاضرین: کوئی شعر سنا دیجئے۔

علامہ: اشعار میں اس طرح نہیں سنایا کرتا۔

عطیہ بیگم: جب ان لوگوں کا اصرار ہے تو ایک آدھ شعر سنا ہی دیجئے۔

علامہ: فارسی کا ایک شعر ہے

چناں بزی کہ اگر مرگ تست، مرگِ دوام
خدا ز کردہ، خود شرمسار تر گردد!

حاضرین: ڈاکٹر صاحب! ہم تو فارسی نہیں سمجھتے۔ براہِ کرم اس شعر کا انگریزی ترجمہ لکھوا دیجئے۔

علامہ: لکھئے۔

Live so beautifully that if death is the end of all, God himself may be put to shame for having ended thy career.

راوی: اس کے بعد ایوانِ رفعت کے ہال میں رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی۔ ایک دبلی پتلی پکے رنگ کی لڑکی نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا جس میں علامہ نے کسی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بعد گانا

ہوا۔ گانے کے دوران علامہ نے کاغذ کے ایک پرزے پر فارسی کے یہ تین شعر لکھ کر عطیہ بیگم کو پیش کئے۔

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ سحاب اندر

برکشت و خیابان تیج، بر کوہ و بیابان بیج
برقے کہ بر خود پیچد، میرد بہ سحاب اندر

ایں صورتِ دلاویزے از زخمہ مطرب نیست
مہجور جہاں حورے، نالہ بہ رباب اندر

گانا جاری تھا کچھ دیر بعد علامہ نے ایک اور کاغذ پر یہ شعر لکھا اور عطیہ بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

پرائیویٹ:-

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کچھ!!
کہیئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

ان دونوں پرزوں پر علامہ کے دستخط ثبت ہیں اور تاریخ ۱۰۔ستمبر ۱۹۳۱ درج ہے۔ اس تقریب کے عینی شاہد ضیاالدین برنی نے اس واقعہ کا تذکرہ ماہِ نو اقبال نمبر ۱۹۷۷ء میں کیا ہے۔
عطیہ بیگم نے اپنی کتاب "اقبال" میں اس ضمن میں علامہ کے لکھے ہوئے ایک اور شعر کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بہ طوافِ کعبہ رفتم، بہ حرم راہم نہ دادند
کہ بیرونِ خانہ چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

اور

ان اشعار کے عکسی فوٹو دیئے ہیں

ؔ

راوی۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں جب علامہ دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ تو آپ کو لندن کے مشہور والڈروف ہوٹل میں استقبالیہ دیا گیا جس میں ہندوستان اور انگلستان کی اہم شخصیتیں مدعو تھیں۔ علامہ کے استاد اور اسرار خودی کے مترجم پروفیسر نکلسن بھی موجود تھے۔

یکے از حاضرین } آپ کے فلسفہ خودی کا تاریخی پس منظر کیا ہے ؟

علامہ۔ جب سے دیارِ مغرب میں اقتصادی انقلاب آیا ہے۔ کارخانہ داری کے نظام نے فرد کو انفرادی حیثیت سے بہت حقیر اور بے مایہ بنا دیا ہے اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ گویا ایک پرکاہ ہے جس کو سوسائٹی کا بے پناہ سیلاب بہا کے چلا جا رہا ہے۔ ان حالات پر غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دور میں انسان کو ایک ایسے جام کی ضرورت ہے جو اس کی افسردگی اور اس کے احساس کمتری کو دور کر کے اس کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دے جس سے اس کے قدم یقین اور خود اعتمادی کی چٹان پر محکم ہو جائیں اور وہ اس راز سے آگاہ ہو جائے کہ اس کو وہ کچھ عطا ہوا ہے جو شمس و قمر کو بھی نہیں ملا۔ یعنی شعور اور شخصیت۔

اگرچہ وہ کائنات کے مقابلے میں ایک ذرہ ہے مگر اس ذرے کے اندر ایک علیحدہ دنیا موجود ہے۔ ذی روح اور ذی شعور ہونے کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا کو اپنے فکر اور عمل سے آباد کرے۔

یکے از حاضرین۔ آپ نے فارسی کو ذریعۂ اظہار کیوں بنایا؟

علامہ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی آواز ہندوستان سے باہر خصوصاً ایران تک پہنچانا چاہتا تھا مگر یہ خیال درست نہیں ہے اگرچہ میرا پیغام یعنی پیغام عمل تمام دنیا کیلئے ہے اور اہل ایران میرے دائرہ سامعین سے خارج نہیں ہیں مگر میرے کلام کے اول مخاطب ہندوستان کے خواص تھے کیونکہ میں اپنا پیغام اول مرحلے میں صرف خواص تک محدود رکھنا چاہتا تھا

سامعین۔ محدود کیوں؟

علامہ۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ پہلے خواص کا طبقہ میرے پیغام کو سنے اور اپنی ذہنی استعداد کی بنا پر اسے صحیح طور پر سمجھے اور اس کو اچھی طرح اخذ کرنے کے بعد عوام تک پہنچائے۔

دنیا کی تاریخ میں اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ دقیق خیالات اور باریک نکات جب عوام پر بغیر کسی واسطے کے ظاہر کئے گئے تو کسی نے ان کو سمجھا اور کسی نے نہ سمجھا نتیجہ یہ ہوا کہ متکلم کی بات اور اس کا مفہوم و مطالب کچھ کا کچھ ہو گیا۔

مجھے اس بات سے مسرت ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے میں اپنے ہم عصروں کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا۔ اور میرے مخاطبین نے میرے کلام کی روح تک پہنچنے میں ایسی ٹھوکر نہیں کھائی جس سے

گوہرِ مقصود گم ہو جائے۔

☆

راوی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن کے دوران قیام میں انڈیا سوسائٹی کی دعوت پر علامہ نے ایک خطبہ دیا۔ سر فرانسس ینگ نے صدارت کی۔

سر فرانسس۔ سرزمینِ مشرق کا نہایت بلند پایہ شاعر و فلاسفر آج اپنے کلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریگا۔

علامہ۔ بیشک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے البتہ فلسفے کے ایک مسئلہ یعنی حیات بعد الممات کے ساتھ مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں انسان کے شاندار درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظامِ کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔

ازاں مرگے کہ می آید، چہ باک است
خودی چوں پختہ شد، از مرگ پاک است

آرنلڈ نے شاعری کی تعریف یہ کی ہے یہ زندگی کا انتقاد ہے۔ میں اس کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں بشرطیکہ محض لائف نہیں بلکہ ڈوائن لائف کا انتقاد کہا جائے[1]

☆

راوی۔ دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر علامہ چندروز کیلئے

---

[1] اقبال کی صحبت میں ص ۲۵۲

مصر و فلسطین بھی گئے تھے۔ قاہرہ کے قیام کے دوران مصر کی اہم علمی اور مذہبی شخصیتوں نے علامہ سے ملاقات کی۔ ایک روز مصر کے ایک بزرگ سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دو بیٹوں کے ساتھ ملنے تشریف لائے۔

علامہ۔ آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کی زیارت کیلئے آپ کے پاس چل کر آتا۔

سید صاحب۔ خواجۂ دوجہاں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا اسکی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔

(قاضی ابوالعزائم کے جانے کے بعد مولانا مہر سے مخاطب ہو کر روتے ہوئے)

ایسا زمانہ بھی آگیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہگار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد کے اتباع میں بغرضِ خوشنودیٔ آں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ملنے آتے ہیں۔

☆

راوی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے فوراً بعد کا واقعہ ہے حکومتِ ہند کسی ایسے ممتاز آدمی کی تلاش میں تھی جسے جنوبی افریقہ میں گورنر جنرلِ ہند کا نمائندہ بنا کر بھیجا جا سکے۔ اور جس کی بیوی پردہ نہ کرتی ہو تاکہ مروجہ رسوم کے مطابق میزبان کے فرائض انجام دے سکے۔ کسی مصلحت سے سر میاں فضل حسین اقبال کو وہاں بھجوانے کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ جب علامہ گول میز کانفرنس سے لوٹے اور میاں فضل حسین دہلی سے لاہور پہنچے تو ایک شام علامہ سالک اور مہر کے ساتھ ان سے ملنے گئے پہلے تو سیاسی چوٹیں ہوتی رہیں

پھر یہ گفتگو ہوئی ۔

میاں فضل حسین — کیوں بھئی اقبال ! تمہاری بیوی پردہ کرتی ہے ؟

علامہ۔ — ہاں کرتی ہے جس طرح تمہاری بیوی کرتی ہے ۔

سالک ۔ — (میاں صاحب سے) آپ یہ سوال اس لئے کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو جنوبی افریقہ بھیجنا چاہتے ہیں ۔

میاں فضل حسین۔ — آپ کی تیز فہمی کی داد دینی پڑتی ہے ۔ میرے ذہن میں یہی بات تھی ۔

علامہ۔ — (ہنس کر) میں اب تک تین بیویاں کر چکا ہوں جو پردہ کرتی ہیں آپ کے خیال میں آپ ایک چوتھی بھی کر لی جائے جو پردہ نہ کرتی ہو ۔ گویا تین بیویاں تو پرائیویٹ ہیں اور اب ایک پبلک بیوی ہو جائے ۔

(زوردار قہقہہ)

میری تجویز مانو تو بیگم شاہ نواز کو ایجنٹ بنوا دو کیونکہ ان کی سیاسی خدمات قابلِ قدر ہیں اور میاں شاہ نواز کو ان کے ساتھ بطور رفیقِ حیات بھیج دو۔[1]

☆

راوی ۔ — تیسری گول میز کانفرنس میں جب علامہ سید امجد علی کے ساتھ لندن جا رہے تھے تو نوبل پرائز پانیوالے ہندوستان کے مشہور ماہر طبیعیات سر سی وی رامن بھی ہم سفر تھے انہوں نے دوران گفتگو امجد علی سے سر رابندر ناتھ ٹیگور کے متعلق کہا

" وہ بیٹھا مشرق میں ہے مگر اس کی شہرت مغرب میں پہنچ چکی ہے۔"

---

[1] اقبال کی صحبت میں ۱۲۲

سید امجد علی بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے علامہ اقبال سے کہا

٭

امجد علی۔ سر سی وی رائن کہتے ہیں ٹیگور بیٹھا مشرق میں ہے مگر اس کی شہرت مغرب میں پہنچ چکی ہے اگر آپ بھی گوشہ نشینی ترک کر کے دوسرے ملکوں میں ہو آئیں تو آپ کو بھی عالمگیر شہرت ملے۔

علامہ ٹیگور سکون کی تعلیم دیتا ہے اور خود فعال ہے، اقبال عمل کی تعلیم دیتا ہے اور خود سکون پسند ہے۔

راوی۔ ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے جاتے ہوئے علامہ پیرس بھی ٹھہرے۔ نپولین کے مقبرہ پر گئے۔ برگساں سے تو نہ مل سکے کہ وہ پیرس میں موجود نہ تھے لیکن مشہور ریسرچ اسکالر میسی نون سے ملاقات ہوگئی جس نے مسلمانوں کے زمانہ اسپین پر تحقیق کر کے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اور ابن عربی کے نظریات پر ایک اہم کتاب لکھی تھی۔

علامہ۔ مغرب کے مؤرخین کو اسلام سے جو تعصب وعناد ہے وہ وقت گزرنے کیساتھ کم ہو رہا ہے۔ اور اسلام کی صداقت وحقیقت ان پر آشکار اور واضح ہوتی جا رہی ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عیسیٰ نون۔ یہ صحیح ہے کہ اب مغربی مورخین نسبتاً غیر جانبدارانہ نقطۂ نگاہ سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کیلئے نئے نئے مواقع عطا کئے ہیں[1]

٭

راوی۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں علامہ تیسری گول میز کانفرنس کیلئے لندن پہنچے تھے آپ کا قیام ملکہ این کے محل میں تھا۔ ایک روز عبداللہ چغتائی علامہ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ علامہ کے پاس ایک بلند قامت اور وجیہہ نوجوان بیٹھے ایک اردو خط پڑھ رہے ہیں۔

عبداللہ چغتائی السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

علامہ۔ آؤ جی ماسٹر۔۔۔۔۔۔ ان سے ملو اپنے ہوشیار پور کے چودھری رحمت علی کیمرج سے آئے ہیں اور یہ ہیں عبداللہ چغتائی لاہور کے ایک فاضل دوست۔

چغتائی۔ السلام علیکم چودھری صاحب!

رحمت علی۔ وعلیکم السلام! تشریف رکھیئے۔

(خط پڑھ کر رکھ دیتے ہیں)

علامہ۔ یہ خط مجھے جرمنی سے آیا تھا۔ پروفیسر کہیت کے بارے میں ہے اس نے پیام مشرق پڑھ رکھی ہے۔

---
[1] روزگار فقیر

قادیانیوں کی تحریک سے واقف ہے اور گاندھی جی کا سخت مخالف ہے۔

رحمت علی۔ اور ہونا بھی چاہیئے میں آپ کے الہ آباد کے خطبہ کے بعض نکات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

علامہ۔ آپ نے دیکھا ہے یہ خطبہ؟

رحمت علی۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ کیمرج آئیں اور لیکچر دیں۔

علامہ۔ جب مجھے باقاعدہ دعوت دیجائے گی تو میں ضرور قبول کر لونگا۔

راوی۔ اس ملاقات کے شاہد ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اتنا ہی لکھا ہے کہ چودھری رحمت علی مسلمانانِ ہند کے سیاسی مستقبل پر علامہ کیساتھ گفتگو کرتے رہے۔ اور وہ اپنی گفتگو میں علامہ کے خطبہ الہ آباد کا بار بار حوالہ دیتے رہے۔

لندن کے جن مسلم طلبا نے علامہ کو استقبالیہ دیا ان میں چودھری رحمت علی بھی شامل تھے۔ بعد کو علامہ کیمرج بھی گئے استقبال کرنے والوں میں چودھری رحمت علی پیش پیش تھے۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں چودھری رحمت علی نے اپنا مشہور کتابچہ "اب یا کبھی نہیں۔" شائع کیا۔ جس میں ہندوستان کو آزاد منطقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی اور شمال مغربی آزاد مسلم ریاست کیلئے پاکستان کا لفظ وضع کیا گیا تھا۔

راوی۔ کانفرنس سے واپس تشریف لانے کے بعد نذیر نیازی سے باتیں کرتے ہوئے علامہ نے مسلم طلبہ کا تذکرہ بھی کیا۔

علامہ۔ ہمارے نوجوان طلبہ نے جو انگلستان میں حاصل کر رہے ہیں

میری تجویز کردہ ہندی اسلامی ریاست کیلئے پاکستان کا نام وضع کیا ہے
اس میں "پ" سے مراد ہے پنجاب، "الف" سے افغانی (سرحدی) صوبہ
"ک" سے کشمیر، "س" سے سندھ اور "تان" سے بلوچستان۔

راوی۔ یہ اشارہ چوہدری رحمت علی اور ان کی اسکیم کی طرف تھا۔

راوی۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں علامہ کا قیام تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ملکہ این کے محل میں تھا۔ ایک روز شام کو کچھ طلبہ علامہ سے نیاز حاصل کرنے آئے۔ جن میں فیروز سنز کے ڈاکٹر عبدالوحید بھی تھے۔

طلبہ۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تحقیقی معاملات کے سلسلے میں آپ سے کچھ رہنمائی حاصل کریں۔

علامہ فقط ڈگری حاصل کرنے کیلئے مقالات لکھنا یا امتحان دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے طلبہ کا وطیرہ ہے۔ آپ لوگ صرف علم ہی حاصل نہ کریں۔ علم پیدا بھی کریں تاکہ اپنے ملک وقوم کا نام روشن کر سکیں۔

ث

راوی۔ تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں علامہ کے قیامِ لندن کے دوران بھوپال کے نواب حمید اللہ خان بھی وہیں تھے۔

حمید اللہ خان۔ ڈاکٹر صاحب یہ موقعہ اچھا ہے کہ آپ اسپین بھی ہو آئیے۔

علامہ۔ ضرور ہو آتا اگر میں نواب ہوتا۔

راوی۔ نواب اشارہ سمجھ گئے چنانچہ انھوں نے زادِ راہ کا بندوبست کر دیا۔ ایک موزوں سیکرٹری منتخب کی گئی علامہ نے رقم اس کے حوالے کی اور اپنا پروگرام بتا دیا۔ پہلے تو اس نے سیکرٹری کی طرح رسمی انداز سے

کام کیا پھر وہ انگریز لڑکی اس طرح ان کی خدمت کرنے لگی ۔ جیسے پرائیویٹ سیکرٹری نہیں کوئی مرید ہے ۔

علامہ ۔ تمہارے طرزِ عمل کے بدل جانے کا سبب کیا ہے تم اس طرح میری خدمت کیوں کرتی ہو ؟

سیکرٹری ۔ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ آپ ایک آسمانی مخلوق ہیں ۔

راوی ۔ اس لڑکی کے بارے میں ایک ہسپانوی اخبار میں یہ چھپ گیا کہ علامہ کی ایک بیٹی بھی ساتھ ہے جو دبلی پتلی اور سفید فام ہے ۔ علامہ نے خود یہ روداد عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھی ۔

راوی ۔ تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں قیام لندن کے دوران علامہ کی علمی مصروفیات جاری تھیں ۔ عبداللہ چغتائی کو برٹش میوزیم میں علامہ کا پیغام موصول ہوا کہ سورہ المزمل کی آیت

" حتی اذا اتو علی واد المزمل قالت نملۃ

یا ایھا المزمل ادخلو مساکنکم ؕ الاٰیۃ

کا پکتھال کا انگریزی ترجمہ بھیجدو ۔ انھوں نے فوراً تعمیل ارشاد کردی ۔ شام کو جب عبداللہ چغتائی علامہ کے ہاں پہنچے تو یہ گفتگو ہوئی ۔

علامہ ۔ شکریہ ماسٹر جی ترجمہ مل گیا بروقت ۔

عبداللہ چغتائی ۔ کیا ضرورت پیش آگئی تھی ۔

علامہ ۔ دراصل یہ ترجمہ ایک عورت کی تشفی کیلئے مجھے درکار تھا ۔ اس عورت کا نام مس روزینا فوربس ہے ۔ جس نے علمی تحقیقات کے سلسلہ میں دور دراز کا سفر کیا ہوا ہے ۔ اس خاتون نے مجھے کھانے پر بھی بلایا تھا ۔

میں تو اس کا گھر دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ اس نے اپنے گھر کو اسلامی طرز کے مطابق آراستہ کیا ہوا تھا خاص کر ایرانی قالین تو اپنی نفاست اور عمدگی میں لاجواب تھے کھانے کے دوران تو اس نے گھر کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں مگر جب میں چلنے لگا تو بولی۔ ڈاکٹر صاحب میرے مکان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

میں نے کہا۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہی بہشت تخلیق کر لی ہے۔ جبکہ میں ابھی اس کی جستجو میں ہوں۔

راوی۔ حق یہ ہے کہ مکان کو بالکل الف لیلوی انداز میں سجایا گیا تھا۔

راوی۔ ۱۹۳۲ء کے آواخر میں گول میز کانفرنس سے فراغت پاکر علامہ یوروپ کے دورے پر نکلے۔ پہلے پیرس پہنچے وہاں فرانس کے مشہور فلسفی برگساں سے نظریۂ اضافیت زمان پر سیر حاصل بحث ہوئی اس کے دوران علامہ نے کہا۔

علامہ۔ ہمارے رسول (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کا قول ہے زمانے کو بُرا مت کہو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے میں خود زمانہ ہوں۔

برگساں (حیران ہو کر) کیا یہ صحیح قول ہے؟

راوی۔ تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر علامہ اسپین بھی گئے جب قرطبہ کی مسجد دیکھنے گئے جو اَب گرجا بن چکی ہے تو ایک پادری سے (جو مسجد کی نگرانی پر مامور تھا) علامہ کی یہ گفتگو ہوئی۔

علامہ۔ میں یہاں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔

پادری۔ مشکل ہے۔ یہاں نماز کی ادائیگی کی تو اجازت نہیں، صرف دیکھ سکتے ہیں۔

علامہ۔ تعجب ہے تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو۔ حالانکہ ہم نے تم سے کبھی اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔

پادری۔ (کچھ متاثر ہو کر) آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔

راوی۔ جب تک وہ پوچھ کر آتا علامہ اذان دے کر نماز پڑھ چکے تھے ایک اور روایت کے مطابق علامہ نے وہاں نماز پڑھنے کی باقاعدہ اجازت حاصل کر لی تھی بہرحال ان کی اذان صدیوں بعد مسجد قرطبہ کے محراب و منبر در میں گونجی۔

علامہ نے نماز پڑھی اور پھر یوں دعا کی۔

علامہ۔ (نہایت درجہ خشوع و خضوع سے) اللہ! یہ وہی سرزمین ہے جہاں مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی یونیورسٹیاں قائم کیں اور یورپ کو علم و فضل سکھایا۔ جن کے دبدبے سے شیروں کے دل دہلتے تھے اور جن کے احسان کے نیچے آج تمام فرنگستان دبا ہوا ہے آج میں اُسی قوم کا ایک فرد انہی کی تعمیر کردہ مسجد میں اغیار کی اجازت لیکر نماز پڑھ رہا ہوں۔

اے خدا یہ تیرے پاک بندوں کی زمین ہے یہ پرشکوہ مسجد، یہ قصر الحمراء اور یہ عالی شان قلعے ان کی عظمت کے گواہ ہیں اے خدا تو ان کو محفوظ رکھ۔

راوی۔ مسجد قرطبہ ہی میں علامہ نے وہ دعائیہ اشعار کہے۔

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

جو دعا کے عنوان سے بال جبریل میں شامل ہیں اور قرطبہ ہی میں علامہ کے قلم سے وہ لافانی نظم نکلی جس کا عنوان مسجد قرطبہ ہے

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات !
سلسلۂ روز و شب ، اصل حیات و ممات

راوی۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد واپسی میں علامہ چند روز کیلئے روم (اٹلی) میں بھی ٹھہرے۔ مولانا غلام رسول مہر بھی ساتھ تھے۔ علامہ مولانا مہر کے ہمراہ روم کی آثارِ قدیمہ کی سیر کرتے ہوئے قدیم رومن شہنشاہوں کے بنائے ہوئے ایک وسیع و عریض اکھاڑے کے کنارے کھڑے تھے کہ نگران نے کہا

نگران۔ ان اکھاڑوں میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت شیروں کی انسانوں سے لڑائی دیکھ سکتے تھے ان تماشوں کو دیکھنے کیلئے سارا روم امنڈ آتا تھا۔

علامہ۔ (غلام رسول مہر سے) ایک طرف تو قدیم رومی سلطان تھے جنھوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض کیلئے بنائی کہ پچاس ہزار انسان بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی دیکھ سکیں۔ دوسری طرف لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو اس غرض سے تعمیر کی گئی کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر سکیں اس ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

راوی۔ گول میز کانفرنس سے واپسی پر علامہ اٹلی کے فاشسٹ ڈکٹیٹر مسولینی کی خواہش پر اس سے ملنے گئے۔ مسولینی اسرارِ خودی کا ترجمہ پڑھ چکا تھا اور علامہ کے تعمیرِ خودی کے افکار سے متاثر تھا۔ علامہ کی اس نے شایانِ شان پذیرائی کی۔

اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن بازو بھرے بھرے سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔

مسولینی۔ (رسمی مزاج پرسی کے بعد، میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام نظامِ حیات کیلئے بہت ضروری سمجھتا ہے لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوگا۔

مسولینی۔ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں؟

علامہ۔ تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبا کو اٹلی بلائیے۔

مسولینی۔ مجھے کوئی اچھوتا مشورہ بھی دیجئے۔

علامہ۔ ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔

مسولینی۔ (حیران ہو کر) اس میں کیا مصلحت ہے؟

علامہ۔ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر لے لیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ میرے پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

مسولینی۔ (یہ حدیث سنتے ہی کرسی سے کھڑے ہوتے اور دونوں ہاتھ میز پر مارتے ہوئے۔) اٹلی کے نوجوانوں کیلئے کچھ نصیحت کریں۔

علامہ۔ اٹلی ابھی ایک نوجوان قوم ہے اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا

چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال پذیر تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی اور زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

اٹلی کی حالت قبل از اسلام کی طرح ہے ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور اسے تازہ خون کی ضرورت تھی عربوں نے ایران کو تازہ خون دیا۔ اور وہ ایک پرشکوہ تہذیب کا علمبردار بن گیا۔ اسی طرح روما کے زوال کے بعد اٹلی کو گاتھ اور جرمن قوم نے تازہ خون فراہم کیا اور اُسے قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اب ایران اور اٹلی دونوں کو پھر تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں ترکمان موجود ہیں اور جنوب میں عرب کے جری قبائل یہ قومیں اپنا خون دیکر ایران کو پھر زندہ اور قوی کردیں گی لیکن موجودہ اٹلی کے گرد اس طرح کی مہذب قومیں آباد ہیں جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو موجود نہیں پھر اٹلی تازہ خون کہاں سے لائے گا۔

مسولینی — بہت خوب یہ ایک اچھوتا خیال ہے۔

راوی۔ — مسولینی سے ملاقات کے بعد علامہ نے مسولینی سے متعلق وہ مشہور نظم لکھی جس کا پہلا شعر

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب

اور آخری

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے!
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

مسولینی فاشسٹ آمر تھا جب اس کے چہرے کا سامراجی نقاب

اُٹھا تو علامہ نے پس چہ باید کرد میں اس پر سخت تنقید کی اس تناقض سے آلِ احمد سرور جیسے بعض اہل قلم کو الجھن ہوئی۔ ان کے خط کے جواب میں علامہ نے لکھا۔ مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقض نظر آتا ہے۔

آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندہ خدا میں دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں؟ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے جس کو شعاعِ آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں کم از کم مجھ کو اسی قسم کا احساس ہوا[1]

٭

راوی۔ ہسپانیہ کے دورے کے کچھ دنوں بعد علامہ جاوید منزل کی ایک محفل میں وہاں کے اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کر رہے تھے۔

یکے از حاضرین۔ ہسپانیہ کی تاریخی عمارات کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

علامہ۔ مسلمانوں کی عمارات دو قسم کی ہیں جلالی اور جمالی اور یہ دونوں قسم کی عمارت اپنے بنانے والوں کے کردار کا آئینہ ہیں جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر میں محبت کا عنصر تھا۔ اس لئے تاج محل، شالامار باغ اور شاہی مسجد لاہور کی تعمیر ہوئی۔

شیر شاہ سوری پیکرِ جلال تھا اس لئے اس کے تعمیر کردہ قلعوں

---

[1] سرگزشتِ اقبال ۲۲۴ صفحہ

میں ہیبت پرستی ہے۔

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیوؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ دیوؤں کا مگر الحمرا مہذب انسانوں کا۔

میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا پھرا دیوار پر ھو الغالب لکھا ہوا نظر آتا تھا میں نے دل میں کہا۔ یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے کہیں انسان نظر آئے تو بات ہو۔

راوی۔ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر جو وفد کابل جا رہا تھا علامہ اور سید سلیمان ندوی کے علاوہ ان میں سر راس مسعود بھی شامل تھے سر راس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم کی خواہش تھی کہ وہ بھی ساتھ چلیں سر راس کیلئے بیوی کی بات ٹالنا مشکل تھا انھوں نے علامہ سے مشورہ کیا۔

سر راس۔ بیگم کی خواہش ہے کہ وہ بھی ساتھ چلیں آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ مجھے آپ دونوں عزیز ہیں مگر یہ گھریلو معاملہ نہیں، قومی معاملہ ہے حکومت افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و ترتیب کے ہمیں بلا رہی ہے۔

ہمارے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا وہ محتاجِ تشریح نہیں۔[1]

---

[1] ملفوظات اقبال ۳۱۴۔

راوی۔ نادر شاہ سے علامہ کی ملاقات قصرِ دلکشا میں ہوئی۔ علامہ نے نادر شاہ کو قرآن مجید کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

علامہ۔ اہلِ حق کی یہی دولت و ثروت ہے اسی کی بدولت باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے

نادر شاہ۔ جب میں جلاوطن تھا اور کوہ و صحرا میں غمزدہ وقت کاٹ رہا تھا۔ جب میرے پاس زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور مادی طاقت کا فقدان تھا جب کوئی ساتھی اور غم خوار نہ تھا تو یہی کتاب میری رفیق و رہنما اور ہمدرد و غمگسار تھی۔

☆

راوی۔ جن دنوں علامہ افغانستان کے دورے سے واپس آئے۔ فقیر وحید الدین اپنے والد فقیر سید نجم الدین کے ہمراہ علامہ کے ہاں گئے۔

نجم الدین۔ آپ نے پیامِ مشرق میں شاہ افغانستان سے خطاب کیا تھا اس کا اثر بھی دیکھا۔

علامہ۔ میں نے افغانستان کے تجربات پر ایک مثنوی "مسافر" کے نام سے لکھی ہے۔

☆

راوی۔ ۱۹۳۳ء کے اوائل میں حیدر آباد سندھ کے ایک آریہ سماجی ہندو نے ایک کتاب لکھی تھی "ہسٹری آف اسلام" اس میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔

ہزارے کے ایک نوجوان عبدالقیوم نے اسے کیفرِ کردار تک پہنچا دیا عدالت نے اسے سزائے موت سنائی۔ کراچی سے ایک وفد علامہ کے پاس آیا اور مقدمہ کی روداد سنا کر کہا۔

وفد۔ اگر آپ وائسرائے سے ملاقات کریں اور صورتِ حال سمجھائیں تو توقع ہے کہ اس کی سزائے موت عمر قید سے بدل جائے اور حکومت اس کی رحم کی اپیل منظور کرلے۔

علامہ۔ (دیر تک سوچتے رہنے کے بعد) کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟

وفد۔ نہیں اس نے شروع دن سے اعترافِ قتل کیا ہے اپنے بیان پر قائم ہے وہ تو بار بار کہتا ہے میں نے شہادت خریدی ہے مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو۔

علامہ۔ (چہرہ تمتاتا ہوا برہمی سے) جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کیلئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی اور مر گیا تو شہید ہے۔

راوی۔ علامہ لاہور میں غازی علم الدین اور کراچی میں عبدالقیوم کے غیرتمندانہ اقدامات سے بہت متاثر تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ کاش یہ سعادت انھیں خود نصیب ہوئی ہوتی۔

ضربِ کلیم میں لاہور اور کراچی کے عنوان سے جو اشعار ہیں۔ وہ غازی عبدالقیوم کی رحم کی اپیل کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے

نظر اللہ پر رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لا تدع مع اللہ الٰہاً آخر
(اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو مدد اور عبادت کیلئے مت پکارو)

پ

راوی۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر تاثیر، عبدالرحمان چغتائی وغیرہ ہم نے لاہور سے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا مصور رسالہ "کارواں" نکالا تھا اس کے پہلے پرچے کیلئے علامہ کا غیر مطبوعہ اردو کلام لینے کیلئے تاثیر اور چغتائی برادران علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

تاثیر۔ ڈاکٹر صاحب! اردو میں آپ نے دیر سے کچھ نہیں لکھا۔

عبدالرحمٰن۔ اردو بہ حیثیت زبان کے آپ کی توجہ کی مستحق ہے۔

عبداللہ چغتائی۔ اردو دان آپ کے ہم قوم ہونے کی حیثیت سے پیامِ اقبال سننے کے زیادہ مستحق ہیں۔

تاثیر۔ مسلمانانِ ہند کو اور کون ابھاریگا

چغتائی۔ "کارواں" کو نکالنے کا مشورہ آپ ہی نے دیا تھا۔

تاثیر۔ آپ کا غیر مطبوعہ کلام نہ ہوا تو ہماری نیاز مندی لوگوں کی نظر میں مشکوک ٹھہریگی۔

علامہ۔ (اس دوران مسکراتے رہنے کے بعد) اردو میں شعر نازل

ہی نہیں ہوتے۔ جاوید نامہ کو ابھی ابھی ختم کیا ہے اور دل و دماغ بگڑ گئے ہیں اس لئے فارسی کو چھوڑ کر اردو میں کہنا سنگِ مرمر کے بجائے گارے کی عمارت بنانا ہے مگر تمہارے اور دیگر عزیزوں کے اصرار سے اردو کی طرف میلان ہو رہا ہے دیکھو جو اس کی مرضی۔

تاثیر۔ اُردو غزل لیکر چلیں گے۔

چغتائی۔ اُردو غزل عطا فرمائیے۔

علامہ۔ یہ ایک نئی شرط لگا دی۔

چغتائی۔ کچھ تو ہو۔

علامہ۔ (تاثیر سے) تم اس وفد کے سرغنہ ہو اور شاعر ہو، اپنے اشعار سناؤ شاید طبیعت کو بہانہ مل جائے۔

تاثیر۔ میں اور آپ کے سامنے۔

علامہ۔ بھئی کچھ سناؤ گے تو شاید تمہاری قسمت کی کوئی چیز ہو جائے۔

چغتائی۔ وہ "سمجھا تھا میں" والی غزل سنا دو۔

عبداللہ۔ ہاں - ہاں ہو جائے

تاثیر۔ (پہلا اور دوسرا مطلع پڑھتے ہیں۔)

علامہ۔ (دہراتے ہیں) "تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں۔"

تاثیر۔ " زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں!

علامہ۔ خوب، پھر پڑھو۔

تاثیر۔ زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

زمین اچھی ہے خدا کا قافیہ کیوں چھوڑ دیا۔؟

(چپ ہو کر فکرِ شعر میں سر جھکا لیتے ہیں حاضرین کی اُمید بندھتی ہے۔)

اگر قافیہ بدل جائے تو۔

تاثیر۔ تو بہتر ہوگا۔

علامہ۔ لو سنو تم غزل، غزل پکار رہے تھے تو غزل ہی سہی۔

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم!
اِک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک!
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

راوی۔ تاثیر لکھتے ہیں کہ علامہ بھی اشکبار تھے اور ہم بھی نہ جانے یہ غزل کتنی لمبی ہو جاتی مگر یہ فیضانی سلسلہ ایک اجنبی ملاقاتی کی آمد سے منقطع ہو گیا۔

راوی۔ ۱۹۳۴ء سے علامہ کی صحت بالکل جواب دے گئی تھی۔ وکالت سے آمدن پہلے بھی کچھ زیادہ نہیں تھی اب تو بالکل مسدود ہوگئی۔ اس وجہ سے علامہ شدید مالی پریشانی میں مبتلا تھے لیکن استغنا اور توکل کا یہ عالم کہ اس بارے میں بالکل خاموش تھے سر راس مسعود نے (جو علامہ کے بڑے مداح و عقیدت مند تھے اور اس زمانے میں بھوپال کے وزیر تعلیم تھے) اپنے طور پر نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خان سے پانچسو روپے ماہوار وظیفہ کا معاملہ طے کرایا۔

راس مسعود۔ میں نے آپ کے ایما کے بغیر یہ کوشش کی ہے میری التجا ہے کہ آپ اس پیشکش کو قبول کر لیں۔

علامہ۔ اچھا مگر میری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے پانسو روپے مجھے کافی ہیں اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لئے نواب صاحب کے وظیفے پر اکتفا کیا جائے اور سر آغا خان سے وظیفہ نہ لیا جائے۔

راس مسعود۔ اگر آپ کا اصرار یہ ہے تو آغا خان کے وظیفے کی رقم ماہ بہ ماہ بنک میں جمع ہوتی رہے اور ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں جاوید و منیرہ کی تعلیم کا انتظام ہو۔

راوی۔ اس سے پہلے کہ یہ ٹرسٹ بنتا سر راس مسعود اللہ کو پیارے ہو گئے اور یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی [1]

٭

راوی۔ علامہ اپنی ذات میں انجمن تھے ان کی محفلیں شعر و فن تصوف

[1] روزگار فقیر حصہ اوّل ص ۱۶۱

وسیاست اور فلسفہ کا صد رنگ مرقع ہوتی تھیں بیچ بیچ میں لطیفے بھی چلتے تھے پیروں فقیروں کے بھی تذکرے آتے تھے کبھی کبھار موسیقی کا رنگ بھی جمتا تھا موسیقی سے انھیں جوانی میں خاصا شغف رہا تھا۔ کبھی ستار بھی بجاتے تھے۔ صوفی تبسم نے ۱۹۳۴ء کی ایک ایسی محفل کا ذکر کیا۔ سراج نظامی ترنم سے بہت اچھا پڑھتے تھے۔ صوفی صاحب ان کو لے کر جاوید منزل پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب حسب معمول چارپائی پر لیٹے تھے۔

علامہ۔ صوفی جی! یہ نوجوان کون ہے ؟

صوفی تبسم۔ وہی جس کا میں نے تذکرہ کیا تھا یہ آپ کو کلامِ اقبال سنائے گا۔

علامہ۔ ہاں بھئی کوئی غزل سناؤ۔

سراج نظامی ۔

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کیلئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کے جلانے کیلئے

علامہ۔ اوں ہوں آگے چلو۔

سراج نظامی۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں!
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ ترے زمان و مکاں اور بھی ہیں

علامہ۔ واہ، واہ ماشاءاللہ خوب گاتے ہو۔ کچھ فارسی کا کلام بھی یاد ہے۔

سراج نظامی۔ جی ہاں۔

صوفی تبسم۔ وہ غزل سناؤ جس کا مطلع ہے۔

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم ہر بند گسستم من

سراج نظامی۔ عرض کرتا ہوں۔

صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم، ہر بند گسستم من
در بود و نبود من بشر گماہما داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

علامہ۔ (کچھ دیر اشکبار رہنے کے بعد) بہت خوب یوں معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے شعروں میں ڈوب کر پڑھتے ہو۔

صوفی تبسم۔ موسیقی سحر کا اثر رکھتی ہے بشرطیکہ کوئی ذوق رکھتا ہو۔

علامہ۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ موسیقی کیا ہے لیکن ایک تانگے والا گڑھی شاہو اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان تانگہ چلاتا ہے اور کبھی کبھی بلند آواز سے گاتا ہوا گزرتا ہے میں کوٹھی میں جہاں بھی ہوں جونہی اُس نیک بخت کی آواز میرے کانوں میں پہنچتی ہے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اصل موسیقی تو یہی ہے۔

صوفی تبسم۔ لیکن خانقاہوں، پیروں فقیروں کی گدیوں پر جو موسیقی چل رہی ہے اُس کے کیا کہتے۔

علامہ۔ دیکھئے کھرا کھوٹا ہر جگہ اور ہر چیز میں ہوتا ہے۔

صوفی تبسم۔ بہت وقت ہو گیا گیارہ بجنے لگے اب اجازت دیجئے۔

علامہ۔ صوفی صاحب کبھی کبھی اسے لے آیا کریں میں اس کے ترنم سے کافی محظوظ ہوا ہوں۔

راوی۔ جون ۱۹۳۵ء سے عبدالرشید طارق، علامہ کے صاحبزادے جاوید کو پڑھانے ہر روز جاوید منزل جاتے تھے اس ضمن میں علامہ کی خدمت میں حاضری کا بھی موقعہ اکثر ملتا رہتا تھا۔ ایک روز اولیاء فقرا کی بات ہو رہی تھی عبدالرشید طارق نے پوچھا۔

طارق حضرت یہ تو فرمایئے اولیاء و فقرا سے اتنی عقیدت رکھنے کے باوجود آپ کے بعض اشعار میں پیروں فقیروں پر تنقید بھی ملتی ہے۔

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلہ فقر سے تھا ولولہ حق
طروں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

علامہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں پہ نہیں حقیقی مشاہدے

اور تجربے پر مبنی ہے۔

راوی۔ مئی ۱۹۳۵ء میں والدۂ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ بالکل بجھ کے رہ گئے تھے۔ جسمانی عوارض نے بھی حملہ کر رکھا تھا لیکن طبیعت کی فطری شگفتگی گل کھلاتی رہی تھی۔ عبدالرشید طارق اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے کہ جنس کے موضوع پر بات چل نکلی۔

علامہ۔ جب عورتیں میرا کلام پڑھتی ہیں تو وہ خیال کرتی ہیں کہ میں نوجوان ہوں۔ جاوید کی ماں کے انتقال کے بعد شادی کرنے کے کئی پیغام آ چکے ہیں حال ہی میں ایک خط ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی کی طرف سے آیا ہے۔

طارق کیا لکھتی ہے؟

علامہ اس نے لکھا ہے کہ میں آپ کی شاعری سے کافی لطف اندوز ہوتی ہوں میں چاہتی ہوں آپ مجھ سے شادی کر لیں۔

میں نے اسے معقول جواب دے دیا۔

طارق۔ یعنی۔

علامہ۔ یعنی یہ کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم میری شاعری سے لطف اندوز ہوتی رہو اور شادی کا خیال چھوڑ دو۔

☆

اِس معاہدے سے ارتکاز میں کمی آئے گی

راوی۔ علامہ اقبال پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن اس سلسلے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اس کو ہاتھ نہ لگاتے خواہ موکل کتنی زیادہ فیس دینے پر آمادہ ہوتا۔ صحیح مقدمے بھی صرف گزارے بھر کے لیتے تھے جوں ہی چھ سات سو روپے آجاتے مزید کیس لینا بند کر دیتے۔

۱۹۳۵ء سے جب گلے کی تکلیف بڑھی تو آمدن کا یہ رہا سہا سہارا بھی نہ رہا۔ کچھ کتابوں کی رائلٹی ملتی تھی اور تھوڑا بہت پیسہ بینک میں جمع تھا۔ بس اسی طرح تنگی ترشی سے کام چل رہا تھا۔ دوستوں اور نیاز مندوں کو صورتحال کا احساس ہوا تو انھوں نے اس سلسلے میں سلسلہ جنبانی شروع کی۔

حیدرآباد کے وزیر سر اکبر حیدری نے علامہ کے ایک خاص دوست اور نیاز مند میاں امیر الدین کو لکھا کہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کی خدمت میں ان کی یہ پیشکش پیش کریں۔

میاں امیرالدین۔ ڈاکٹر صاحب! اب گلے کی تکلیف کا کیا حال ہے؟

علامہ۔ علاج جاری ہے اللہ کرم کریگا۔

میاں امیرالدین۔ سر اکبر حیدری نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کی ایک تجویز آپ کے سامنے رکھوں

علامہ۔ وہ کیا کہتے ہیں ؟

میاں امیرالدین۔ تجویز یہ ہے کہ اگر آپ سال میں صرف ایک ہفتے عثمانیہ یونیورسٹی جا کر لیکچر دے دیا کریں تو یونیورسٹی اس کا معاوضہ دس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرے گی۔

علامہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ من جملہ اور تکلیفوں کے میرا تو گلا ہی بیٹھا ہوا ہے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے لیکچر کس طرح دوں گا۔

میاں امیرالدین۔ اس کا علم انھیں ہے اسی لئے انھوں نے کہا ہے کہ آپ صرف لیکچر لکھ دیا کریں وہ کسی اور سے پڑھوا لیا کریں گے۔

علامہ۔ (کچھ سوچ کر) پھر بھی اس تجویز کو قبول کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

میاں امیرالدین۔ کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ بہت معقول تجویز ہے۔

علامہ۔ مجھے اس کی معقولیت میں کلام نہیں وجہ تردد کچھ اور ہے۔

میاں امیرالدین۔ وہ کیا ؟

علامہ۔ میں اسلامی فقہ پر ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کنٹریکٹ منظور کر لوں تو میں ذہنی طور پر مصروف ہو جاؤں گا۔ اور کتاب مکمل نہ کر سکوں گا۔ اس لئے یہ کنٹریکٹ مجھے منظور نہیں۔

راوی۔ میاں امیرالدین کی عمر اب کم و بیش نوے برس کی ہے۔ علامہ سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۰ء میں ہوئی تھی جب میاں صاحب چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے اس وقت سے ۱۹۳۸ء میں علامہ کی وفات تک میاں صاحب علامہ کے قریب رہے ہیں۔ یہ واقعہ میاں صاحب کے حوالے سے خوشنود علی خان نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ء کے اخبارِ جہاں میں نقل کیا ہے۔

راجہ صاحب محمود آباد سے ملاقات سے انکار

راوی۔ علامہ بڑے منکسر المزاج تھے اور میل ملاقات میں بڑے فراخدل ان کے دروازے ہر کس وناکس کیلئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ جو بھی آتا وہ اس سے بڑے انکسار سے ملتے اور اس سے اس کی ذہنی سطح اور مزاج کے مطابق گفتگو کرتے۔

لیکن منافقوں اور قومی مفاد کے خلاف کام کرنیوالوں کیلئے نہ ان کے دل میں جگہ تھی نہ ان کے گھر میں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ان کے دوست نواب مظفر خان آئے۔

نواب مظفر۔ السلام علیکم! ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ آیئے نواب صاحب تشریف رکھیئے۔

نواب مظفر۔ آج میں ایک اور ملاقاتی کو ساتھ لایا ہوں وہ باہر کھڑے ہیں۔

علامہ۔ کون صاحب ہیں بلا لیجیے کیا ہے؟

نواب مظفر۔ راجہ صاحب محمود آباد آپ سے ملاقات کے بڑے خواستگار ہیں۔

علامہ۔ کون؟ راجہ صاحب محمود آباد، وہی جنھوں نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تھی نواب صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے نہیں مل سکتا۔

راوی۔ یہ واقعہ علامہ کے پرانے دوست اور نیازمند میاں امیرالدین

کے سامنے پیش آیا۔ اوران کے حوالے سے خوشنود علی خان نے ۱۰ رنومبر ۱۹۸۰ء کے اخبار جہاں میں نقل کیا

مسلمان، قرآن اور ترقی

راوی۔ میاں امیرالدین، علامہ اقبال کے یہاں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ ایک روز آئے تو خلافِ معمول علامہ کو خط لکھتے ہوئے مصروف پایا۔

میاں امیرالدین۔ کوئی خاص خط ہے۔

علامہ۔ ڈاکٹر انصاری کو لکھ رہا ہوں

میاں امیرالدین کیوں کوئی خاص مسئلہ ہے؟

علامہ میں ڈاکٹر انصاری کی بڑی قدر کرتا تھا وہ اب کانگریسی ہوگئے ہیں میں نے انھیں لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ مسلمان قرآن اور اسلام کے ذریعے ترقی نہیں کرسکتا۔

راوی۔ یہ واقعہ میاں امیرالدین کے حوالے سے خوشنود علی خان نے ۱۰ رنومبر ۱۹۸۰ء کے اخبار جہاں میں لکھا ہے۔

☆

راوی۔ علامہ ریاض منزل بھوپال میں سر راس مسعود کے مہمان تھے ایک روز ان میاں بیوی میں یہ بحث چل نکلی کہ لڑکوں اور لڑکیوں

میں شادی سے قبل کچھ نہ کچھ تعلق باہمی انس و محبت کیلئے ہونا چاہیئے ۔

بیگم مسعود۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کی اس ضمن میں کیا رائے ہے؟

علامہ۔ شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل اولاد پیدا کرنا ہے اور رومان کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیئے ۔

بیگم مسعود۔ آج کل والدین اپنی اولاد کے رشتے جس طرح اپنی پسند سے کرتے ہیں اس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے ۔؟

علامہ۔ والدین عموماً ان تمام ضروری باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہی رشتے طے کرتے ہیں ۔

☆

راوی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن حمایت اسلام کے یومِ اردو کی صدارت کے لئے مولوی عبدالحق لاہور آئے تو علامہ نے انھیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران علامہ نے فرمایا۔

علامہ۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مضمون کا ایک بیان شائع کر دیں۔ کہ ہم اردو رسم الخط کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

مولوی عبدالحق۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا چند روز صبر کیجئے وہی ہوگا جو آپ کا منشا ہے۔

☆

راوی۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقیٔ اردو کا دفتر دکن سے دہلی منتقل کرنا چاہتے تھے آئندہ نظامِ عمل کیلئے ایک کل ہند کانفرنس کی تجویز علامہ کے سامنے رکھی۔

علامہ۔ اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہو گیا تو انشاءاللہ

ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر بھی ہو سکا تو یقین جانیئے آپ اس اہم معاملہ میں کلیتاً آپ کے ساتھ ہوں۔

اگرچہ میں اردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت، دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔

مولوی عبدالحق: رسم الخط کے بارے میں اب آپ کی تسلی ہو گئی ہو گی۔

علامہ: جی ہاں گاندھی جی سے آپ کی گفتگو ہوئی۔

مولوی عبدالحق: جب گاندھی جی نے ذرا جھنجلا کر یہ کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی ہے آپ اسے چاہیں رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس پر میں نے کہا جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑیں۔ ہم اسے انشاء اللہ زندہ قائم رکھیں گے اور حدِ کمال تک پہنچا کے چھوڑیں گے۔

راوی: ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات قریب آ رہے تھے۔ قائدِ اعظم مسلم لیگ کی تنظیم نو میں مصروف تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ بنانے کیلئے قائدِ اعظم اپریل ۱۹۳۶ء کے آواخر میں لاہور تشریف لائے پہلے میاں سر فضل حسین سے ملے۔ انھوں نے نہ صرف تعاون سے انکار کیا بلکہ بڑی بے رخی سے پیش آئے۔ یہاں تک کہا کہ آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ پنجاب سے چلے جائیے۔ ان سے مایوس ہو کر قائدِ اعظم بہ نفس نفیس جاوید منزل تشریف لائے۔ ان دنوں علامہ کی صحت غیر معمولی طور پر خراب تھی دمہ کا دورہ پڑا ہوا تھا اس تاریخی ملاقات میں علامہ حسبِ معمول ایک معمولی سفید قمیص اور تہمد

میں ملبوس تھے ۔ قمیض بھی انھوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی رعایت سے پہن لی تھی ورنہ بنیان پر ہی گزر کرتے تھے علامہ گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے اور قائداعظم بید کی کرسی پر بیٹھے تھے ان دونوں کی گفتگو کا ایک حصہ سنیئے ۔

قائداعظم ۔ آپ جانتے ہیں کہ انتخابات ہونے والے ہیں میں چاہتا ہوں کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو منظم کیا جائے اور انتخابات لڑنے کیلئے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کیا جائے ۔

علامہ ۔ میں آپ کی تجویز سے بالکل متفق ہوں مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی کارکردگی بہت بہتر ہونی چاہیئے ۔

قائداعظم ۔ لیکن مجھے یہ کام یہاں مشکل نظر آتا ہے ۔

علامہ ۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کے مشن کی کامیابی کیلئے اپنی رگوں کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دوں گا ۔

راوی ۔ مئی ۱۹۳۵ء کو علامہ کیلئے بھوپال کے وظیفے کا اعلان ہوا تو ۲ جون کو عبدالرشید طارق مبارک باد دینے ان کی خدمت میں پہنچے ۔

عبدالرشید طارق ۔ (مبارک باد کے بعد) مگر اس سلسلہ میں نظام (حیدرآباد دکن) کی خاموشی پر افسوس ہوتا ہے ۔

علامہ ۔ بھئی وہاں معاملہ اٹھا تھا منظوری ملنے والی تھی کہ یہیں کے دو آدمیوں نے اس کی سخت مخالفت کی ۔

عبدالرشید طارق (کچھ دیر کے بعد) ڈاکٹر صاحب آپ فقہ اسلامی پر جو کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے اس کا کیا ہوا ؟

علامہ۔ ہاں! ذرا صحت اچھی ہو تو لکھنا شروع کر دوں گا چاہتا ہوں
کہ کوئی پڑھا لکھا وسیع النظر اور صحیح المشرب فاضلِ دیوبند میسّر آجائے
مجھے حوالہ جات تلاش کر کے دیتا رہے اور لکھتا جائے انگریزی سے
واقف ہو تو نہایت ہی اچھی بات ہے میں تنخواہ بھی دینے کو تیار
ہوں۔ ایک بار کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں
یوروپ کی تمام (THEORIES) نظریات کو توڑ پھوڑ کے رکھ دوں
گا ارادہ ہے کہ قانون کی تمام کتابوں کو بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر
خرید لوں یہ اب میرے کس کام کی ہیں

ٔٔ

راوی۔ سن ۳۷ء سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں یہی زمانہ علامہ
کی شدید علالت کا تھا۔ بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی دمے کی شکایت تھی
چل پھر بھی نہیں سکتے تھے لیکن ذہنی جودت اور توانائی میں کوئی فرق نہیں آیا
تھا۔ جب دورہ گزر جاتا اسی طرح علمی، ملکی وسائل پر پورے انہماک و جوش
سے گفتگو کرتے قائدِ اعظم کو اپنے تاریخی خطوط انھوں نے اِسی زمانے
میں لکھے بلکہ لکھوائے۔
ان کی علالت کی خبر سن کر اس زمانے کے مشہور سرکار نواز
رہنما سر فیروز خاں عیادت کیلئے آئے لیکن انھوں نے ملک صاحب کے
آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئے کچھ دیر باتیں سنتے
رہے۔ اور پھر خود ہی اُٹھ کر چلے گئے۔ علامہ نے کوئی تاثر نہیں دیا کون آیا

کون گیا حالانکہ اس زمانے میں وزیر وزرا کا بڑا دبدبہ تھا۔ علامہ اس طرح کے بڑوں کی بڑائی کو خاطر میں لاتے ہی نہ تھے۔ م۔ش لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۷ء کے جناح سکندر پیکٹ کے بعد صوبے کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان علامہ کی مزاج پرسی کیلئے جاوید منزل حاضر ہوئے۔

سر سکندر۔ اب کیسا مزاج ہے آپ کا ؟

علامہ۔ الحمدللہ! اچھا ہوں کچھ کمی ہے تکلیف میں۔

سر سکندر۔ خدا آپ کو صحت دے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔

علامہ۔ شکریہ! لیکن سردار صاحب اتنا میں ضرور کہوں گا ہندوؤں اور سکھوں کو راضی کرنے کیلئے آپ جو چاہیں کریں لیکن ملتِ اسلامیہ کی بکی مول نہ لیں۔

*

راوی۔ زندگی کے آخری دنوں میں علامہ کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوں، کاشانہ نبوی کی زیارت کریں اس سلسلے میں ان کی کیفیت وہ تھی جس کا ذکر امیر مینائی کے اس شعر میں کیا ہے

ع

جب مدینہ کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا، میں رہا جاتا ہوں

۱۹۳۷ء کے اواخر کا ذکر ہے کہ علامہ کو خبر ملی کہ بہاول پور کے ایک پیر صاحب جن سے علامہ کے مراسم تھے حج کی تیاریوں میں مصروف

ہیں تو تڑپ اُٹھے ان دنوں علامہ کے ہاں ان کی چھوٹی بہن بھی آئی تھیں ان سے کہنے لگے۔

علامہ۔ طبیعت ذرا اچھی ہوتی تو پیر صاحب کے ساتھ حجاز جانے کا اچھا موقعہ تھا۔

بہن۔ عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اُتر رہا ہے ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر سے رکھے اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔

علامہ۔ (درد انگیز لہجے میں) آنکھوں کا کیا ہے آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں [1]

٭

راوی۔ "گنج ہائے گرانمایہ" میں رشید احمد صدیقی نے علامہ سے اپنی ایک مختصر ملاقات کا حال لکھا ہے۔ ۱۹۲۹ء کی بات ہے علامہ علی گڑھ گئے تو رشید احمد صدیقی کی بیماری کی خبر سن کر ان کی عیادت کو گئے پھر دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

رشید صدیقی۔ (بڑی مایوسی سے رک رک کر) ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔

علامہ۔ (چونک کر لیکن وقار اور شفقت سے) نہیں جی، صدیقی صاحب کوئی بات نہیں اللہ اپنا فضل کرے گا اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا

[1] روزگارِ فقیر۔

مایوس کیوں ہوتے ہو۔ مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے اچھے مسلمان کو اس کی احتیاط کرنی چاہیئے۔

٭

راوی "گنج ہائے گرانمایہ" میں رشید احمد صدیقی نے اقبال کے قیام بھوپال کے زمانہ کا ایک (بظاہر معمولی سالیکن درحقیقت نہایت اہم) واقعہ نقل کیا ہے۔ علامہ ریاض منزل میں سر راس مسعود کے مہمان تھے۔ سر راس مسعود اور لیڈی مسعود دونوں علامہ سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے علامہ بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے علامہ نے بڑے اصرار کیساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کرایا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹے تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی موصوفہ کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی علامہ فرماتے تھے کہ اگر ماں ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے کلام پاک سن لیا کرے تو پھر بچہ پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔

علامہ کا ملازم علی بخش اس خدمت پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کیلئے فوراً آمادہ کرے علامہ خود بھی دیکھتے رہتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا علامہ نے علی بخش کو آواز دی۔

علامہ۔ علی بخش، علی بخش قاری صاحب آئے ہوئے ہیں لیڈی مسعود کہاں ہیں۔؟

علی بخش (آزردگی اور تلخی سے پنجابی میں) قرآن کیا سنیں گی وہ تو صبح ہی

صبح باغ میں پھول کاٹنے چلی جاتی ہیں وہاں سے فرصت ملے تو آئیں۔

علامہ۔ (قدرے توقف کے بعد) صبر علی بخش صبر یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

٭

راوی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں مرزا جلال الدین یوروپ سے واپس آ کر علامہ کی عیادت کیلئے حاضر ہوئے۔ علامہ بیماری سے حد درجہ کمزور ہو چکے تھے لیکن عالم شباب کے دوست کو دیکھ کر ان کی فطری شگفتہ طبعی عود کر آئی۔

علامہ تم سال بھر کے بعد وطن واپس آئے استاد سچ سچ کہو اب کے جال میں کیا لگا؟

مرزا۔ یہاں جو کچھ لگا وہ آپ کے راؤنڈ ٹیبل والے سفر سے کم ہی ہوگا

علامہ۔ (ہنس پڑنے کے بعد) راؤنڈ ٹیبل والے سفر میں رکھا ہی کیا تھا

مرزا۔ میں آئندہ سال کے اوائل میں جرمنی اور بلجیم جا رہا ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ اس مرتبہ آپ کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے چلوں۔

علامہ۔ (افسردہ ہو کر) اس طویل علالت سے اگر نجات مل جاتی تو شاید میں بھی کہیں جا سکتا۔ سفر کا ارادہ تو میرے دل میں بھی ہے مگر دیکھیں اس کی منظوری کب ملتی ہے۔

مرزا۔ آپ کے دل میں حج کی بہت پرانی خواہش ہے اس لئے اب کے میرے ساتھ یوروپ چلئے

علامہ اب لاہور میں جسم کے بیٹھنے کی کوشش بھی کروگے یا یوں ہی جہاں نوردی میں مشغول رہوگے تمہیں اس مشغلہ سے فراغت ہوتی تو ذرا گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کو وہی پرانی صورتیں اکٹھی کرتے رنگ محفل تو اس میں کیا آئے گا۔ ہاں یارانِ محفل کو پھر ایک نظر اکٹھا دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

راوی۔ میاں شاہ نواز بیرسٹر علامہ کی جوانی کے دوست تھے شباب کا زمانہ دونوں نے اکٹھے گزارا تھا۔

۲ر جنوری ۱۹۳۸ء کی سہ پہر کا واقعہ ہے ایک گاڑی جاوید منزل کے صحن میں داخل ہوئی اور سائبان میں آکے رک گئی۔

ڈرائیور۔ (علامہ سے) میاں صاحب سلام کہتے ہیں۔

علامہ۔ (نذیر نیازی سے) شاہ نواز آتے ہیں فلج سے معذور ہیں کبھی بہت جی چاہتا ہے تو گاڑی میں بیٹھ کر آجاتے ہیں میں بھی پاس جا بیٹھتا ہوں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں میں اپنا چند لمحے مزے میں گزر جاتے ہیں۔

(ملاقات کیلئے میاں صاحب کیساتھ موٹر میں جاتے ہیں۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد حقے کے کش لیتے ہوئے۔)

علامہ۔ (نذیر نیازی کو مخاطب کرکے) پانچ مربعے جو میاں صاحب نے جاوید کے نام کئے تھے (قتل ہیں) ان میں اور پانچ کا اضافہ کر دیا ہے۔

شاہ نواز سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں ہم ایک دوسرے کے نیک بد کو خوب جانتے ہیں بڑے مخلص دوست ہیں۔

٭

راوی۔ جنوری ۱۹۳۸ء کے تیسرے ہفتے کی صبح کا ذکر ہے علی بخش نے ایف سی کالج کے فلسفہ کے استاد ڈاکٹر چکروتی کے آنے کی اطلاع دی۔

چکروتی۔ (رسمی گفتگو کے بعد) پنڈت جی (پنڈت جواہر لال نہرو) سے جب کبھی ذکر آیا انھوں نے آپ سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا وہ آج لاہور آ رہے ہیں میرا جی چاہتا ہے ان کی آپ سے ملاقات ہو جائے آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

علامہ۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ آپ کو جب موقعہ ملے انھیں لے آئیے لیکن دو مسئلے ہیں۔

ایک ہندوستان کی آزادی۔

دوسرا آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ۔

پنڈت جی ان دونوں مسئلوں پر غور کرکے آئیں۔

چکروتی۔ بہت بہتر۔
(اسی روز شام کو)

چکروتی۔ پنڈت جی کو آج فرصت ہے ہم لوگ آٹھ بجے حاضر ہو جائیں گے۔

علامہ۔ بسرو چشم۔ تشریف لائیے۔

چکروتی۔ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوگی یہ وقت شاید آپ کے سونے کا ہے۔

علامہ۔ (ہنس کر) آج ہم ذرا دیر سے سولیں گے آپ حضرات آئیں تو سہی۔

راوی۔ چنانچہ آٹھ بجے کے قریب پنڈت جی آئے۔ ان کیساتھ ڈاکٹر چکروتی، میاں افتخار الدین کے علاوہ چند خواتین بھی تھیں۔

علامہ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "مے لالہ فام" میں پنڈت جی کے جاوید منزل میں آنے کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"ان کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت نہرو نے انھیں ملنے کیلئے آنا تھا۔ ابا جان نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ پنڈت نہرو کے استقبال کیلئے ڈیوڑھی میں کھڑا رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا پنڈت نہرو کون ہیں؟ کہنے لگے جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد ہیں اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔ میں باہر کھڑا پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا جب وہ تشریف

لائے تو میں نے انھیں اسلام علیکم کہا اور انھوں نے
اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا میرے سر پر
ہاتھ پھیرا اور نہایت شفقت سے میری کمر میں بازو ڈال
کر میرے ساتھ اباجان کے کمرہ میں داخل ہوئے۔
اباجان بڑے تپاک سے ملے اور صوفہ پر بیٹھنے کو
کہا۔ لیکن پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار
کیا بالآخر فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ اور اباجان
بستر پر لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔

راوی۔ وہ باتیں یہ تھیں۔

پنڈت نہرو۔ (رسمی گفتگو کے بعد) اگر مسلمان بلا قید شرائط کانگریس
کا ساتھ دیں تو کیا اچھا ہو۔ آزادی کی منزل جلد طے ہو جائے اور
انگریز بھی دیر تک ہمارا راستہ نہ روک سکیں۔

علامہ۔ اگر مسلمان آپ کی بات مان لیں اور بلا قید شرائط کانگریس
کا ساتھ دیں تو آزادی کی منزل کیسے طے ہو جائے گی؟ یہ کیسے ہوگا
کہ انگریز ہمارا راستہ نہ روک سکیں۔

پنڈت نہرو۔ یوں کہ ہم اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ہندو یا مسلمان
باہم شرائط طے کرنے کا خیال چھوڑ دیں۔

علامہ۔ کیسی سرگرمیاں؟

نہرو۔ یہی قانون شکنی اور عدم ادائیگی مالیہ کی مہم۔

علامہ۔ آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ نہ یہ تحریکیں کامیابی سے
جاری رہ سکیں۔ انگریزی فوجیں بدستور ہندوستان میں پڑی ہیں

ان کا اخراج کیسے عمل میں آئے گا۔ رہا انتقالِ اختیارات کا عمل سو یہ ان تحریکوں کے باوجود جاری ہے اور جاری رہے گا یوں آزادی کی منزل کیسے طے ہوگی؟

نہرو۔ انتقالِ اختیارات کا عمل ہی تو اصل چیز ہے ہماری تحریکیں جاری رہیں تو یہ عمل تیز ہو جائے گا۔ ہم نے تھوڑی بہت آزادی تو حاصل کر لی ہے یہ تحریکیں جاری رہیں تو اندرونی طور پر اور بھی آزاد ہو جائیں گے۔

علامہ۔ اور برطانوی فوجیں۔

نہرو۔ ان کا کیا ہے برطانوی فوجیں اگر ہندوستان میں پڑی رہیں تو پڑی رہیں اس میں کیا حرج ہے۔ ہم ان کی موجودگی برداشت کرتے رہیں گے تا آنکہ ایک دن آئے گا جب انگریز خود ہی تنگ آ کر اس ملک سے نکل جائیں گے۔

علامہ۔ تو گویا سوال آزادی کا نہیں ہے سوال اندرونی آزادی کا ہے لیکن اس اندرونی اور بیرونی آزادی کے مسئلے سے قطع نظر یہ تو فرمائیے انگریز اس ملک سے کیوں تنگ آنے لگے وہ اس ملک سے آپ ہی کیسے نکل جائیں گے۔؟

نہرو۔ بہ حالت موجودہ یورپ کی کوئی قوم روسی ہو یا جرمن ۔ فرانسیسی یا اطالوی، ہندوستان کا رخ نہیں کرے گی انھیں خود ہی مشکلات درپیش ہیں حتیٰ کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے جرمنوں کی نظر یورپ پر ہے روس کی افریقہ پر۔ برطانوی اور فرانسیسی سلطنتیں اب اور زیادہ کیا پھیلیں گی امریکہ کو ہندوستان کی ضرورت نہیں امریکہ

ہندوستان سے دور ہے بہت دور، جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں
کرے گا جاپان کی نگاہیں آسٹریلیا پر ہیں لہٰذا جیسے جیسے ہم اندرونی
طور پر آزاد ہوتے گئے اور ہم نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں انگریز
خود ہی اس ملک سے نکل جائیں گے انگریز گئے تو ہم ایک دستور ساز
اسمبلی طلب کریں گے اور یہ دستور ساز اسمبلی ایک اشتراکی آئین نافذ
کردیگی۔

علامہ۔ مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں آپ سمجھتے ہیں
ہندوستان کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں اسے خطرہ ہی خطرہ ہے آپ
کے نزدیک ہندوستان کچھ واقع ہی اس طرح ہے کہ ہمارے لئے چین
ہی چین ہے کوئی ہم پر حملہ نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک حملہ ہوگا اور ضرور ہوگا انگریز
ہندوستان سے نہیں جائیں گے گئے بھی تو ایک زبردست جدوجہد
کے بعد۔

بالفرض ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں اور آپ کے سب مفروضات
درست تسلیم کر لیتے ہیں تو ان کا اور بھی تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات
مان لئے جائیں اور کانگریس ان سے مفاہمت کرلے ہندوستان میں
کوئی تحریک کامیابی سے چل سکتی ہے تو جب ہی کہ اقلیتوں کو اکثریت
پر اعتماد ہو اور تصفیہ حقوق کا مسئلہ طے ہو جائے۔

پنڈت جی کوئی بھی نقطہ نظر ہو کانگریس کا یا لیگ کا، تقاضائے
سیاست بہرحال یہی ہے کہ اس ملک کے باشندوں کو باہم
اعتماد ہو۔

نہرو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) موجودہ حالات میں مفاہمت و

مصالحت کا خیال غلط ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ بغیر یہ سوال اٹھائے مل کر کام کریں۔

علامہ۔ مجھے نہ کانگریس سے دشمنی ہے نہ بلا وجہ لیگ سے اس میں کسی رنجیت کی طرفداری نہیں کر رہا۔ یہ مفاہمت اور مصالحت ہو کر رہے گی یہ تقاضا ہے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یوں ہی نہیں کہہ رہا۔ میں وہی بات کہتا ہوں جسے حق سمجھتا ہوں۔

سنیئے پنڈت جی۔

مسلمانوں کو انگریزوں سے کوئی عشق نہیں وہ ان کے اقتدار سے کچھ زیادہ ہی نالاں ہیں اور اس کے وجوہ شاید آپ بھی سمجھتے ہیں رہی شہنشاہیت (IMPERIALISM) دشمنی سو اگر آپ دلوں کو ٹٹول سکتے ہیں تو ٹٹول لیجئے۔ شہنشاہیت دشمنی میں بھی مسلمان ہندوؤں سے کچھ آگے ہی ہوں گے۔

نہرو۔ اس وقت اصل مسئلہ آزادی کا ہے مفاہمت کا نہیں۔

علامہ۔ اچھا پنڈت جی ایک لطیفہ سنیئے! پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کی کارروائیوں کی روداد اخباروں میں آنے لگی تو ایک روز کچھ مسلمان میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔

درجہ نوآبادیات کیا چیز ہے؟

میں نے کہا۔

یہ ایک قانونی اصطلاح ہے جس کے سمجھنے اور سمجھانے میں وقت لگے گا۔ کہنے لگے اچھا اتنا بتا دیجئے کہ درجہ نوآبادیات

مل گیا تو کیا ہم آزاد ہو جائیں گے۔

میں نے کہا۔

" نہیں۔ "

کہنے لگے۔

تو پھر اس سے فائدہ آپ ہمارے لیڈروں کو سمجھا دیجئے بیکار جلسے نہ کریں۔ یہ لوگ نہ خود سوتے ہیں نہ ہمیں سونے دیتے ہیں۔

میاں افتخار الدین۔ بات ہے بھی یہی جو آپ کہتے ہیں مسلمان بھی آزادی وطن کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے ہندو وہ سامراج کے لیے ہی دشمن جیسے کوئی اور۔

آپ حق بات کیوں نہیں کہہ دیتے ؟ مسلمانوں پر آپ کا اثر ہے جناح کی کون سنتا ہے۔

علامہ۔ مجھے یہ کہنے میں (کہ مسلمان صرف آزادی کے طالب اور شہنشاہیت کے دشمن ہیں)، کیا عذر ہے ؟ لیکن مشکل یہ کہ جناح تو حق بات سن لیتے ہیں نہیں سنتی تو کانگریس۔

کیا کانگریس فی الواقع آزادی کی خواہاں ہے انھیں معنوں میں جن میں مسلمان کیا ہندو سچ مچ استعمار اور شہنشاہیت کے دشمن ہیں جیسے مسلمان۔

میاں صاحب اس امر سے تو شاید آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے کوئی بھی جماعت ہو اس میں باہم اتحاد ہونا چاہیئے کیا یہ کوئی دل پسند بات ہے کہ مسلمانوں کا تفرقہ و انتشار قائم رہے پھر جب اتحاد ایک ضروری امر ہے اور جناح کی قیادت سے تھوڑا

بہت اتحاد پیدا ہو گیا ہے تو اسے کیا اس لئے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک قوم متحد ہو جائیں۔

معاف کیجئے میں اس کیلئے تیار نہیں اس اتحاد کو کانگریس کی رضا جوئی یا ہندوؤں کی خوشنودی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

(رسمی اختتامی کلمات کے ساتھ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھی رخصت ہو جاتے ہیں)

ٹ

راوی۔ پنڈت نہرو سے علامہ کی ملاقات کو اخبارات نے بڑی شہرت دے دی تھی مختلف قسم کے بیانات گردش کر رہے تھے اس واقعہ سے کوئی ایک ہفتہ بعد میاں بشیر کی موجودگی میں نذیر نیازی نے علامہ سے پوچھا

نذیر۔ پنڈت جی سے ملاقات کیسی رہی؛ کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔

علامہ۔ نہیں بس یہی سیاست حاضرہ پر تبصرہ ہوتا رہا وہ بھی سرسری طور پر کوئی خاص مسئلہ زیر بحث نہیں آیا۔

نیازی پھر بھی پنڈت جی کی فکر کا رخ کیا تھا؟

علامہ۔ پنڈت جی کی منطق بھی وہی ہے جو گاندھی جی کی، دونوں کی نظر انتقالِ اختیارات پر ہے دونوں کے نزدیک آزادی کا مطلب ہے اندرونی آزادی دونوں کا خیال ہے برطانوی فوجیں اگر . . . . .

ہندوستان میں پڑی ہیں تو پڑی رہیں اس سے

ملک کی آزادی میں فرق آتا ہے نہ ان کی شہنشاہیت دشمنی میں۔

... دراصل کانگریس اور حکومت کی ساری لڑائی دو بنیوں کی لڑائی ہے۔ کانگریس اسے ایک بات سمجھانا چاہتی ہے جسے وہ سمجھتی تو ہے لیکن مانتی نہیں۔ مان سکتی ہے اور مانے گی مگر بتدریج۔ اس لئے حاکم آخر حاکم ہے اور محکوم آخر محکوم، کانگریس چاہتی ہے اندرونی طور پر زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ انگریزی فوجیں اگر ہندوستان میں رہ بھی جائیں تو کیا مضائقہ ہے یوں ہندوستان کی حفاظت ہوتی رہے گی۔

سارا جھگڑا اسی سودے بازی کا ہے مگر ہیں دونوں بنیئے سودا ہو تو کیسے ہو؛ دونوں چاہتے ہیں سودا ہو جائے مگر ہر ایک کی کوشش ہے کہ ہاتھ اوپر رہے ..... میں نے پنڈت جی کو صاف بتا دیا کہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک کامیابی سے چل سکتی ہے تو جب ہی کہ اقلیتوں کو اکثریت پر اعتماد ہو اور تصفیہ حقوق کا مسئلہ طے ہو جائے لیکن پنڈت جی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

نیازی۔ تعجب ہے پنڈت جی آپ سے ملنے آئیں، آپ سے گفتگو کریں سوال آزادی کا ہو اور وہ آپ کی بات کا جواب نہ دیں۔

علامہ۔ پنڈت جی اس زعم میں ہیں کہ حکومت اور کانگریس میں چونکہ آخر کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا لہٰذا مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

(میاں شبیر احمد گفتگو میں شریک ہو جاتے ہیں)

میاں شبیر۔ میں نے سنا ہے آپ نے پنڈت جی سے فرمایا تھا کہ پنڈت جی بات اصل میں یہ ہے کہ آپ تو محب وطن ہیں لیکن جناح قانون داں یا شاید یہ کہ جناح سیاست داں ہیں آپ محب وطن، یہ بات ویسے

تو ٹھیک معلوم نہیں ہوتی لیکن اندیشہ ہے لوگوں میں اس کا چرچا ہوا تو
مخالفین اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں ہماری کوئی صحافت نہیں
ہے نہ کوئی مرکزِ اطلاعات اور نشر و اشاعت یوں لیگ اور جناح کے
خلاف غلط پروپیگنڈا ہوگا۔

علامہ۔ فرض کیجئے میرے الفاظ کا وہی مطلب ہے جو بقول آپ
لوگوں نے سمجھا اس میں کیا مضائقہ ہے میں نے تو ایک سیدھی سی
بات کہی تھی اور سیہ وہ یہ کہ جناح سیاست دان ہیں لیکن پنڈت جی محبِ وطن
اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جناح میں حب الوطنی کی کمی ہے
یا یہ کہ نہرو سیاست دان نہیں ہیں۔ میرا کہنا تو یہ تھا کہ پنڈت نہرو
کی نظر حقائق پر نہیں جیسا کہ ایک سیاست دان کی ہونی چاہیئے وہ
جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں گو بہ سبب جذبہ الوطنی لیکن یہ امر
سیاست کے منافی ہے برعکس اس کے جناح سیاستدان ہیں ان کا
مزاج قانونی ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں ہندوستان کا اصل مسئلہ
کیا ہے اور یہ بھی کہ ہندوؤں اور انگریزوں میں جو کشمکش جاری
ہے اس کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کر رہے کہ حب الوطنی
کے جوش میں واقعات سے آنکھ بند کر لیں۔ حقیقت میں وہ بھی
محب الوطن ہیں۔[1]

راوی۔ اقبال نہرو ملاقات کی یہ تفصیل سید نذیر نیازی کی کتاب

---

[1] اقبال کے حضور ص ۱۰۲

" اقبال کے حضور " پر مبنی ہے۔

اس ملاقات کا تذکرہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے " اقبال کے آخری دو سال " میں راجہ حسن اختر کے حوالے سے کیا ہے۔ جو بقول ان کے ملاقات کے وقت جاوید منزل میں موجود تھے۔ راجہ صاحب کی روایت کے مطابق اس ملاقات میں یہ گفتگو بھی ہوئی۔

علامہ۔ چونکہ آپ سوشلزم کا شدت سے پرچار کرتے رہتے ہیں اور انڈین نیشنل کانگریس کے گزشتہ دو اجلاسوں کی صدارت کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے۔ سوشلزم کے بارے میں کانگریس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں۔

پنڈت نہرو۔ نصف درجن کے قریب۔

علامہ۔ خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد نصف درجن ہے۔ ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں۔ تو کیا دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں۔

پنڈت نہرو۔ (خاموش اس کا کوئی جواب نہیں دیتے کچھ توقف کے بعد) ہندو مسلم کشیدگی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

علامہ۔ مغربی ایشیا دراصل اسلامی ایشیا ہے اور آئندہ سیاسیاتِ عالم میں مغربی ایشیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی اگر ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا اور انھیں ناراض کر لیا تو خود مغربی ایشیا کے ساتھ ان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے

اس لئے ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں تاکہ مغربی ایشیا کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے رہیں۔

میاں افتخار (دخل در معقولات کے انداز میں) ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔

علامہ۔ (یکایک غصے میں آکر لیٹے سے بیٹھتے ہوئے انگریزی میں) اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں
"مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ اور میں تو اُن کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔"

راوی۔ ڈاکٹر بٹالوی لکھتے ہیں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدّر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بلیسود ہے چنانچہ وہ اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔

راوی۔ زندگی بھر وہ میانہ رو، اعتدال پسند اور عافیت کوش رہے تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری سالوں میں گرتی ہوئی صحت کے باوجود علاؐ کے اندر ایک شدید جذبہ سرفروشی پیدا ہو گیا تھا وہ عملی جہاد کرنے کیلئے بیتاب نظر آتے تھے۔

مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے علامہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو قائد اعظمؒ کو لکھتے ہیں

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے ذاتی طور پر میں ایک ایسے مسئلہ کی خاطر جس کا تعلق اسلام اور ہندوستان سے ہے، جیل جانے کو تیار ہوں۔"

جب ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور ہائی کورٹ نے مسجد شہید گنج کی اپیل خارج کر دی تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکلنا شروع ہوئے اسی شام غلام رسول خان بیرسٹر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

غلام رسول خان۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟

علامہ (رو پڑنے کے بعد) مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور اس طرف لے چلو جدھر مسلمان جا رہے ہیں اگر گولی چلی تو میں بھی ان کے ساتھ مروں گا۔

راوی۔ مسجد شہید گنج کی اپیل مسترد ہوئے دوسرا دن تھا فیصلہ کی ناانصافی سے مسلمان بڑے برافروختہ تھے مولانا ظفر علیخاں علامہ سے مشورہ کے لئے جاوید منزل آئے تھے ان کے جانے کے بعد نذیر نیازی سے علامہ کی یہ گفتگو ہوئی۔

نیازی۔ موجودہ حالات میں آپ کی رائے کیا ہے؟

علامہ۔ ابھی مولوی صاحب اُٹھ کر گئے ہیں پوچھتے تھے اب کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ قانون شکنی کی تحریک عام کر دی جائے بلکہ اس میں سارا ہندوستان شریک ہو۔ یوں مسجد تو شاید

نہ ملے لیکن یہ تو ظاہر ہو جائے کہ مسلمان اپنے حقوق کیلئے ایجی ٹیشن کرنا جانتے ہیں۔

نیازی۔ ایجی ٹیشن ؟

علامہ۔ مسجد کی قربانی اگر مسلمانوں کے لئے زندگی کا وسیلہ بن جائے تو کیا بُرا ہے ایجی ٹیشن ہوا تو ہو سکتا ہے اس سیلاب میں کچھ خس و خاشاک بھی بہہ جائیں۔

نیازی۔ ایجی ٹیشن ہو سکے تو بہت ممکن ہے مسجد بھی مل جائے۔

علامہ۔ کیوں نہیں، لیکن ضرورت بہرحال ایجی ٹیشن کی ہے اس امر کی کہ مسلمان ایجی ٹیشن کرنا سیکھیں۔

نیازی۔ ہائیکورٹ کے فیصلے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟

علامہ۔ ہائی کورٹ کا فیصلہ سراسر غلط ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس میں قانون سے بڑھ کر سیاسی مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انگریزی حکومت کا زوال ہو چکا ہے۔ یہ صرف زوال پذیر حکومتیں ہیں جو عدل و انصاف کو چھوٹی چھوٹی مصلحتوں پر قربان کر دیتی ہیں۔

صحیح فیصلہ وہی ہے جو جسٹس دین محمد کا ہے ان کی اختلافی رائے بالکل صحیح ہے۔

حکومت بظاہر قانون کی آڑ لے رہی ہے لیکن قانون کے پردے میں ایک بہت بڑا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھوں کو مضبوط کرے ہندوؤں کیلئے بھی کسی توڑ کی ضرورت ہے۔

بہرحال جو حکومت کر رہی ہے وہ نہ قانون ہے نہ سیاست، جو حکومت کسی قوم کے مذہبی جذبات اور معابد کا احترام نہ کرے۔ وہ حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

سکھ مغلوں کے دشمن تھے مغل حکومت کمزور ہوئی تو اسی لاہور میں انھوں نے سالہا سال حکومت کی شاہی مسجد کی بے حرمتی کس کس طرح نہیں ہوئی۔ شہید گنج کے نام سے گردوارہ بھی تعمیر کر لیا گیا۔ لیکن مسجد سے تعرض نہیں ہوا۔ حالاں کہ سکھ چاہتے تو اُسے منہدم کر سکتے تھے لیکن اس انگریزی حکومت کو دیکھئے کہ مساجد اور معابد کے احترام کی یقین دہانی کے باوجود قانون اور انصاف دونوں کا خون کر رہی ہے۔

یہ جو کچھ ہے حکومت کی حیلہ سازی ہے حکومت کی حیلہ سازیوں کا کیا کہنا۔

بسمارک نے ایک جھوٹی خبر دے کر فرانس اور جرمنی میں جنگ چھیڑ دی۔ اس کا کہنا تھا اگر ایک جھوٹ سے جرمن قوم متحد ہو جائے تو اس میں کیا گناہ ہے مگر لوگ تھے کہ اس کے محل کے اردگرد جمع ہو جاتے اور دستور کا مطالبہ کرتے۔ بسمارک نے جب یہ دیکھا تو ایک روز تنگ آ کر کہنے لگا۔

"احمقو! میں تمہیں سلطنت دے رہا ہوں تم دستور دستور چلّاتے ہو۔"

راوی۔ مسجد شہید گنج کی اپیل خارج ہو نے کے بعد بعض مسلمان اخبار کی منافقانہ حرکتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔

علامہ۔ مسلمان بھئی کیا سادہ لوح ہیں اور انھیں ہمدرد بھی ملے ہیں تو کیسے بیدرد کیسے شاطر؟

تعجب ہے ان لوگوں کی منافقت پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ان میں بعض کی منافقت میں خلوص بھی ہے کیسے مخلص منافق ہیں یہ لوگ[1]

ؔ

راوی۔ علامہ بات کے کھرے تعلقات کے کھرے انسان تھے اتفاق تو کھلم کھلا اور اختلاف تو وہ بھی دو ٹوک، منافقت اور مداہنت سے قطعاً مبرا تھے۔ لیکن یہی وہ صفت تھی جس سے وقت کے نام نہاد مسلم زعماء بڑی حد تک عاری تھے۔ مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد کا ذکر ہے کہ بعض مسلم زعماء در پردہ انگریزوں سے بھی ساز باز کر رہے تھے اور بظاہر مسلمانوں کے ہمدرد رہنما بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ چند دوسرے سر برآوردہ لوگوں کے ساتھ ایک وفد کی صورت میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اراکینِ وفد۔ ہم آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ مسجد کی شہادت کے الم ناک حادثے کے بعد آپ کی رہنمائی حاصل کر سکیں اور مسجد کی واگزاری کیلئے ضروری اقدامات کر سکیں۔ آپ ہمیں قیمتی مشوروں سے نوازیں۔

علامہ۔ بھئی یہ کیا غضب ہے کہ ایک طرف تو گرانے والوں کی پشت پناہی

---

[1] ملفوظاتِ اقبال

کرتے ہو اور پھر دوسری طرف مجھ سے مسجد کی واگزاری کیلئے مشورہ طلب کرنے بھی آتے ہو و اذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا ۔۔۔ معکم (بقرہ ۱۴) اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

؂

راوی۔ ۵ فروری کی شام بتی کانگریس کی مجلس عاملہ کی اس قرارداد کا ذکر تھا کہ پنڈت نہرو اور گاندھی جی قائداعظم سے خط و کتابت کریں۔

علامہ۔ میں نے جناح کو لکھ دیا ہے کہ تین باتوں پر خاص طور سے زور دیں۔

(۱) آئینی تحفظات

(۲) سندھ کا الحاق پنجاب سے

(۳) اور شخصی اور دیوانی قوانین کی برقراری۔

؂

راوی۔ ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء کو حکومت پنجاب کے سیکرٹری مسٹر ہیوم ملاقات کیلئے آئے۔

مسٹر ہیوم غزالی کو پڑھ رہا ہوں کسی صوفی بزرگ کا پتہ دیجئے۔

علامہ۔ یہ تو ذرا مشکل سی بات ہے ہماری عمر گزر گئی کوئی فرد کامل نہ ملا۔

مسٹر ہیوم۔ پروفیسر میسے نون نے خود مجھ سے کہا کہ اگر میں حلاج کی تحریریں نہ پڑھتا تو دہریہ ہو جاتا۔

علامہ۔ (ہنستے ہوئے) ہمارا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ لیکن ہماری دستگیری رومی نے کی۔ آپ غزالی پڑھ رہے ہیں۔ آپ یہ بات غزالی سے حاصل کیجئے۔

راوی۔ نذیر نیازی حسب دستور علامہ کی خدمت میں حاضر تھے اور خواجہ عبدالحمید بھی موجود تھے۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کا اخبار ان کے سامنے پڑا تھا۔

علامہ۔ کوئی خبر ہے؟

نیازی۔ خبر تو کوئی نہیں ہے بجز اس کے کہ کہیں بلوہ ہو جاتا ہے۔ (صوبوں میں کانگریسی حکومت قائم ہو چکی تھیں)

علامہ۔ آج باجے کا سوال ہے کل قربانی کا جھگڑا ان سب باتوں کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بربنائے قومیت کوئی اتحاد ممکن نہیں۔

ہندو قومیت کا وجود بھی برائے نام ہے اگر آج ہندوؤں میں مہاراشٹر کی علیحدگی کا خیال پیدا ہو رہا ہے تو آپ لوگ دیکھیں گے کہ کل اتحاد بنگال کا مطالبہ ہوگا۔

نیازی۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ از روئے سیاست ہندوستان میں صرف مسلمانوں ہی کی حیثیت ایک قوم کی ہے۔

علامہ۔ بیشک ہندو ایک قوم نہیں ہے بلکہ کئی ایک قوموں کا مجموعہ

اتحادِ ہند کا خیال بیرونی حملوں سے ڈر کا پیدا کردہ ہے جب تک یہ ڈر باقی ہے اتحاد کی کوششیں جاری رہیں گی۔ لیکن جس طرح یوروپ کا اتحاد بالآخر ٹوٹا۔ ہندوستان کی تقسیم بھی یقینی ہے۔ اکبر کی کوشش تھی کہ ہندوستان متحد ہو جائے مگر اس سے اور زیادہ افتراق پیدا ہوا۔

عالمگیر کو بھی اس کوشش میں ناکامی ہوئی ایک کوشش وطنی تھی دوسری سیاسی۔

یوروپ کی تقسیم کی ابتدا لوتھر سے ہوئی لوتھر کے ہاتھوں جب کلیسا کی سیادت ختم ہوئی تو اس سیاست کا بھی خاتمہ ہو گیا جس نے یوروپ کو متحد کر رکھا تھا۔ لہذا قدرتی بات تھی۔ اقوام یوروپ کو کسی نئی اساس سیاست کی جستجو ہوئی۔ اس جستجو نے ان کی توجہ وطن اور نسل کی طرف منتقل کر دی۔ آخر الامر زمین اور رنگ بنائے سیاست ٹھہری۔ یوں جغرافیائی قومیت اور وطنیت کا ظہور ہوا قومیں اور ملک وجود میں آئے اور مذہب ایک امر ثانوی ہو گیا۔ لیکن قوموں اور ملکوں کا وجود جب ہی قائم رہتا کہ ان کی طاقت غیر متوازن نہ ہونے پاتی۔ لہذا اقوام یوروپ برابر اس کوشش میں لگی رہیں کہ جس طرح بھی بن پڑے ایک دوسرے کے درمیان توازن قائم رکھیں بایں ہمہ توازن قوت باقی نہ رہا۔ اس کی وجہ تھی اقوامِ یوروپ کی نسلی اور جغرافیائی عصبیتیں ان کی ہوس استعمار اور جوع الارض جس میں انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی لہذا ان کی باہمی آویزش ایک کے بعد دوسری لڑائی اور آخر الامر جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا تو دہریت

نے سر اٹھایا۔
ہندوستان کو بھی ان مراحل سے گزرنا ہوگا۔

خواجہ عبدالوحید۔ ڈاکٹر صاحب اب صحت کا کیا رنگ ہے؟

علامہ۔ چار برس تو کسی نہ کسی طرح گزر گئے اب پانچواں برس ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے؟
حکیم فقیر محمد مرحوم نے عرصہ ہوا مجھے دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی چیزوں کے استعمال سے روک دیا تھا لیکن میں نے اس وقت اس بات کا مطلق خیال نہ کیا۔

راوی۔ فروری ۱۹۳۸ء کے آخری دن تھے حکیم محمد حسن قرشی اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ اپنی کوشش کر رہے تھے لیکن علامہ کی صحت سنبھل نہیں رہی تھی بے آرامی بھی تھی۔
علامہ نے پہلے دیوان علی سے کافیاں سنیں پھر سید نذیر نیازی سے کہا کہ کوئی افسانہ سنائیں۔ انھوں نے الف لیلہ میں سے بغداد کے حجام کا قصہ سنایا تو علامہ بہت محفوظ ہوئے۔ الف لیلی کے انداز داستان گوئی سے مغرب نے جو اثر قبول کیا اس کا ذکر آگیا۔ پھر مسلمانوں کے ماضی اور ان کی تہذیب و معاشرت کی باتیں شروع ہوگئیں۔

علامہ۔ مسلمانوں کی زندگی کیسی شگفتہ تھی۔ انھوں نے حتی الوسع اسے ہر آلائش سے پاک رکھا وہ اس سے لطف اٹھانا اور اس میں حسن و جمال طاقت اور قوت کے جو لامتناہی امکانات موجود ہیں ان کی قدر کرنا خوب جانتے تھے۔
(آہ بھر کر، مسلمانوں کا زوال کتنا حسرتناک ہے۔

(تھوڑے توقف کے بعد ، مسلمانوں میں کیا ایسا کوئی افسانہ نگار نہیں
جو افسانوں افسانوں میں پتے کی بات کہہ جائے شرر کے افسانوں سے بیشک
تاریخ میں دل چسپی پیدا ہو گئی ۔ لیکن ضرورت ہے پتے کی بات کہنے کی ۔

❊

راوی۔ مارچ ۱۹۳۸ کی شروع تاریخیں تھیں عجمی تصوف ، وحدت ادیان کا
تصور ، ملت اسلامیہ کے جداگانہ وجود کی نفی کے خیالات زیر بحث تھے
کہ حکیم قرشی نے نبض دیکھی ۔

حکیم قرشی۔ اب مزاج کیسا ہے ؟

علامہ۔ بلھے شاہ کا ایک مصرع ہے ۔
سچ آکھاں تے بانبڑ مچدا اے
اس پر والد ماجد نے کہا ۔
جھوٹھ آکھاں تاں کجھ بچدا اے
...... جی چاہتا ہے سب کچھ کہہ ڈالوں مگر کیسے اور کس سے ؟

❊

راوی۔ مارچ ۱۹۳۸ء کے آواخر میں علامہ کے تیمارداروں نے
طے کیا کہ ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا جائے ڈاکٹر الٰہی بخش کا انتظار
تھا ۔ عام باتیں ہو رہی تھیں
یکایک علامہ خاموش ہو گئے پھر فرمایا ۔

علامہ۔ خواب تھا یا کیا رات میں نے دیکھا کوئی مولوی ہے اور کسی قبر کے

چڑھاوے سے مجھے تازہ اور نہایت اچھا کھانا پیش کر رہا ہے لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔

حکیم قرشی۔ تعبیر بہرحال اچھی ہے کہ آپ نے پیش کش سے انکار کیا۔

راوی۔ ۷۔ مارچ ۱۹۳۸ء کی رات کو علامہ کو بڑی تکلیف تھی درد بھی تھا اور دمے کی شکایت بھی۔ نہ صرف علی بخش اور منشی بلکہ حکیم قرشی بھی بدن داب رہے تھے اسی حالت میں بار بار یا اللہ کہتے ایک بار بڑی دلسوزی سے کہا۔

علامہ۔ مجھے صحت ہو جائے تو جہاد بالسیف کروں۔

راوی۔ مارچ ۱۹۳۸ء سے علامہ کی صحت خطرناک حد تک خراب ہو گئی پیروں اور چہرے پر ورم کے آثار نمودار ہونے لگے تھے دل پھیل گیا تھا دم کشی کی شکایت اپنی جگہ تھی۔ ۷ مارچ کو علامہ کے پرانے نیاز مند غلام رسول مہرؔ اور عبد المجید سالکؔ عیادت کو حاضر ہوئے تو بظاہر صحت قدرے بہتر معلوم ہوتی تھی۔

مہرو سالکؔ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب تو آپ کی صحت قدرے بہتر نظر آتی ہے۔

علامہ۔ اب تو کمرے کے اندر تھوڑا سا چل پھر بھی لیتا ہوں۔

مہرو سالکؔ اللہ کے فضل سے چند روز بعد آپ کوٹھی کے صحن میں چہل قدمی کر سکیں گے۔

علامہ۔ (اطمینان سے بلکہ قدرے مسکرا کر) میں موت سے نہیں ڈرتا — بلکہ خندہ پیشانی کے ساتھ موت کی پیشوائی کرنے کو تیار ہوں۔

سحرہا در گریباں شب اوست
دو گیتی را فروغ از کوکب اوست!
نشانِ مردِ مومن با تو گویم!!
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

راوی۔ علامہ نے اپنی رباعی کا یہ شعر مومن کی نشانی یہ ہے کہ جب موت آتی ہے تو تبسم اس کے لبوں پر ہوتا ہے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں باربار دہرایا۔ انتقال سے چند روز پیشتر ایک جرمن عالم ملاقات کیلئے آیا تو اس سے بھی یہی کہا تھا۔ وفات سے چند لمحے پیشتر راجہ حسن اختر کو تین چار روز پہلے کہی ہوئی یہ رباعی سنائی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ نیاید!
نسیمے از حجاز آید کہ نیاید!
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ نیاید[1]!

ث

راوی۔ علامہ کی زندگی کے آخری دنوں کی بات ہے نذیر نیازی اور حکیم محمد حسن قرشی حاضرِ خدمت تھے۔ علامہ کی طبیعت سخت مضمحل تھی یکایک فرمایا۔

---
[1] اقبال کے حضور ص ۱۴۲

علامہ۔ نیازی صاحب تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ سنایئے

(نیازی صاحب اندلس سے متعلق کچھ واقعات سناتے ہیں)

علامہ۔ اسپین کو اسلامی تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے لیکن اسپین کی تاریخ ابھی تک پردہ خفا میں ہے۔

اسپین کیا مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں

یہ شعر و شاعری کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

کاش میں نے شاعری نہ کی ہوتی۔

حکیم قرشی۔ لیکن آپ نے تو شاعری کے پردے میں وہ سارا کام کر ڈالا جو فلسفیوں، اور مؤرخوں علماء اور فقہا کے کرنے کا تھا آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ آپ نے شاعری نہ کی ہوتی۔ ہمیں تو اس شاعری پر ناز ہے حتیٰ کہ وہ جو کہا گیا ہے۔ ؎

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

غالبؔ نے آپ ہی کیلئے کہا تھا۔

علامہ۔ (تبسم فرمایا۔ لیکن خاموش رہے) .....

(کچھ دیر آنکھ لگنے کے بعد دفعتاً اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے گلوگیر آواز میں)

تہنیت گوئید مستاں را سنگ محتسب

بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت

(دوسرا مصرع ادا کرتے کرتے اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی)

راوی۔ علامہ کی دنیوی زندگی کے آخری دنوں کی بات ہے کہ حکیم محمد حسن قرشی

دوا دے کے گئے تو صوفی تبسم سے علامہ یونانی علاج کا تذکرہ کرنے لگے۔

علامہ۔ جس قدر ان لوگوں کا طریق علاج افسردہ کر دیتا ہے اسی قدر ان کی بعض دوائیں شگفتگی اور انبساط پیدا کرتی ہیں میں ہمیشہ سے ان کا قائل ہوں مگر اب کے تو یقین ہو گیا ہے کہ ان دوائیوں میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ انسان تندرست ہو نہ ہو ذہنی طور پر صحتیاب ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ کم بخت مرض کی تلخی کو بھی خوشگوار بنا دیتی ہیں۔ شاید اتنے شدید مرض کے بعد میرے زندہ رہنے کی یہی وجہ ہے۔
(..... یکلخت خاموش ہو جاتے ہیں لمحہ بھر بعد اُٹھتے ہوئے)
یہ لوگ کہتے تو ہیں کہ میں تندرست ہو رہا ہوں لیکن یہ خواب اب ختم ہوتا نظر آتا ہے۔
(علی بخش دروازہ میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔)

صوفی تبسم۔ کیوں روتے ہو کوئی فکر کی بات نہیں۔

علامہ۔ (لیٹ کر آنکھیں بند کر کے) اسے مت روکو آخر ۳۵ سال کا ساتھ ہے جُدا ہوتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے[1]

☆

راوی۔ ۱۹۳۸ء میں پنجاب ضلع پٹھانکوٹ میں جمال پور کے

---

[1] ماہِ نو اقبال نمبر ص ۳۶۶

مقام پر ایک دین دار صاحب جائداد مسلمان چودھری نیاز علی نے ایک وسیع وقف قائم کیا تھا اس وقف کے سلسلہ میں چودھری نیاز علی علامہ سے مشورہ کرنے کیلئے علامہ کی وفات سے چند ہفتے پہلے حاضر ہوئے مشہور نومسلم انگریز علامہ محمد اسد بھی ان کے ساتھ تھے چودھری صاحب اور علامہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

نیاز علی۔ میں نے جمال پور میں ایک وقف دارالسلام کے نام سے قائم کیا ہے۔

علامہ۔ اس کا کوئی مقصد آپ کے ذہن میں ہوگا۔؟

نیاز علی۔ مقصد تو یہ ہے مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

میری یہ خواہش ہے کہ آپ اس کام میں رہنمائی فرمائیں آپ کے مشورے کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جائے۔

علامہ۔ دینی مدارس کی تو کوئی کمی نہیں ایک عام قسم کے درس نظامی کے مدرسے کو کھول دینے سے تو کچھ زیادہ حاصل نہ ہوگا بہتر ہوگا کہ آپ اس وقف سے کوئی اور کام لیں۔

نیاز علی۔ آپ ہی فرمایئے کہ اس وقف سے کیا کام لیا جائے۔

علامہ۔ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔

بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اور اسکی وجہ وہ سیاسی و اجتماعی مسائل ہیں جنھوں نے موجودہ زمانے

میں ایک خاص شکل اختیار کرلی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔

نیاز علی۔ علامہ صاحب، اکابر علماء کا تو دارالسلام آنا محال نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

علامہ۔ یہ ٹھیک ہے مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں نئے اور پرانے تعلیمیافتہ سب ہی شامل ہیں ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے۔

(محمد اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں نہ یہ اس کام کو ہاتھ میں لیں۔

نیاز علی۔ اسد صاحب ضرور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے مگر اس کام کیلئے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے۔

علامہ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں جہاں تک کچھ اور لوگوں کو جمع کرنے کا تعلق ہے شاید میں نام تجویز کرسکوں۔ سرِدست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔

نیاز علی۔ کون سا۔

علامہ۔ حیدرآباد دکن سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔

آپ کیوں نہ اُنھیں دارالسلام آنے کی دعوت دیں میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔

نیاز علی: بہت بہتر، بہت بہتر انشاءاللہ ان ہی کو دعوت دی جائے گی۔

راوی: چنانچہ علامہ اور چودھری نیاز علی کی گفتگو کے حوالے سے سید نذیر نیازی نے مولینا مودودی کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جو انھوں نے قبول کر لی۔ چودھری نیاز علی نے ان کیلئے جملہ انتظامات کر دیئے۔ ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو ۱۹۳۸ء کو مولانا پٹھانکوٹ پہنچے چند روز بعد علامہ کا انتقال ہوگیا اور مودودی صاحب کی یہ خواہش کہ علامہ سے مل کر اس کام کے بارے میں مفصل گفتگو کی جائے پوری نہ ہو سکی۔ (اوراق گم گشتہ ص ۸۲)

راوی۔ بقول علی بخش صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت العمر علامہ کا معمول رہا۔ چراغ حسن حسرت نے علی بخش سے روایت کی ہے کہ آخری دنوں میں گلہ بیٹھ جانے سے قرآن پڑھنا چھوٹ گیا اور نماز بھی کم پڑھتے تھے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔

علامہ۔ علی بخش میرا جی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں۔

علی بخش۔ آپ پلنگ پر بیٹھ جایئے میں وہیں آپ کو وضو کرائے دیتا ہوں۔

علامہ۔ یہ ٹھیک ہے۔

علی بخش: میں نے مہر صاحب کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے دیکھا ہے نہ جانے کیا بات ہے؟

علامہ۔ ہاں۔ مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے[1]

۵

راوی۔ علامہ کی علالت کے آخری دنوں میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سیّد نذیر نیازی اور ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ جاوید منزل جا پہنچے تو یہ گفتگو ہوئی۔

صوفی تبسم قبلہ آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا کیا ارشاد ہے؟

علامہ۔ (کچھ تامّل کے بعد) ہاں یاد آیا وہ نوجوان کہاں ہے جس نے مجھے نظمیں سنائی تھیں۔ وہ پھر آسکتا ہے؟ (اشارہ سراج نظامی کی طرف تھا)

صوفی تبسم کیوں نہیں جب بھی آپ فرمائیں گے حاضر ہو جائے گا۔

علامہ اُسے ضرور بلایئے اور جلد بلایئے مجھے اس کا گانا بہت پسند ہے۔

تاثیر کم بخت کی آواز میں کتنا سوز ہے اور پھر پڑھا لکھا آدمی بھی ہے۔

علامہ۔ پڑھے لکھے تو خیر اور بھی ہیں وہ اس طرح شعر پڑھتا ہے جیسے خود بھی محسوس کر رہا ہو۔ اس کی آواز دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے پھر اسے فارسی اردو پنجابی سبھی نظمیں یاد ہیں۔ اس روز عرشی کی جو پنجابی نظم اس نے سنائی تھی بہت خوب تھی۔ میں عرشی کو محض مولوی سمجھتا رہا یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے سینے میں بھی

---

[1] حیاتِ اقبال ص ۴۸

ایک دردمند دل نے اچھی نظم لکھی۔ (آہستہ آہستہ یہ مصرعے گنگناتے ہیں)

اساں ہنجواں ہار پرونا دُکھ تینوں نہیں اودسنا
ترے سامنے بیٹھ کے رونا دُکھ تینوں نہیں اودسنا
(ہم آنسو کا ہار پروئیں گے لیکن تمہیں اپنا دکھ نہیں بتائیں گے
ہم تیرے سامنے بیٹھ کے روئیں گے لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ ہمیں کیا دکھ ہے ؟)

صوفی تبسم ۔ پنجابی شاعری کا اپنا حُسن ہے ۔

علامہ ۔ پنجابی ہماری مادری زبان ہے اس میں جو بات پیدا ہوسکتی ہے وہ کسی اجنبی زبان میں ممکن نہیں، اس زبان کو جب کبھی بڑا شاعر ملا تو اس نے شاہکار پیدا کیا ۔

صوفی تبسم جیسے وارث کی ہیر، فضل شاہ کی سوہنی مہینوال، ہاشم شاہ کے دوہڑے اور خواجہ غلام فرید چاچڑاں والے کی شاعری ۔

علامہ ۔ افسوس کہ خواجہ صاحب کی شاعری ایک علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی ۔ ان کا کلام ایک گہرے مطالعہ کا محتاج ہے مجھے تو اس میں بین الاقوامی حیثیت و اہمیت کے عناصر نظر آتے ہیں ۔

ﭼ

راوی ۔ علامہ کی ارضی زندگی کی آخری رات تھی ان کی چارپائی گول کمرہ میں بچھی تھی ۔ ڈاکٹروں کا بورڈ ابھی ہو کے گیا تھا ۔ جنھوں نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات بھاری ہے ۔ علامہ کے احباب اور عقیدت مند فکرمند

اور اداس ادہر اُدہر کھڑے تھے۔ لیکن خود علامہ کے نہ صرف ہوش و حواس قائم تھے بلکہ وقفے وقفے سے اپنے پرانے انداز میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ چودھری محمد حسین کے علاوہ م۔ش، راجہ حسن اختر بھی موجود تھے کوئی نو بجے کے قریب جاوید کمرہ میں داخل ہوئے تو پہچان نہ سکے۔

علامہ۔ کون ہے؟

جاوید۔ میں ہوں۔

علامہ۔ میں کون؟

جاوید۔ جاوید۔

علامہ۔ (ہنس کر) جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔

علامہ۔ چودھری صاحب

چودھری محمد حسین جی۔

علامہ۔ چودھری صاحب اِسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجیے گا۔

چودھری محمد حسین بہت بہتر۔

*

راوی۔ رات کے پچھلے پہر تھوڑی دیر کیلئے علامہ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر اُٹھ بیٹھے اور بے چینی شروع ہوئی۔ تین کا گھنٹہ بجا تو علامہ نے م۔ش کو آواز دی۔

علامہ شفیع جی

م۔ش۔ جی فرمایئے۔

علامہ۔ حکیم قریشی صاحب کو بلوایئے۔ یہاں (قلب کے اوپر ہاتھ رکھ کر) درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔

م۔ش۔ ابھی جاتا ہوں۔

راوی۔ م۔ش حکیم صاحب کو بلانے گئے وہ اپنے بالاخانے پر سو رہے تھے ان کو باوجود کوشش کے اطلاع نہ ہو سکی۔ م۔ش ناکام واپس آ گئے۔

م۔ش۔ حکیم صاحب کو تو جگا نہ سکا۔

علامہ۔ افسوس۔ قریشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ راجہ صاحب کہاں ہیں۔

راجہ حسن اختر۔ فرمایئے ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ آپ جائیں اور حکیم صاحب کو لائیں بڑی تکلیف ہے۔

حسن اختر۔ وہ بہت رات گئے یہاں سے گئے ہیں شاید اس وقت ان کو اُٹھانا مناسب نہ ہو۔

علامہ۔ ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ نیاید
نسیمے از حجاز آید کہ نیاید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نیاید

ث

راوی ۔ ڈاکٹر ضمیر سنگھ اور کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش کی سرکردگی میں ڈاکٹروں کے بورڈ نے دوائیں تجویز کر دی تھیں ۔ اور کہا تھا کہ کمر کا درد بڑھ جائے تو ایک ٹیکہ لگا دیا جائے دوا دینے اور ٹیکا لگانے کیلئے علامہ کے ایک عزیز ڈاکٹر عبد القیوم جاوید منزل ہی میں رہتے تھے ۔ رات کے پچھلے پہر جب اضطراب میں اضافہ ہوا تو علامہ نے اپنا پلنگ پورچ سے اندر کمرے میں کروالیا ۔ جب درد کی شدت سے علامہ کراہنے لگے تو م ۔ ش (میاں شفیع جو ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے) نے علامہ سے کہا ۔

م ۔ ش ۔ حضرت ٹیکہ لگوا دیا جائے ؟

علامہ ۔ (ہاتھ کے اشارے سے) نہیں (کراہتے ہوئے)

م ۔ ش ۔ (کچھ دیر کے بعد) حضرت آپ کو بہت تکلیف ہے ۔ ڈاکٹروں کے بورڈ نے ٹیکہ تجویز کیا تھا ۔

علامہ نہیں ، میں ٹیکہ نہیں لگواؤں گا (کراہتے ہوئے کروٹ بدلتے ہیں)

م ۔ ش ۔ حضرت ، ڈاکٹر قیوم نے ٹیکہ تیار کر لیا ہے اجازت ہو تو ٹیکہ لگایا جائے ۔

(ڈاکٹر ٹیکے کی سوئی لئے تیار کھڑے ہیں)

علامہ ۔ (غصے سے سر اُٹھا کر)

شفیع ۔ اس ٹیکے میں افیون ہوتی ہے جو انسان کو بے ہوش کر دیتی ہے میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا ۔ میں موت کا سامنا کرنا چاہتا ہوں ۔

راوی ۔ اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد علامہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا

ملے. جب آپ نے آخری سانس لی تو پو پھٹ رہی تھی اور مسجدوں کے میناروں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

باب ۲

عادات، خصائل اور ترجیحات

راوی۔ ۹۹ - ۱۸۹۸ میں جب اقبال گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو انہیں اکھاڑے میں ورزش کرنے کا شوق بھی تھا کوچہ ہنومان گمٹی بازار لاہور میں ان کے دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے اپنے گھر میں اکھاڑہ بنوا رکھا تھا۔ اقبال اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ شوق آتا تو خود لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اُترتے اور للکارتے۔

اقبال۔ آجاؤ ۔ میر صاحب دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

میر نیرنگ۔ وہ داؤ لگاؤں گا کہ یاد کرو گے۔

اقبال۔ میر صاحب۔ آؤ تو سہی چاروں شانے چت پڑے ہو گے۔[۱]

☆

راوی۔ جب علامہ گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے تو زیادہ وقت اپنے کمرہ میں مطالعہ میں گزارتے ۔ ایک شام جب دوسرے طلباء گراؤنڈ میں مختلف کھیلوں میں مصروف تھے تو یہ ایک کتاب لئے مطالعہ

[۱] حیاتِ اقبال ص ۸۰۔

میں مستغرق بیٹھے تھے۔

پرنسپل۔ (اندر کمرہ میں آتے ہوئے) تمام طلبہ باہر گراؤنڈ میں ورزش اور کھیل میں مصروف ہیں اور تم کتاب لئے بیٹھے ہو۔

اقبال۔ جناب والا یہ بھی اپنی جگہ ایک ورزش ہی ہے۔[1]

ﭘ

راوی۔ علامہ کو دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ دلچسپی حقے سے تھی ایک بار اعجاز احمد کے ساتھ ریل کا سفر کر رہے تھے رات کا وقت تھا وزیر آباد جنکشن پر دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ علامہ کو حقے کی سخت طلب ہوئی۔ چارو ناچار ایک قلی سے حقہ منگا کر پیا۔

اعجاز احمد۔ حقہ تو بہت گندا تھا۔ نہ جانے قلی کہاں سے کس کا اُٹھا لایا تھا۔ اس قابل نہیں تھا کہ آپ اِسے ہاتھ بھی لگاتے۔

علامہ۔ جس کو تمباکو کی عادت پڑ جاتی اسے طلب کے وقت اِن نزاکتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔

ﺜ

راوی۔ ذکرِ اقبال میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ زندگی کے آخری سالوں میں علالت کی وجہ سے اقبال کی خوراک برائے نام رہ

---

[1] اقبال کی صحبت میں ص ۳۱۔

رہ گئی تھی۔ اس سے قبل صبح کلچہ یا باقر خانی حلوے کیساتھ کھاکر کشمیری چاء پی لیا کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسی نوش فرماتے تھے دوپہر کو سبزی گوشت اور دو ایک چپاتیاں تیسرے پہر کچھ نہیں رات کو پھر وہی سالن اور چپاتیاں پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے۔ ایک بار کھانے پر پلاؤ اور کباب آئے تو خوش ہوئے۔

سالک: ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا پسندیدہ کھانا ہے؟

علامہ: جی ہاں، یہ پان اسلامک ڈشز ہیں چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے[۵]

*

راوی: پھلوں میں علامہ کو آم بیحد مرغوب تھے بازار سے منگاتے دوست احباب بھی تحفہ بھیجتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی نے آم بھیجے۔ علامہ نے پارسل کی رسید کے طور پر یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

تیرے فیض مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا، لاہور تک پہنچا

ذکرِ اقبال میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔ آخری علالت کے دوران جب دہلی کے حکیم نابینا صاحب کا علاج ہو رہا تھا تو حکیم صاحب نے آموں سے پرہیز کا حکم دیا آخر علامہ کے اصرار پر صرف ایک آم روزانہ

۵۔ روزگار فقیر ص ۱۶۲

کھانے کی اجازت دے دی۔ ایک دن میں تیسرے پہر حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ حسب دستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی تپائی پر کوئی آدھ سیر بھر کا بمبئی آم پلیٹ میں رکھا ہے۔

سالک۔ حضرت! یہ کیا؟ حکیم صاحب نے تو پرہیز بتایا ہے۔

علامہ۔ ہاں۔ لیکن ایک آم کھانے کی تو اجازت ہے اور بہر حال یہ ایک ہی آم ہے دو تو نہیں۔

راوی۔ کھانے تو کھانے دواؤں کے رنگ و بو کے بارے میں بھی علامہ بہت حساس تھے۔ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی سے ہمیشہ بیزاری ظاہر کرتے۔ آخری علالت کے زمانے کا ایک واقعہ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ جب خمیرہ مروارید چاندی کے ورق میں لپیٹ کے ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا گیا تو فرمایا۔

علامہ۔ واہ، واہ۔ یہ ہے نا دوا جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جاتا ہے۔ مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے اس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

راوی۔ آخری دنوں میں علامہ غذا کے بارے میں بہت ہی زیادہ حساس ہو گئے تھے۔ حکیم محمد حسن قرشی سے ایک گفتگو ملاحظہ ہو۔

علامہ۔ اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے؟ یہ تو سادہ غذا ہے۔

حکیم قرشی۔ اگر ایسی ہی خواہش ہے تو ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے۔

علامہ۔ ہاں تو کھچڑی بھنی ہوئی ہونی چاہیئے جس میں گھی کافی ہو۔

حکیم قرشی۔ گھی کم ہونا چاہیئے کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے۔

علامہ۔ تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہوگی اچھا کم از کم اس میں دہی ملا لیا جائے۔

حکیم قرشی۔ مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے جس میں دہی مضر ہے۔

علامہ۔ تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے۔[1]

ﷺ

راوی۔ آم، غالب کی طرح علامہ کی بھی کمزوری تھے، اس حد تک کہ بیماری میں بھی اس سے پرہیز کرنا مشکل تھا لیکن جب بات تزکیہ نفس کی ہوتی تو یہ مزہ بھی بخوشی ترک کر دیتے۔

ایک دفعہ آموں کا موسم تھا علی بخش کو بلایا۔

علامہ۔ علی بخش۔ آج آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔

علی بخش۔ میں بازار جا ہی رہا تھا بیگم صاحبہ نے بھی آم لانے کو کہا ہے۔

علامہ۔ تو پھر مالدہ آم لانا۔

علی بخش۔ کیوں؟ مالدہ تو آپ کو پسند ہی نہیں باہر سے آئے ہوئے ہوں تو بھی ہاتھ نہیں لگاتے۔

علامہ۔ پھر بھی مالدہ ہی لانا بیگم کی پسند مقدم ہے اس میں میرا فائدہ بھی ہے۔

علی بخش کیا۔؟

علامہ مجھے مرغوبات نفس خوشی سے ترک کر دینے کی عادت پڑے گی

---

[1] روزگارِ فقیر ص ۱۷۶

علی بخش ۔ جو آپ کی مرضی ۔

راوی ۔ اس واقعہ کے دوسرے دن کی بات ہے ۔

علی بخش ۔ کل آپ آموں کی بات کر رہے تھے آج الہ اباد سے آموں کے دو ٹوکرے آئے ہیں ۔

علامہ ۔ لا کے دکھاؤ ۔

علی بخش ۔ (دونوں ٹوکرے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے) دیکھئے ۔

علامہ ۔ ان میں سے سب سے اچھا آم چن کر نکالو ۔

علی بخش ۔ (کچھ دیر میں چھانٹ کر) یہ لیجئے ۔

علامہ ۔ (ہاتھ میں لیکر) سبحان اللہ خوب ہے لو علی بخش اب ہماری طرف سے تم کھالو ۔

علی بخش ۔ میں ؟

علامہ ۔ ہاں ہماری خوشی یہی ہے ۔

٭

راوی ۔ علامہ کو بچپن میں اکھاڑے میں ورزش کرنے کا شوق بھی تھا ۔ لاہور میں بھاٹی دروازے میں قیام کے زمانہ میں میر غلام بھیک نیرنگ کے ساتھ کبھی کبھی اکھاڑہ میں زور کرتے تھے
نوجوانوں کو جسمانی ورزش کی تاکید کیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے ہوئے تھے ۔ لعل دین پہلوان ملنے کیلئے آئے ۔ محلہ میں قریب ہی ان کا اکھاڑہ تھا ۔

لعل دین۔ آپ اب بھی زور کرتے ہیں۔

علامہ۔ کبھی کبھی لاہور جاکر یہ شوق قریب قریب ہی چھوٹ گیا۔

آپ کا اکھاڑہ کیسا جا رہا ہے۔ ؟

لعل دین۔ اچھا ہے جی پر آج کل کے لڑکوں میں وہ پرانا شوق نہیں

علامہ۔ بس پہلوان جی کیا کیا جائے۔ زمانہ بدلنے لگا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ اعجاز ، اعجاز ۔ (آواز دیتے ہیں) بھئی اعجاز ادھر آؤ۔

اعجاز۔ فرمایئے چچا جان۔

علامہ۔ (لعل دین سے) میرا بھانجا ہے۔

لعل دین۔ دیکھا ہے آتے جاتے چنگا جوان ہے۔

علامہ۔ پہلوان جی اس کو اپنا شاگرد بنا لیجئے زور کرنا سکھایئے۔

لعل دین۔ اچھا جی یہ لڑکا اکھاڑہ آجایا کرے

السلام علیکم (جاتے ہیں)

علامہ۔ اعجاز! تم لعل دین کے اکھاڑے پابندی سے جایا کرو۔ ورزش کرو اور صحت بناؤ۔ زندگی کو باقاعدہ اور سادہ بنانے کی کوشش کرو جوانی کی توانائی سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے تاکہ صحت تادیر قائم رہے۔

جسمانی اور روحانی صحت کی ضامن مذہبی زندگی ہے۔ بزرگوں کے پاس ضرور بیٹھا کرو ان کی صحبت میں اکسیر کی تاثیر ہوتی ہے۔

اعجاز احمد۔ آپ نے ایک بار مسواک کی تاکید بھی کی تھی۔ اب تو اچھے اچھے ولایتی منجن ملتے ہیں کیا وہ مسواک کا بدل نہیں ہو سکتے۔ ؟

علامہ۔ مسواک سے میری مراد دیسی مسواک تھی نہ کہ انگریزی طرز

کے مبخن اور برش کیوں کہ یوروپ کی بنی ہوئی بعض چیزیں خوبصورت تو ضرور ہوتی ہیں مگر ان میں اخلاقی زہر ہوتا ہے جس کا اثر آج کل کے مادہ پرست مزاج رکھنے والے انسان فوراً محسوس نہیں کر سکتے

٭

راوی۔ علامہ فلم بینی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بچوں کو بھی نہ دیکھنے دیتے تھے۔ لیکن جاوید کو ایک فلم دیکھنے کی خصوصی اجازت ملی۔

علامہ۔ (نذیر نیازی سے) جاوید میاں شفیع کے ساتھ سینما جا رہا ہے۔ (..... فلم کا نام لیکر) کیسی ہے؟

نیازی۔ نپولین کے حملے اور اس سلسلے میں ماری والیوسکا سے اس کے معاشقے کا قصہ ہے اور اس میں تاریخ بھی ہے مغرب کی سیاسی اور اخلاقی زندگی کی جھلک بھی۔

علامہ۔ ہوں۔

نیازی۔ اسلام کے متعلق نپولین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے۔ آیا وہ خالصتاً فرانسیسی نژاد تھا یا مخلوط النسل کیا اس کی رگوں میں فی الواقعہ عربی خون موجزن تھا؟

علامہ۔ ہمیں بھی اہل یوروپ کی طرح اپنے رجال اور مشاہیر کی شخصیتوں پر قلم اُٹھانا چاہیئے مگر افسوس ہے ہم میں کوئی سیرت نگار ہے نہ کسی کو سیرت نگاری کے فن سے دلچسپی ہے

حالانکہ سیرت نگاری حیاتِ ملّی کے استحکام کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

نیازی۔ اہلِ یورپ میں بعض کا تو یہ بھی خیال ہے کہ نادر شاہ ایرانی کی شخصیت بھی نپولین سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

علامہ۔ پھر کچھ لکھو اس موضوع پر۔[1]

٭

راوی۔ ممتاز حسن شریکِ محفل تھے علامہ کا مطالعے سے شغف زیرِ گفتگو تھا۔

ملاقاتی۔ اس قدر مطالعہ کرنے سے آخر کیا حاصل ہوتا ہے؟

علامہ۔ یہ تو مجھے دوسری دنیا میں بھی کام دے گا۔

ممتاز حسن پنجاب کونسل کی رکنیت قبول کرنے کی غرض و غایت کیا تھی؟

علامہ۔ کونسل میں میرے جانے کا بڑا سبب یہ ہے کہ میری طبیعت کا رخ علمی مشاغل کی طرف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ توازن قائم رکھنے کیلئے میں نے دنیا کے عملی معاملات میں دلچسپی لینا ضروری سمجھا۔

..... جب میں کیمبرج میں تھا تو فلسفے کیساتھ ساتھ معاشیات کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا اور اس موضوع پر لیکچر بھی سنا کرتا تھا تاکہ مسلسل فلسفہ پڑھنے اور سوچنے سے ذہن میں یک طرفہ پن

---

[1] اقبال کے حضور صفحہ ۲۰۴

پیدا نہ ہو اور طبیعت کا توازن قائم رہے[1]

☆

ستار اور موسیقی کا شوق

راوی۔ یاد کش بخیر جبکہ آتش جوان تھا علامہ کو ستار بجانے کا شوق بھی تھا۔ ایک دن وہ ستار بجانے میں مستغرق تھے کہ ان کے دو بے تکلف دوست نواب سر ذوالفقار علی خان اور سردار جوگندر سنگھ آ گئے کہ علامہ کو ستار بجاتے دیکھ کر سردار جوگندر سنگھ نے ازراہ مذاق کہا۔

سردار جوگندر سنگھ۔ جب دیکھو ستار کو گود میں لئے بیٹھے ہیں۔

علامہ۔ (پنجابی میں) سکھنی جو ہوئی۔

☆

راوی۔ نواب ذوالفقار علی خان بیماری کے بعد ڈیرہ دون میں آرام کر رہے تھے ڈاکٹر اقبال اور مرزا جلال الدین ان کو دیکھنے گئے۔ ڈاکٹر اقبال کا ئرہ نواب صاحب کے صاحبزادے خورشید علی خان کے ساتھ تھا۔ خورشید نے غالب کی ایک غزل گانی شروع کی۔

---

[1] روزگارِ فقیر۔

اقبال۔ خورشید، جو کچھ گانا ہے یہاں آکر سناؤ۔

خورشید۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔

راوی۔ خورشید علی خان کا بیان ہے وہ گاتے رہے اور علامہ دیر تک روتے رہے۔ مرزا جلال الدین کے ہاں ظہور گایا کرتا تھا تو بھی ڈاکٹر صاحب اکثر روتے رہتے تھے۔

ٹ

راوی۔ علامہ کے ہم نوالہ، ہم پیالہ دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر کا بیان ہے کہ اقبال حالی کی مسدس کے تو عاشق تھے میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مزاج شخص ملازم تھا۔ اسے ستار بجانے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز سے بجایا کرتا تھا۔ اکثر اقبال فرمائش کرتے۔

علامہ۔ بلاؤ بھئی مرزا، ظہور کو، کہو کچھ ستار پر سنائے ہمیں۔

ظہور۔ کیا سناؤں حضور؟

علامہ۔ وہی ہماری پسندیدہ چیز۔۔۔۔

ظہور۔ لیجئے۔۔۔۔ (ستار پر مسدس شروع کرتا ہے)

"وہ نبیوں میں رحمت۔۔۔۔۔"

ستار نواز۔ جی۔۔۔۔ وہ نبیوں میں رحمت۔۔۔

راوی۔ مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ یہ بند انہیں بطور خاص مرغوب تھا اس کو سنتے ہی ان کا دل بھر آتا تھا اکثر بے اختیار رو پڑتے

اسی طرح کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں[1]

راوی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے پروفیسر عبدالحمید حاضر خدمت تھے

علامہ۔ بچوں کی طرف سے مجھے ان کی جرمن اتالیق کی وجہ سے بالکل اطمینان ہے البتہ مجھے کچھ عرصے سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے صبح شام تو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ سہ پہر کا وقت بہت گراں گزرتا ہے پڑھ سکتا نہیں انسان سوئے بھی کہاں تک۔

عبدالحمید۔ اگر موسیقی کا انتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہوگی۔

علامہ۔ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

۴

شعر کہنے کا انداز

راوی۔ علامہ نے خود ایک بار فرمایا میرا پیکرِ خاکی دو روحوں کا نشیمن ہے۔ ایک سراپا سوز و مستی ہے دوسری سراپا تاب و تب، سوز و مستی والی روح جھکڑ چلے یا آندھی آئے، اولے برسیں یا طوفان اٹھیں، اپنے کام میں مصروف رہتی ہے۔

ایک دن علامہ کے ایک بے تکلف سکھ دوست سردار امراؤ سنگھ

---

[1] تذکرہ اقبال ص ۲۰۹

مجیٹھ ملنے آئے تو یوں گفتگو شروع ہوئی۔

علامہ۔ آؤ سردار جی، تشریف رکھو۔

سردار جی۔ تشریف تو میں رکھاں۔ شاعری کی دیوی یا پری کا کیہ حال ہے

علامہ۔ (حقہ کا کش بھرتے ہوئے)، ایہہ شاعری پری نہیں اِک ڈاھڈا جن اے۔ جھدی اِک فرمائش پوری کرو تاں دوجی فرمائش لیکے چڑھ جاندا اے۔ مینوں تو ایہدے کولوں پچھا چھڈانا محال ہوگیا اے

٭

راوی۔ اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحانات کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انھوں نے اپنے والد سے اُس کا ذکر کیا۔

اقبال۔ میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو میں بھی کسی نہ کسی قسم کا مافوق انسان ہو جاتا۔

والد۔ (ہنس کر) خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی

٭

راوی۔ ایف سی کالج لاہور کا سالانہ جلسہ تھا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ علامہ اور دوسرے مہمان اجلاس کے بعد چاء پی رہے تھے کہ ڈاکٹر لوکس ان کے پاس آئے۔

ڈاکٹر لوکس۔ ڈاکٹر صاحب چائے کے بعد چلے نہ جایئے گا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

علامہ۔ بہت بہتر۔

ڈاکٹر۔ (کچھ دیر بعد علامہ کو ایک گوشہ میں لے جاکر)
اقبال، مجھے یہ بتایئے آیا آپ کے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوتا تھا۔ یا پوری عربی عبارت ہی اسی طرح اترتی تھی؟

علامہ۔ پوری عبارت ہی عربی میں اُترتی تھی۔

ڈاکٹر لوکس۔ اقبال حیرت ہے آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ پوری عبارت ہی اس طرح اُترتی تھی۔

علامہ۔ ڈاکٹر لوکس! یقین؟ یہ میرا تجربہ ہے مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے۔ تو پیغمبر پر پوری عبارت کیوں نہ اُترتی ہوگی۔

ث

راوی۔ شعر و ادب پر گفتگو ہو رہی تھی سیّد وحید الدین حاضر تھے

وحید الدین۔ آپ کو اشعار کی کتنی کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے

علامہ اشعار کیلئے مجھے موزوں الفاظ کی جستجو نہیں کرنا پڑتی بلکہ

پورے کے پورے اشعار وارداتِ قلبی اور فکر کے سانچے میں ڈھل کر خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔

وحیدالدین۔ آپ شعر کہتے کس طرح ہیں؟

علامہ۔ جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کیلئے جال ڈالا ہے مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہوگیا ہے سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑوں۔

وحیدالدین۔ کیا آپ پر یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے؟

علامہ۔ نہیں۔ یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے۔ اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہوتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی، اضمحلال اور پژمردگی محسوس کرتا ہوں۔

وحیدالدین۔ گویا ان فیضانی لمحوں میں اشعار کا نزول ہوتا ہے۔

علامہ۔ ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی۔ تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے یہ نعمت مجھ سے چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں، میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی یک بیک

ایک روز پھر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطل کی تلافی کر دی۔

وحید الدین۔ ایک ایک نشست میں زیادہ سے زیادہ کتنے شعر ہوئے ہیں؟

علامہ۔ تین سو سے چار سو تک [1]

راوی۔ اس ضمن میں سر شیخ عبد القادر بانگِ درا کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کے دور میں اقبال کی طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے میں نے اس زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری رہتی تھی اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔

---

[1] روزگارِ فقیر۔ ص ۴۰

اقبال نے حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہو جاتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں خود وہ انھیں قلمبند بھی نہیں کرتے ...... اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزوں طبعی وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے۔

مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقعہ پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکے۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

ٌ

راوی۔ علامہ کی جوانی کے ہمدم و دمساز مرزا جلال الدین بیان کرتے ہیں۔ وکالت کے زمانے میں جب ڈاکٹر صاحب رات میرے پاس گزارتے تھے تو صبح اُٹھ کر نماز پڑھتے اور اس کے بعد بڑی خوش الحانی سے دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کرتے ان کی تلاوت سن کر بڑا لطف آتا تھا۔ اور ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی پھر چائے پی کر وہ اپنے گھر چلے جاتے تھے

مرزا جلال الدین مزید لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو راگ و رنگ کا بہت شوق تھا میرے مکان پر رقص و سرود کی محفلیں اکثر ہوا کرتی۔ اس لئے وہ ان مجالس میں بڑی رغبت سے شمولیت فرماتے۔ گو اقبال کا کلام پچھلی شب کے سکون اور

تنہائی میں مرتب ہوتا تھا مگر میں نے یہ بھی دیکھا کہ رقص وسرود کے دوران ان کی طبیعت موزوں ہو جاتی اور آپ اپنی کسی نظم کی بنیاد رکھ دیتے، ایسا تو اکثر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب بے فکری کے عالم میں مزے لے لیکر گانا سننے میں مشغول ہوتے اور مغنیہ کوئی نعت چھیڑ دیتی جس کا کوئی شعر ان کے دل پر اثر کر جاتا تو ان پر بے اختیار ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور وہ دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو تھپکتے جاتے اس کیفیت کے آشکار ہوتے ہی ارباب نشاط کو فوراً گانے سے روک دیا جاتا اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر اقبال کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی سازندے جو اقبال کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے نہایت آہستہ مدھم سروں میں ایک خاص قسم کی تال سی دیتے رہتے جس کے ساتھ وہ اپنی مخصوص لے میں اپنے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کیوجہ سے کچھ ایسی دل نواز ہوتی کہ ایک سماں بندھ جاتا۔

"یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے"

والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی محفل میں رکھی گئی تھی ملّی ترانے کا شعر "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" بھی اسی حالت میں موزوں ہوا تھا۔

راوی۔ مرزا جلال الدین کا بیان ختم ہوا۔ "یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ

جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے، نظم کی شانِ نزول کا منظر دیکھئے۔

منظر

سازو آواز کی محفل آراستہ ہے مرزا جلال الدین، اقبال اور چند دوسرے احباب جمع ہیں۔ سازندے اپنے سازوں پر پس منظر کی موسیقی ہلکے سروں میں دے رہے ہیں اور مغنیہ نے یہ نعت چھیڑ دی۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے!
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی ہے نہ دیا ہے
دولت ہے نہ فضیلت نہ ہنر ہے
ایک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے!
فریاد ہے اے کشتیٔ اُمت کے نگہباں!!
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے خاصۂ خاصانِ رسل ، اے خاصۂ خاصانِ رسل ......

(اقبال پر آہستہ آہستہ استغراق کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے ....)

بہت ہی دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے ہیں

(یارب دلِ مسلم کو ، یارب دلِ مسلم کو)

(داہنے زانو کو ہاتھ سے تھپکتے جاتے ہیں)

یارب دلِ مسلم کو ..... یارب دل .... دلِ مسلم کو

(مغنیہ کی نغمہ طرازی جاری ہے اے خاصہ خاصانِ رسل

مرزا جلال الدین اس کو اشارے سے رک جانے کو کہتے ہیں وہ سروں کو آہستہ آہستہ دھیما کر کے چپ ہو جاتی ہے ۔ اور سازندے ایک ہلکی تال دیتے ہیں اقبال عالمِ وجد میں ہیں ۔

اقبال ۔ یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

وہ زندہ تمنا دے

جو قلب کو ۔ جو قلب کو گرما دے ، جو روح کو تڑپا دے ،

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے [1]

*

راوی ۔ غالب کے بارے میں مشہور ہے کہ رات کو عالمِ کیف و سرور میں جو شعر کہتے تو لکھتے لکھاتے نہیں تھے یادداشت کیلئے ازاربند میں گرہ لگا لیتے تھے صبح گرہیں کھولتے جاتے اور شعر قلمبند کرتے

---

[1] . روایات اقبال ص ۱۱۸

جاتے۔ حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ جس ترتیب سے شعر کہے ہوتے اسی ترتیب سے مطلع و مقطع کے ساتھ پوری غزل لکھ لیتے یا لکھوا دیتے۔

علامہ کا دستور بھی کچھ ایسا ہی تھا زندگی کے آخری دنوں میں علامہ کی بینائی موتیا اُترنے کی وجہ سے تقریباً ختم ہو گئی تھی آنے جانے والوں کو بھی بمشکل پہچان پاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اس وجہ سے دن میں جو شعر ہوتے وہ کسی نہ کسی سے لکھوا لیتے لیکن رات کو یا کسی وقت تنہائی میں کچھ کہتے تو کاغذ کے ٹکڑوں پر اٹکل سے ایک آدھ لفظ لکھ لیتے۔

اور جب نذیر نیازی یا چودھری محمد حسین آتے تو ان پرزوں کی مدد سے انھیں پورے شعر املا کرا دیتے علامہ کے پلنگ کے پاس کے ایک بکس میں ایک آدھ رجسٹر پڑا رہتا تھا اس میں علامہ کا نیا کلام درج کیا جاتا تھا۔

۷ فروری ۱۹۳۸ء کی صبح جب نذیر نیازی علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے ان سے اشعار نقل کرنے کو کہا۔ نذیر نیازی نے بکس سے وہ رجسٹر نکالا جو بیاض کا کام دیتا تھا تو علامہ نے سرہانے کی طرف پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی تپائی سے کاغذ کا ایک پرزہ اٹھایا جس پر کہیں کہیں ایک آدھ لفظ درج تھا۔

علامہ: نیازی صاحب! یہ شعر رات ہوئے تھے۔

نیازی: ارشاد!

علامہ۔

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی
یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی
فلک کو کیا خبر یہ خاک داں، کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس شبستاں کی نگہبانی
اگر مقصودِ کل ہوں میں، تو مجھ سے ماوراء کیا ہے!
میرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے!

راوی۔ چند شعروں کی یہ نظم بعنوان حضرتِ انساں، علامہ کی آخری نظم تھی اس کے بعد اردو میں کوئی شعر نہیں ہوا اور علامہ کا یہ خیال کہ صورِ اسرافیل کے نام سے ایک نیا مجموعہ ترتیب دیا جائے پورا نہ ہو سکا۔

*

راوی۔ مرزا جلال الدین بیان کرتے ہیں۔
اقبال کی نگاہ میں اس قدر بصیرت تھی کہ وہ معمولی سے معمولی

واقعہ سے بھی فلسفہ کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سر ذوالفقار علی خان، سر جوگندر سنگھ اور میں اقبال کے ساتھ نواب صاحب کی موٹر میں شالا مار کی طرف سیر کو نکلے۔ سر جوگندر نے از راہِ حیرت کہا۔

سر جوگندر سنگھ۔ نواب صاحب کی موٹر کس قدر خاموش ہے

اقبال۔ ہے جادہ حیات میں ہر تیز پا خاموش

راوی۔ بانگِ درا کی نظم موٹر اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

موٹر

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی!!
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز
مانندِ برق تیز، مثالِ ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پر منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش (۱)

*

راوی۔ عبدالمجید سالکؔ نے شاعری شروع کی تو استاد کی تلاش ہوئی۔

سالکؔ کیا میں آپ سے تلمذ کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں؟

علامہ ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے

روایاتِ اقبال ص ۱۱۹

اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لئے موزوں ہے تو آپ خود بخود اس پر مجبور ہوں گے۔

رہا زبان کا مسئلہ تو میں اس کیلئے موزوں استاد نہیں ہو سکتا مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیرا فن ہے لوگ اس کو شاعری کی تحقیر کیلئے استعمال کیا کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں کسی پیر استاد کی ضرورت نہیں

ٹ

کاروباری دیانت و خوش معاملگی

راوی۔ علامہ نے وکالت کو کبھی ذریعہ تجارت نہیں بنایا۔ اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں کو تو وہ عطیہ خداوندی سمجھتے تھے جب تک حالات نے مجبور نہیں کر دیا انھوں نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ بھی نہیں اُٹھایا ۔ ۱۹۱۸ء میں جب انھیں وکالت کرتے دس برس گزر چکے تھے تو انھوں نے والد سے کہا۔

علامہ۔ میں نے اپنے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا۔ کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس میں میری محنت کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اسے خلق اللہ کی خدمت میں صرف ہونا چاہیئے لیکن ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس ارادہ کے خلاف کرنا پڑا۔

راوی۔ وکالت سے علامہ کی آمدن قلیل تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مقدمے ہی اتنے لیتے تھے جن کی فیس سے ضروری اخراجات پورے ہوجائیں۔ چونکہ ضروری آمدن مہینے کی شروع تاریخوں میں ہو جاتی تھی اس لئے وہ عموماً ہر مہینے کی دس تاریخ کے بعد مقدمے نہیں لیتے تھے۔ جھوٹا اور کمزور مقدمہ بھی قبول نہ کرتے تھے۔ مؤکلوں سے معاملت کا یہ منظر دیکھئے۔

(اقبال اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں حقہ کی نے منہ میں ہے)

منشی طاہرالدین۔ ڈاکٹر صاحب چند مؤکل بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو پیش کروں۔

علامہ۔ (کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہوئے) منشی جی! کیا تاریخ ہے آج!

منشی۔ آج بارہ ہے جناب۔

علامہ۔ منشی جی ہمارے مقدمے لینے کی تاریخ گزر نہیں گئی؟

منشی۔ جی ہاں، گزر تو گئی۔

علامہ۔ تو آپ نے لوگوں کو بتایا نہیں کہ دس کے بعد میں نئے مقدمے نہیں لیتا۔

منشی۔ جی بتایا تو تھا۔

علامہ۔ کیا اس مہینہ کی مقررہ آمدن میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟

منشی۔ جی نہیں کوئی پانچ سو سے اوپر محنتانے کی رقم بنتی ہے۔

علامہ۔ تو پھر کیا ضرورت ہے نئے مقدمے لینے کی؟ وکالت میرے لئے ذریعہ معاش ہے ذریعہ تجارت نہیں میں غیر ضروری پیسہ کمانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ اُن لوگوں سے کہہ دیجئے کہ کوئی اور وکیل کرلیں یا پھر اگلے مہینے کے شروع میں آئیں۔

منشی۔ میں نے سمجھایا ہے مگر یہ لوگ مانتے ہی نہیں کہتے ہیں ہمیں ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے دو۔ آپ خود بتا دیجئے۔

علامہ۔ اچھا بھیجو اُن کو۔

مؤکل۔ السّلام علیکم ڈاکٹر صاحب

علامہ۔ وعلیکم السلام! آئیے بیٹھئے میرا اصول ہے کہ میں دس تاریخ کے بعد نئے مقدمے نہیں لیتا۔ کوئی اور انتظام کر لیجئے۔

مؤکل۔ نہیں، ڈاکٹر صاحب یہ کیس لڑیں گے تو آپ ہی لڑیں گے۔

علامہ۔ اچھا۔ آپ اگلے مہینے کے شروع میں آئیے گا میں کیس دیکھ کے بتاؤں گا کہ میں اس کو لے سکوں گا یا نہیں۔

مؤکل۔ ڈاکٹر صاحب! میں انتظار بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ کیس آپ ضرور لڑیں۔

علامہ۔ بھائی بغیر کیس دیکھے میں وعدہ کیسے کروں؟

مؤکل۔ اس مثل پر آپ ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے۔

علامہ۔ آپ اصرار کرتے ہیں تو دیکھ لیتا ہوں (تھوڑا سا دیکھ کر) (مثل واپس کرتے ہوئے)، میرا خیال ہے یہ کیس بہت کمزور ہے اس لئے میں اسے اگلے مہینے بھی نہیں لوں گا۔

مؤکل۔ میں آپکو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں مگر کیس آپ ہی لڑیں

علامہ۔ میں فیس کی پرواہ نہیں کرتا۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

موکل۔ حد ہوگئی اچھے وکیل ہیں آپ۔ (ناراض ہوکر چلا جاتا ہے)

منشی۔ ڈاکٹر صاحب ایک موکل اور ہے بھیجوں؟

علامہ۔ منشی صاحب! یہ شخص بڑا بد دماغ تھا۔ یہ شخص مجھے فیس سے خریدنا چاہتا تھا نامعقول، میں محض فیس کی خاطر مقدمہ لڑنا بد دیانتی سمجھتا ہوں۔

منشی۔ ایک اور موکل ملاقات کا خواہش مند ہے آپ ہی اس کو سمجھا دیجئے۔

علامہ۔ بھیجدیئے۔

منشی۔ بہتر (باہر جاتا ہے)

موکل۔ السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ وعلیکم السلام، آپ کو منشی طاہر الدین نے بتایا ہوگا کہ ۱۰ تاریخ کے بعد میں نئے مقدمے نہیں لیتا آپ اگلے مہینے آئیں۔

موکل ڈاکٹر صاحب مقدمہ کچھ ایسا ہے کہ اسے جیتنے کیلئے کسی بڑے وکیل کی ضرورت ہے۔ بیشک آپ اگلے مہینے مقدمہ لیں۔ لیکن بس ضرور آپ کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ مقدمہ کچھ ٹیڑھا ہے۔

علامہ۔ کیا مطلب؟

موکل۔ اب آپ سے کیا چھپانا، دشمنوں کو چکر دینے کیلئے یہ مقدمہ بنایا گیا ہے۔ جائداد کا جھگڑا ہے اپنے مخالفوں کو زچ کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ۔ جھوٹا مقدمہ تو میں زندگی بھر نہ لوں گا آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟

مؤکل۔ ہمیں مقدمہ ہر قیمت پر لڑنا ہے۔ خواہ کتنا خرچ ہو۔

علامہ۔ جھوٹے مقدمے کی وکالت میں لاکھ روپے پر بھی نہیں کر سکتا۔
براہِ کرم آپ تشریف لے جائیے۔

مؤکل۔ اچھا جی (خاموشی سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے)

علامہ۔ منشی جی۔

منشی۔ جی۔

علامہ۔ یہ آج آپ کن نامعقول لوگوں کو پکڑ لائے لاحول ولاقوۃ
یہ شرافت ہے۔

☆

راوی۔ علامہ کی کاروباری دیانت کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ مسٹر داس پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے ان کے پاس ریاست آرہ کا ایک مقدمہ آیا۔ اس سلسلہ میں فارسی کی قدیم دستاویزات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان پر تبصرہ کرنا تھا۔ بیرسٹر داس نے ڈاکٹر اقبال کی خدمات حاصل کیں۔
علامہ پٹنہ گئے اور مقدمہ کے کاغذات تحویل میں لے لیے۔ دوسرے دن بیرسٹر داس اور علامہ میں یہ گفتگو ہوئی۔

داس۔ ڈاکٹر صاحب، دستاویزات آپ نے دیکھیں؟

علامہ۔ جی ہاں! یہ لیجئے میں نے خلاصہ تیار کر لیا ہے دعویٰ کے
دلائل ترتیب دیدیئے ہیں۔

داس۔ ارے اتنی جلدی۔

علامہ۔ مثل تو بہت ضخیم ہے اصل متعلقہ کاغذات زیادہ نہیں تھے۔

داس۔ پھر بھی کچھ وقت لینا تھا آپ کو ایک ہزار روز کی فیس پر یہاں بلایا گیا ہے دو چار ہزار تو بنتے۔

علامہ۔ مسٹر داس میرے مالی فائدے میں جو آپ کی دل چسپی ہے اس کیلئے میں آپ کا ممنون ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے رسولؐ نے اس روزی کو حرام قرار دیا ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے۔

☼

راوی۔ نیرنگ خیال کے نامور ایڈیٹر حکیم یوسف حسن کا بیان ہے کہ ایک دن وہ علامہ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے علامہ کے دوست اور نیازمند چودھری محمد حسین بھی موجود تھے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

علی بخش۔ (اندر آتے ہوئے) ایک تار آیا ہے جناب۔

چودھری محمد حسین۔ ادھر لاؤ (رسید پر دستخط کر کے تار کا لفافہ لیتے ہیں)

علامہ۔ کس کا تار ہے، آپ ہی کھول کر سنا دیجئے۔

محمد حسین۔ نواب صاحب بہاولپور کا تار ہے۔

علامہ۔ کیا کہتے ہیں؟

محمد حسین۔ انھوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے اور .... اور۔

علامہ۔ اور کیا؟

محمد حسین اور لکھا ہے کہ ملاقات کیلئے فوراً بہاولپور آیئے۔

علامہ۔ بہاولپور آیئے؟.... (ایک لمحہ کی برہم خاموشی کے بعد)

کیا نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے ؟ کہ ان کے بلانے پر فوراً اچھل پڑوں۔

محمد حسین۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تو پھر کیا جواب دوں نواب صاحب کو ؟

علامہ۔ لکھدیجئے مجھے فرصت نہیں۔

راوی۔ اگر علامہ نواب صاحب کے بلاوے پر چلے جاتے تو کئی ہزار کی یافت کی گنجائش بھی تھی لیکن علامہ کو کون خرید سکتا تھا۔ اس کا پس منظر کیا تھا اس کی تفصیل ایک اور ملاقات میں حکیم یوسف حسن کو چودھری محمد حسین نے بتائی واقعہ کچھ یوں تھا کہ ریاست بھاولپور میں جس شخص کو وائسرائے نے ریاست کا وزیر اعظم نامزد کر کے بھیجا تھا وہ نواب صاحب بھاولپور کی منشا کا آدمی نہ تھا۔ پہلے تو خود نواب صاحب وائسرائے کو لکھتے رہے کہ موجودہ وزیر اعظم سے میری جان چھڑائی جائے یہ انتخاب مجھے پسند نہیں۔ لیکن جب بات نہ بنی تو کسی کے مشورے سے علامہ صاحب سے رجوع کیا اور وکالت کی درخواست کی علامہ نے بہ حیثیت بیرسٹر مقدمہ کا جائزہ لیا اور وکالت کرنا منظور کر لیا اور چار ہزار روپے مقدمے کی فیس قرار پائی۔ علامہ وائسرائے کے پاس دلی پہنچے سیکرٹری کو اپنا کارڈ دیا۔ سیکرٹری نے کہا قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملاقاتی اپنا نام رجسٹر میں لکھتا ہے رجسٹر اندر جاتا ہے لہذا جسے بلانا مقصود ہوتا ہے بلا لیا جاتا ہے۔ لہذا آپ بھی کارڈ دینے کے بجائے رجسٹر میں اپنا نام لکھیں۔ اس پر علامہ اقبال نے جواب دیا اگر وائسرائے میرے کارڈ پر مجھ سے ملنا نہ چاہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا مگر عام لوگوں کی طرح رجسٹر میں نام نہ لکھوں گا۔ مجبوراً سیکرٹری کو کارڈ لے کر

ہی اندر جانا پڑا۔ وائسرائے نے کارڈ دیکھتے ہی کہا میں ان سے ضرور ملوں گا۔ انھیں ملاقاتیوں کے کمرہ میں بٹھایا جائے تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے کمرے میں آئے تو علامہ اور وائسرائے کے درمیان سیر گفتگو ہوئی۔

وائسرائے۔ فرمایئے، ڈاکٹر صاحب میں آپ کیلئے کیا کر سکتا ہوں کیسے تکلیف کی آپ نے؟

علامہ۔ میں ایک وکالت کیلئے آیا ہوں۔

وائسرائے۔ فرمایئے کیا معاملہ ہے؟

علامہ۔ معاملہ یہ ہے کہ آپ نے جس شخص کو ریاست بہاولپور میں وزیر اعظم بنا کے بھیجا ہوا ہے اس کا رویہ نواب صاحب کیساتھ مناسب نہیں بہتر ہوگا کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔

وائسرائے ضابطے کے مطابق نواب صاحب کو اس نامزد وزیر اعظم کو قبول کرنا چاہیئے۔

علامہ۔ ضابطہ اپنی جگہ، لیکن کیا سیاست اسی کا نام ہے کہ آپ ایک فرمانروا کے ایک معمولی مطالبے کو بھی نہیں مان سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نواب، حکومتِ برطانیہ کا وفادار دوست ہے۔ پھر مسلمانوں میں اس کی بڑی وقعت ہے اگر ایسی چھوٹی سی بات بھی نہ مانی گئی تو بدمزگی ہوگی انتشار پھیلے گا اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وزیر اعظم کو خاموشی سے تبدیل کر دیا جائے اس میں آپ کا کوئی حرج نہیں فائدہ سب کا ہے۔

وائسرائے۔ (کچھ سوچ کر) اچھا آپ کہتے ہیں تو یوں ہی سہی آپ کا کہا

میں ٹال نہیں سکتا

علامہ۔ صرف میرے کہنے کی بات نہیں۔

وائسرائے۔ ہاں۔ بات بھی ٹھیک نظر آتی ہے اچھا ڈاکٹر صاحب یہ معاملہ نوٹ ہوا اب آپ سے میری ایک درخواست ہے۔

علامہ۔ فرمائیے۔

وائسرائے۔ آپ پرسوں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔

علامہ۔ لیکن میں تو آج واپس جا رہا ہوں۔

وائسرائے۔ اچھا تو کل ہی سہی۔

علامہ۔ میں تو آج ہی واپس جاؤں گا کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔

وائسرائے۔ میری خواہش تھی کہ میں آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی خوشی بھی حاصل کرتا۔

علامہ۔ یہ خواہش ہے تو آج ہی کھانا کھلا دیجئے۔

راوی۔ چنانچہ وائسرائے نے اپنی پہلے سے طے کی ہوئی مصروفیات منسوخ کر کے علامہ کے ساتھ کھانا کھایا اور علامہ اسی رات دہلی سے لاہور کو پروگرام کے مطابق روانہ ہو گئے۔

چند روز بعد وائسرائے نے ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم کو تبدیل کر دیا۔ جب اس تبدیلی کی اطلاع نواب صاحب کو پہنچی تو انھوں نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو شکریئے کا تار دیا۔ اور ملاقات کی دعوت دی، غالباً کچھ مزید خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن علامہ دربارداری کے تو قائل ہی نہ تھے نہ پیسے کی انھیں پرواہ تھی اس لئے انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

راوی۔ علامہ کی وکالت سے آمدنی کبھی بھی زیادہ نہیں تھی۔ ۱۹۳۴ء سے علالت کے باعث یہ ذریعہ بھی ختم ہوگیا تو علامہ کو خاصی مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر علامہ کے عقیدت مند اور دوست سر راس مسعود نے بھوپال کے نواب حمید اللہ خان سے جو خود بھی علامہ سے بڑی ارادت رکھتے تھے پانسو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کروا دیا۔ اور مزید پانسو کیلئے سر آغا خان سے سلسلہ جنبانی شروع کی علامہ کو خبر ہوئی تو فرمایا۔

علامہ۔ میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی مسلمان کیلئے شایان نہیں۔

ٹ

خودداری و غیرت مندی

راوی۔ جنوری ۱۹۳۸ء کی ایک شام کا ذکر ہے سید نذیر نیازی حسبِ معمول علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

نیازی۔ السّلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ وعلیکم السّلام۔ آئیے نیازی صاحب میں آپ کا انتظار کر رہا تھا کچھ اشعار ہوگئے ہیں بیاض میں نقل کر دیجئے۔

(علامہ کاغذ کے ایک پرزے کی مدد سے لکھواتے ہیں)

(شعر اگلے صفحہ پر)

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

نیازی۔ ان اشعار کی شانِ نزول کیا ہے ؟

علامہ۔ سر اکبر حیدری صدرِ اعظم حیدرآباد دکن نے یومِ اقبال کے موقعہ پر مجھے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا تھا اس کے سرنامے کے الفاظ یہ تھے۔

" یومِ اقبال کے موقعہ پر حضور نظام کے توشہ خانہ سے جو صدرِ اعظم کے ماتحت ہے۔ "

پیشکش کے اس انداز کی وجہ سے میری غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ اسے قبول کروں اس لئے چیک میں نے واپس کر دیا۔ یہ اشعار اسی تاثر کا نتیجہ ہیں۔

ٹ

راوی۔ علامہ نواب سر ذوالفقار علی خان کی عیادت کیلئے دہرہ دون جا رہے تھے ان دنوں وہاں حکیم اجمل خان بھی تھے ان کو بھی تار دے

دیا۔ جب حکیم صاحب کو تار ملا تو نواب صاحب رام پور کے ہاں جو دہرہ دون ہی میں مقیم تھے۔ علامہ اپنے احباب کے ساتھ حکیم صاحب کی قیام گاہ پر گئے تو دوران ملاقات یہ باتیں بھی ہوئیں۔

حکیم اجمل خان۔ چونکہ آپ کا تار مجھے نواب صاحب کی موجودگی میں ملا تھا۔ لہذا وہ بھی آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے۔

علامہ۔ میں صرف اس شرط پر ان سے ملاقات کروں گا کہ وہ نہ تو مجھ سے اشعار سننے کی فرمائش کریں اور نہ ہی اپنے اشعار مجھے سنائیں۔

☆

راوی۔ علامہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کر کے ملوجا نامی جہاز میں واپس آ رہے تھے اسی جہاز پر نظام حیدر آباد کے دوسرے شہزادے معظم جاہ بھی سفر کر رہے تھے وہ ایک بار ملاقات کے لئے آئے۔

معظم جاہ۔ ڈاکٹر صاحب کچھ سنایئے۔

علامہ۔ کچھ یاد نہیں۔

معظم جاہ۔ اگر اجازت ہو تو خود ایک تازہ غزل پیش کروں اگر اصلاح فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔

علامہ۔ شہزادہ صاحب غزل کیا سنانا، شعر کہنے کا ذوق صرف تمہارے دادا میر محبوب علی خان کو تھا اور بس، نہ تمہارے باپ

میں یہ ذوق ہے اور نہ کسی اور میں اور کہئے لندن کا سفر کیسے رہا؟

ث

راوی۔ علامہ شعر سنانے اور فرمائشی شعر کہنے کے بارے میں نازک مزاج تھے۔ اس سلسلہ میں بڑوں بڑوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے علامہ جب حیدر آباد دکن گئے تو ریاست کے وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جن کے علامہ سے بڑے مراسم تھے علامہ کے اعزاز میں ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا جس میں ریاست کے بڑے بڑے امرا وزرا بھی مدعو تھے مقصد یہ تھا کہ دعوت کے بعد حیدر آباد کے عمائدین علامہ کے کلام سے محفوظ و مستفیض ہوں۔

سرکشن پرشاد۔ ڈاکٹر صاحب آج شب آپ کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

علامہ۔ اور کون کون مدعو ہیں؟

سرکشن پرشاد۔ حیدر آباد کے سارے عمائدین کو میں نے زحمت دی ہے۔ اچھا موقعہ ہے یہ لوگ آپ کی زیارت کر لیں گے۔ امید ہے کہ آپ دعوت کو قبول فرمائیں گے۔

علامہ۔ مہاراجہ صاحب، آپکی دعوت سر آنکھوں پر، صرف ایک شرط ہے۔

سرکشن پرشاد۔ وہ کیا؟

علامہ۔ کہ کھانے کے بعد مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے۔

سر کشن پرشاد۔ شرط تو بڑی کڑی ہے آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔

راوی۔ علامہ کے ایک پرانے دوست جلال الدین سے روایت ہے کہ ایک بار ان کے ہاں راجہ نوشاد علی خان کے اعزاز میں رقص و سرود کی محفل کا اہتمام ہوا اس زمانے کی نامور مغنیہ بہار نے گانا سنایا سب محفوظ ہوئے۔ اس محفل میں علامہ بھی مدعو تھے۔ بہار کے جانے کے بعد یہ واقعہ ہوا۔

راجہ نوشاد۔ حضرت، آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنے ایک مدت گزر گئی۔ کچھ ارشاد فرمائیے۔

علامہ۔ کچھ یاد نہیں۔

راجہ نوشاد۔ کچھ تو مرحمت ہو۔

علامہ۔ (رکھائی سے) کہہ چکا ہوں یاد نہیں۔

نوشاد علی۔ (نواب ذوالفقار علی سے) نواب صاحب آپ ہی سفارش کے ممنون فرمائیے۔

ذوالفقار علی۔ ہاں ڈاکٹر صاحب کچھ عنایت ہو، دو چار شعر ہی سہی۔

(لیکن علامہ اقبال اشعار سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے)

نوشاد علی۔ اچھا اب اجازت دیجئے بڑی اچھی محفل تھی بیحد شکریہ خاص طور پر مرزا صاحب آپ کا آپ نے بڑا اہتمام کیا تھا۔

(راجہ نوشاد علی خان کے رخصت ہونے کے بعد)

مرزا جلال الدین۔ بڑی بدمزگی ہوگئی بھئی اقبال، یہ کیا طریقہ ہے؟

نواب ذوالفقار۔ کچھ تو خیال کیا ہوتا!

علامہ۔ یہ شخص وجاہت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاہتا تھا۔ میں

وجاہت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا

٭

راوی۔ شخصیت پرستی کو علامہ غیر اسلامی روایت سمجھتے تھے اسی وجہ سے خود بھی بڑی بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس سلسلہ میں خود علامہ نے ایک واقعہ بیان کیا

نئی دلی میں ایک بڑی تقریب تھی جس میں وائسرائے کے علاوہ ہندوستان کی ریاستوں کے فرمانروا اور ملک کے دوسرے بڑے بڑے مشہور لوگ موجود تھے جب گاندھی جی آئے تو تقریباً سب لوگ تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے وہ جس کے سامنے سے گزرتے وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوتا مگر جب وہ علامہ کے پاس سے گزرے تو علامہ بدستور اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اس کے بعد وائسرائے نے چند لوگوں کی دعوت کی جن میں علامہ بھی شامل تھے دعوت کے بعد وائسرائے نے علامہ سے تنہائی میں پوچھا۔

وائسرائے۔ میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں بشرطیکہ آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔

علامہ۔ کہیئے۔

وائسرائے۔ تقریب پر مہاتما گاندھی کی تعظیم کیلئے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ میں نے سر شفیع کو بھی اٹھتے ہوئے دیکھا مگر آپ اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے اس کا کیا سبب ہے؟

علامہ۔ غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں کئی مسلمان ایسے

ہیں جن کے باپ دادا ہندو تھے۔ ان میں سے اکثر وبیشتر ہنوز اپنے اجداد کی صفات سے متصف ہیں۔ الحمدللہ میں ان میں سے نہیں۔

۵

راوی۔ خوش معاملگی اور انسانی ہمدردی علامہ پر ختم تھی۔ ۱۹۲۲ء میں انارکلی سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی جس کوٹھی میں منتقل ہوتے وہ ان کے شایانِ شان نہ تھی۔ نہایت بدنما اور بوسیدہ اور کرایہ پونے دوسو روپے دوست، احباب اور نیازمند انھیں اکثر اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ایک روز علامہ سے عبدالمجید سالک کی یہ گفتگو ہوئی۔

سالک۔ ڈاکٹر صاحب یہ کوٹھی بدنما ہونے کے علاوہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔

علامہ۔ جی ہاں، اس میں کھڑے رہنے کی کوئی بات نہیں (ہنس کر) صرف میری دعاؤں سے قائم ہے۔

سالک پھر پونے دوسو روپے کرایہ حضرت یہ تو پیسہ برباد کرنے والی بات ہے۔ اس کرائے میں اس سے کہیں بہتر کوٹھی مل سکتی ہے۔

علامہ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں دوسرے احباب کا بھی یہی خیال ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گزران اسی کے کرائے پر ہے مجھے یہ کوٹھی چھوڑنے یا کرایہ کم کرانے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے [1]

[1] ملفوظاتِ اقبال

بحیثیتِ ممتحن!

راوی۔ علامہ یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات کے ممتحن بھی ہوتے تھے
پرچے دیکھنے کے سلسلے میں علامہ کا اصول یہ تھا کہ پورا پرچہ
پوری توجہ سے دیکھتے تھے اور ہر روز جتنے پرچے دیکھ لیتے تھے وہ
اسی شام علی بخش کے ہاتھ رجسٹرار کو بھیج دیتے تھے (علامہ کے استاد
مولوی میر حسن پرچے دیکھنے میں ان سے بھی زیادہ محتاط تھے۔ ان کا اصول
یہ تھا کہ ان کے پاس جو پرچے آتے ان سب کو فرش پر ترتیب وار
پھیلا دیتے تھے سب سے پہلے تمام پرچوں میں پہلے سوال کا
جواب دیکھتے اور سب پرچے پڑھ جاتے اس طرح ایک اندازہ ذہن
میں قائم کر لیتے پھر سارے پرچوں کے پہلے سوال پر نمبر لگاتے جاتے
پھر دوسرے پر اس کے بعد تیسرے پر۔)

ایک مرتبہ علامہ ایل ایل بی کے ایک پرچے کے ممتحن تھے
قانون کا ایک طالب علم جو بار بار فیل ہوجاتا تھا وہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی
اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی ڈاکٹر
صاحب سے اس کی سفارش کی جائے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ
ڈاکٹر صاحب سے سفارش کی جرأت کوئی بھی نہیں کر سکتا اس نے
اصرار کیا اور دلیل یہ پیش کی پرچہ بہت مشکل تھا اس دلیل کی

بنیاد پر دونوں نے احتیاط سے علامہ سے بات کی

چغتائی۔ ڈاکٹر صاحب سنا ہے کہ ایل ایل بی کا یہ پرچہ بہت مشکل تھا۔

تاثیر۔ مروجہ معیار سے زیادہ اونچا تھا۔

چغتائی۔ عام طالب علم تو کتاب کے سہارے ہی چلتے ہیں۔

علامہ۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

چغتائی۔ ہم کسی ایک امیدوار کی سفارش نہیں کر رہے بلکہ ایک اصولی بات کر رہے ہیں آپ دیکھ لیجئے کہ یہ تاثر صحیح ہے یا غلط۔

علامہ۔ اصول کی حد تک میں آپ سے متفق ہوں اگر نظر ثانی کی تو سب پرچوں پر کروں گا۔

راوی۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک اصول کے تحت علامہ نے تمام امیدواروں کے پرچوں پر نظر ثانی کی اور سب کے نمبر بڑھا دیئے جس سے اس خاص امیدوار کو بھی فائدہ پہنچا (۱)

ؐ

راوی۔ علامہ مدت العمر مختلف امتحانوں کے ممتحن رہے پرچے سیٹ بھی کرتے تھے صدر ممتحن بھی ہوتے تھے اس سلسلہ میں بھی انھوں نے بعض اصول وضع کر لئے تھے جن پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ ایک بار ایک مستحق مسلم امیدوار کے فارسی کے پرچے کا مسئلہ تھا مسئلہ کی سنگینی اس حد تک تھی کہ حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر جیسے ثقہ حضرات علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے

(۱) حیات اقبال۔

شیخ عبدالقادر۔ ڈاکٹر صاحب اگر یہ مسلمان طالب علم فیل ہو گیا تو سٹیٹ اسکالرشپ کوئی ہندو لے جائیگا۔

شیرانی۔ پرچہ کی طوالت کی وجہ سے اس ہونہار طالب علم سے ایک غلطی ہو گئی۔

عبدالقادر۔ ڈاکٹر صاحب آپ پرچہ تو دیکھئے۔

علامہ۔ (پرچہ دیکھ کر) آپ کے اُمیدوار کے چھبیس نمبر ہیں جو مستحق ہے اسے یہ اسکالرشپ ملنا چاہیئے میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں کاربند ہوں اور اپنے افعال کا جواب دہ ہوں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

راوی۔ اسی طرح ایک بار مولوی محمد شفیع نے کسی کی سفارش کرنے کے بارے میں استدعا کی۔

محمد شفیع۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملہ میں آپ سفارش کر سکیں تو ....

علامہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں لوگوں کی سفارش نہیں کرتا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی سفارشات شاذ و نادر ہی کارگر ہوتی ہیں میں اس سلسلہ میں اپنے گذشتہ گناہوں سے پشیمان ہوں۔ تجربہ نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی ہے کہ یہ خود داری کے منافی ہے بلا نتیجہ سفارش کرتے جانا مجھے ذلت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

⁂

راوی۔ علامہ بڑے سخت ممتحن تھے نمبر غیر معمولی احتیاط سے دیتے تھے۔

علامہ محمود شیرانی، ڈاکٹر تاثیر ایک سفارش لیکر آئے۔ ڈرتے
ڈرتے بات چھیڑی۔

تاثیر۔ پرچہ کچھ مشکل تھا اس لئے برخوردار کے نمبر کچھ کم ۔۔۔۔

شیرانی۔ کچھ مجبوری آپڑی ہے۔

علامہ۔ یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ نااہل اور نالائق نوجوان میری
قوم میں سے نہیں ہیں۔

ٹ

اولاد سے شفقت و محبّت

راوی۔ ۱۹۳۴ء کے وسط میں علامہ جاوید اقبال کو لیکر سرہند
تشریف لے گئے تھے اس کی توجیہہ علامہ نے خود فرمائی۔

علامہ۔ چند روز ہوئے صبح نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی خواب
میں کسی نے پیغام دیا ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان
کے بارے میں دیکھا ہے وہ سرہند بھیجا ہے ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ
تم پر بڑا فضل کرنے والا ہے پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا۔
کون ہے اس خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے
اس کے علاوہ جب جاوید پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب
وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا۔

راوی۔ سرہند کی زیارت کے بارے میں جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

میں نے سن رکھا ہے کہ میری پیدائش سے چند سال قبل ابا جان شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایک بیٹا عطا کرے۔ آپ نے حضرت مجدد سے یہ عہد بھی کیا کہ اگر خداوند تعالیٰ نے انھیں بیٹا دیا تو اُسے ساتھ لیکر مزار پر حاضر ہوں گے۔

آپ کی دعا پوری ہوئی اور کچھ عرصے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ہمراہ لیکر دوبارہ سرہند پہنچے۔ ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے اس وقت ہم دو ہی تربت کے قریب بیٹھے تھے گنبد کی تاریک اور خاموش فضا میں ان کی گونجتی ہوئی آواز ایک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آنسو اُن کی آنکھوں سے اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ (۱)

۲

راوی۔ اقبال کے ایک عقیدت مند اور ہر وقت کے حاضر باش م۔ ش (محمد شفیع) نے اپنے مضمون جاوید منزل میں لکھا ہے۔

گھر میں کام کرنیوالی بھنگن جس کے پاؤں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے ہوتے تھے۔ جب صفائی کیلئے جاوید منزل آتی تو اپنے بیٹے کو جو جاوید کا ہم عمر تھا ساتھ لے آتی۔ جب تک

(۱) تذکرہ اقبال

وہ کام میں مصروف رہتی یہ بچہ جاوید منزل کے صحن میں اِدھر اُدھر
کھیلتا رہتا۔ گرمیوں کے موسم میں ایک دن ڈاکٹر صاحب برآمدہ
میں آرام کرسی ڈالے آرام کر رہے تھے تو ان کی نگاہ بھنگن کے
بچے پر پڑی اُسے چند لحظے دیکھنے کے بعد فرمایا۔

علامہ۔ شفیع جی اس بچے کو دیکھ رہے ہیں آپ ؟

م بخش۔ جی ہاں۔

علامہ۔ میں جب بھی اس بچے کو دیکھتا ہوں تو میرا دل اضطراب
سے پارے کی طرح تڑپ اُٹھتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ سماج کی
زنجیروں کی وجہ سے یہ بچہ زندگی میں صرف خاکروب بن سکے گا۔
حالانکہ اس میں اور جاوید میں جہاں تک انسان ہونے کا تعلق
ہے کوئی فرق نہیں۔ اگر جاوید ذہانت میں اس لڑکے سے کم بھی ہو
تو محض اس وجہ سے کہ وہ میرا بیٹا ہے اس پر ترقی کے راستے
کھلیں گے (۱)

❀

راوی۔ علامہ کے افغانستان کے سفر سے واپس آنے کے
کچھ دنوں بعد کا واقعہ ہے کہ فقیر سید نجم الدین علامہ سے اس
سیاحت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اتنے میں جاوید
کھیلتے کھیلتے سامنے آ گئے۔

نجم الدین۔ (جاوید کا ہاتھ پکڑ کر شفقت سے) تمہارا باپ تو بادشاہوں

کو سبق دیتا ہے۔ بڑے ہو کے تم کیا کرو گے؟

علامہ۔ (آبدیدہ ہو کر) نجم الدین میرے دل کا بادشاہ تو یہی ہے۔

ث

راوی۔ جاوید اور منیرہ دونوں چھوٹے تھے دونوں میں لڑائی جھگڑا ہو جایا کرتا تھا علامہ بہن بھائی کے جھگڑے سے بہت آزردہ ہوتے تھے وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے تھے یہ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اور احباب کے یہ کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے ان کی تسلی نہ ہوتی ایک روز معمول کے مطابق بھائی بہن میں جھگڑا ہوا۔ منیرہ نے شکایت کی تو علامہ نے جاوید کو بلا کر کہا۔

علامہ۔ تمہارا دل پتھر کا ہے تم بڑے سنگدل ہو آنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

ث

راوی۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون" اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" میں اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی

ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے علامہ کے کمرے کیطرف گئے وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ کیوں کہ ان دنوں وہ خود بھی بیمار تھے گلہ بیٹھ چکا تھا۔ اور صاف بول نہ سکتے تھے۔ میں اور منیرہ دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے یوں روتے دیکھ کر انھوں نے ہمیں انگلی کے اشارے سے قریب آنے کو کہا اور جب ہم دونوں ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھالیا پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے میرے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے گویا ہوئے۔

علامہ۔ تمہیں یوں رونا نہ چاہیئے یاد رکھو تم مرد ہو، اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے (۱)

⁂

راوی۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسی مضمون "اقبال ایک باپ کی حیثیت سے" میں قائدِ اعظم کے جاوید منزل تشریف لانے اور ان سے آٹو گراف لینے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

علامہ۔ علی بخش حقہ تازہ کر دو اور ذرا جاوید میاں کو بلاؤ۔

جاوید۔ آپ نے مجھے بلایا ہے۔؟

علامہ۔ ہاں۔ بیٹے بیٹھو! تمہیں آٹو گراف لینے کا شوق ہے

جاوید۔ جی ہاں اباجی۔

علامہ۔ آج ہمارے ہاں ایک خاص مہمان آ رہے ہیں جب وہ آ کر

۱۔ ایضاً

بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر کے بعد تم کمرے میں آنا اور ان سے آٹوگراف لینے کی درخواست کرنا۔

جاوید۔ یہ خاص مہمان کون ہیں؟

علامہ۔ یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر اور رہنما مسٹر محمد علی جناح ہیں۔

راوی۔ یہ گفتگو ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کی شام کی ہے کچھ دیر بعد قائدِ اعظم اپنی بہن فاطمہ جناح کے ساتھ تشریف لائے۔ حسبِ ہدایت جاوید اندر آئے۔

جاوید۔ السلام علیکم۔

قائدِ اعظم۔ وعلیکم السلام

علامہ۔ میرا بیٹا جاوید۔

قائدِ اعظم۔ خوب۔

جاوید۔ (آٹوگراف بک آگے بڑھاتے ہوئے) آٹوگراف

(آٹوگراف دینے کے بعد)

قائدِ اعظم۔ کیا تم شعر بھی کہتے ہو۔

جاوید۔ جی نہیں۔

قائدِ اعظم تم کیا بنو گے

(خاموش رہتے ہیں کوئی جواب نہیں دیتے)

قائدِ اعظم (ہنستے ہوئے علامہ سے) کوئی جواب نہیں دیتا۔

علامہ۔ وہ جواب نہیں دے گا کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اسے بتائیں گے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ (۱)

(۱) حیاتِ اقبال۔ ص ۲۷۸۔

راوی۔ جاوید اقبال نے اپنے بچپن کے تاثرات میں لکھا ہے کہ علامہ بچوں کیساتھ اپنی محبت اور چاہت کے اظہار میں بہت محتاط تھے لیکن جب جاوید ذرا بڑے ہوئے اور اسکول جانے لگے تو اکثر انھیں پاس بلاکر بٹھایا کرتے اور نصیحتیں کرتے ایک روز کہا۔

علامہ۔ بیٹے لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کے بجائے اُن سے بات چیت کرنی چاہیئے تقریر کرنا سیکھو اور ہاں اکھاڑہ میں کشتی لڑا کرو گھر میں اکھاڑہ اسی لئے کھدوایا گیا ہے۔ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا صحت کیلئے نہایت مفید ہوتا ہے۔ بڑی عید آرہی ہے بکرے کے ذبح ہوتے وقت وہاں موجود رہنا مجھے پتہ چلا ہے کہ تم ساتویں کے امتحان میں اس لئے فیل ہو گئے کہ تم امتحان کے دوران الف لیلیٰ پڑھتے رہے اگر تم امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا بیٹا، قصے کہانیوں کے علاوہ دنیا کے جری سپہ سالاروں کے حالات بھی پڑھا کرو۔ خالدؓ بن ولید، حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں، میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا اسلامی تاریخ بھی پڑھو۔ واسکوڈیگاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا راستہ دکھایا تھا۔ نپولین کے آبا و اجداد عرب سے آئے تھے۔

جاوید۔ نپولین کی فلم لگی ہے دیکھ لوں؟

علامہ۔ ہاں بیٹے مجھے پتہ چلا ہے کہ نپولین کی فلم لگی ہے کوئی بتا رہا تھا کہ اس میں اس کے حالاتِ زندگی ہیں میں تمہیں فلمیں دیکھنے کی اجازت نہ دیتا مگر ایک بہادر سپہ سالار کے بارے میں یہ فلم تم دیکھ سکتے ہو۔

راوی۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ابا جان کی اجازت سے یہ فلم میں نے دیکھی ضرور لیکن ابا جان کو کسی نے غلط اطلاع دی تھی یہ فلم نپولین کے جنگی کارناموں کے بارے میں نہیں، اس کے معاشقوں کے بارے میں تھی (۱)

علامہ کی آخری علالت کے زمانے کی بات ہے سرِ شام جاوید کو بلایا۔

علامہ۔ علی بخش۔

علی بخش۔ جی۔

علامہ۔ جاوید کو بلاؤ۔

جاوید۔ آپ نے مجھے بلایا ابا جی۔

علامہ۔ بیٹے میرے پاس آ کے بیٹھا کرو خاص طور پر جب لوگ بیٹھے ہوں اور بحث مباحثہ ہو رہا ہو۔

جاوید۔ بیٹھوں گا۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں پھر مجھے پتنگ اُڑانی ہوتی ہے مجھے تو کرکٹ اچھی لگتی ہے۔

علامہ۔ پتنگ بھی اُڑاؤ کھیلو بھی لیکن میرے پاس بھی بیٹھا کرو۔

(چودھری محمد حسین آجاتے ہیں)

محمد حسین۔ السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

علامہ۔ وعلیکم السلام آئیے چودھری صاحب۔

---

(۱) حیاتِ اقبال ص ۲۸۷

☆

(جاوید اقبال کھسک جاتے ہیں)

محمد حسین۔ جاوید سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟

علامہ۔ یہ لڑکا نہ جانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے؟

محمد حسین ابھی بچہ ہے۔

علامہ۔ میں سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا۔

☆

راوی۔ بچپن میں جاوید کو روز ایک آنہ خرچ کرنے کو ملا کرتا تھا اس کو خرچ کرنے کے بعد ان کو کسی قیمت پر مزید پیسے نہیں ملتے تھے ایک روز ایک مٹھائی والا ان کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ جاوید کی طبیعت مچل گئی اپنا آنہ خرچ کر چکے تھے امی جان سے مانگا۔ انھوں نے انکار کیا تو انھوں نے چپکے سے علامہ کے کمرے کے ٹیبل فین کے پیچھے کا پیتل کا پرزہ نکالا اور اس کے بدلے میں مٹھائی لے لی ان کی بدقسمتی سے شوفر نے ان کو یہ سودا کرتے دیکھ لیا۔ اس نے علامہ سے شکایت کی۔

علامہ۔ جاوید ادھر آؤ۔

جاوید۔ جی۔

علامہ۔ احمق آدمی بیوقوف ایسا کرتے ہیں۔

(پیٹھ اور گردن پر دو تین دھپ مارتے ہیں)

بیوقوف۔

☆

راوی۔ علامہ انگریزی لباس کو پسند نہیں کرتے تھے جاوید کو بھی ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے اور سادہ کپڑے پہننے کو کہتے ایک بار جاوید بازار سے قمیض کا کپڑا خرید کر لائے۔

جاوید۔ دیکھئے ابا جان قمیض کا کپڑا۔

علامہ۔ (دیکھ کر) یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔

جاوید۔ روپیہ گز کا ہے۔

علامہ۔ میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ دس بارہ آنے گز سے زیادہ کا کپڑا نہ لیا کرو تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو؟ تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے؟ اگر تم نے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔

راوی۔ اسلامی تہذیب اور طور طریق کے بارے میں علامہ بہت حساس تھے ایک روز منیرہ اسکول جانے سے پہلے سلام کرنے کیلئے حاضر ہوئی۔

منیرہ۔ ابا جان السلام علیکم میں جا رہی ہوں۔

علامہ۔ بیٹی ذرا پاس آؤ۔ (قریب آتی ہے) یہ تم نے بال کس طرح گوندھ رکھے ہیں؟ اپنے بالوں کو دو چٹیوں میں مت گوندھا کرو۔

منیرہ۔ کیوں؟

علامہ۔ یہ یہودیوں کا انداز ہے۔

٭

راوی۔ علامہ کی بیٹی منیرہ کو بالوں میں کنگھی کرانے سے بڑی چڑ تھی وہ کمرے میں آئی تو بال بکھرے ہوئے تھے اس کی ماں (سردار بیگم) نے کہا بیٹی ادھر آ میں تیرے کنگھی کر دوں۔ وہ کنگھی سے بچنے کیلئے بھاگنے لگی ماں نے پکڑ کر بالوں کو کنگھی سے سلجھایا اور سنوارنا شروع کر دیا اس پر وہ رونے لگی علامہ اس کے رونے کی آواز سن کر اندر آ گئے۔

علامہ۔ منیرہ کیوں رو رہی ہے۔؟

بیگم۔ بالوں میں کنگھی نہیں کرانا چاہتی۔

علامہ۔ کنگھی کرائے یا نہ کرائے مگر اس کو رونے نہ دیا کرو۔ میں اس کے رونے کی آواز نہیں سن سکتا۔ دل کو تکلیف ہوتی ہے۔

٭

راوی۔ علامہ کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار انھیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ جاوید اقبال نے بھی ان سے قرآن مجید پڑھا۔ ان کی آواز بڑی پُرسوز تھی۔ ایک بار وہ تشریف لائے۔

قاری صاحب۔ السلام علیکم

علامہ۔ وعلیکم السلام عرب صاحب تشریف رکھئے کیا حال ہے؟

قاری صاحب۔ الحمدُللہ۔

علامہ۔ علی بخش، ذرا جاوید میاں کو بلاؤ۔

جاوید۔ جی اباجی۔

علامہ۔ بیٹے۔ عرب صاحب سے قرآن مجید سنو۔

(عرب صاحب سے)، آج آپ کیا سنائیں گے؟

قاری صاحب۔ سورہ مزمل شروع کرتے ہیں اعوذ باللہ ..... بسم اللہ۔

علامہ۔ (جاوید سے مرتعش لہجے میں)، تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیئے۔

٭

راوی۔ جاوید لکھتے ہیں کہ سورہ مزمل سنتے وقت اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔ میں نے انھیں اماں جان کی موت پر بھی آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا رسول اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔ (۱)

٭

راوی۔ آخری ایام میں علامہ کی بینائی موتیے کی وجہ سے تقریباً زائل ہو گئی تھی اس لئے جاوید کو حکم تھا کہ ہر روز انھیں اخبار پڑھ کر سنایا کریں کبھی کبھی کوئی غزل بھی سنتے۔

ایک رات م ـ ش کی موجودگی میں جاوید کو بلوایا۔

علامہ۔ شفیع جی، جاوید کو بلوائیے۔

م۔ش۔ (برآمدہ میں جاکر) علی بخش ذرا جاوید میاں کو بلاؤ۔

علامہ۔ بیٹے کوئی غزل تو سناؤ۔

جاوید۔ ایک ہی یاد ہے گیسوئے تابدار کو۔ ۔ ۔ ۔

علامہ۔ وہی سہی۔

جاوید (ٹالتے ہوئے) ابھی چند دن ہوئے تو سنائی تھی۔

علامہ۔ پھر سناؤ بیٹے۔

جاوید۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تُو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بےکنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

جاوید۔ بس اتنا ہی۔

علامہ۔ شاباش بس ذرا شعر کو شعر کی طرح پڑھا کرو۔ اچھا کوئی نعت یاد ہے۔۰؟

جاوید۔ صرف ایک یاد ہے۔

علامہ سناؤ۔

جاوید۔ وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

وہ نبیوں میں رحمت . . . . .

م۔ بشس (دھراتے ہوئے) وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا۔

علامہ۔ (آبدیدہ ہوکر) صلّی اللہ علیہ وسلّم۔

راوی۔ فقیر وحید الدین خدمت میں باریاب تھے دعا کی تاثیر پہ باتیں ہو رہی تھیں۔

علامہ۔ جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے ضرور قبول ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دعا کا اثر فوری طور پر ظاہر ہو بعض دعائیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا اثر کہیں موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے دعا کی تاثیر کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔

وحیدالدین۔ وہ کونسا ؟

علامہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ لاہور میں تیسری شادی کے بعد میں مدت تک اولاد سے محروم رہا۔ جب میں تقریباً پچاس برس کا ہو چکا تھا تو میں نے حضرت مجدد الف ثانی کی درگاہ میں حاضر ہو کے دعا کی کہ اللہ مجھے بیٹا دے جسے میں اعلیٰ تعلیم دلا سکوں۔ اس واقعہ کو بھی پانچ چھ برس گزر گئے اور دعا کی قبولیت کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ ایک دن شام کو میں زنان خانے میں گیا تو کیا دیکھا کہ جاوید کی والدہ طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کے بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے ــ

" الٰہی اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے

اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔ "

دعا قبول ہوئی چنانچہ اسی سال جاوید سلمہ، تولد ہوئے یہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے (۱)

ٹ

راوی۔ علامہ

ابھی میکلوڈ روڈ کی کرائے کی کوٹھی میں رہتے تھے کہ میاں بیوی میں یہ گفتگو ہوئی۔

بیگم میں نے کہا کبھی میری بھی سنا کریں۔

(۱) روزگارِ فقیر حصہ اول

علامہ۔ ہوں۔

بیگم۔ آپ تمام دن گھر پر رہتے ہیں کیا اچھا نہ ہو کہ آپ کہیں ملازمت کرلیں۔

علامہ۔ (مسکرا کر)۔ ہوں۔

بیگم۔ آخر کب تک ہم کرائے کے مکان میں رہتے رہیں گے ماشا اللہ بچہ بھی بڑا ہو رہا ہے۔ اب اپنا گھر بنانے کی فکر کرنا چاہیئے۔

علامہ ہاں۔ کرنا تو چاہیئے۔

٭

راوی۔ ایک عرصے تک علامہ کی لدھیانے والی بیگم ممتاز بیگم اور لاہور والی بیگم سردار بیگم ساتھ ساتھ رہیں۔ ان کے درمیان سوکناپے کا کوئی معاملہ نہیں تھا بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں علامہ دونوں میں انتہائی عدل مدِنظر رکھتے تھے۔ عبدالمجید سالکؔ نے یہ چشم دید واقعہ نقل کیا ہے۔

علی بخش۔ ڈاکٹر صاحب سنار آیا ہے۔

علامہ۔ بلاؤ اُسے۔

سنار۔ جناب یہ دونوں زیور تیار ہیں دیکھ لیجئے۔

علامہ۔ ذرا ان کو تولو۔

سنار۔ میں تول چکا ہوں یہ کڑا دوسرے سے دو ماشہ کم ہے۔

علامہ۔ علی بخش! یہ کپڑے اندر لے جاؤ بیگم صاحبہ کو دکھاؤ یہ کپڑے دو ماشہ کم ہیں اس کے ساتھ یہ روپے شامل کر دو تاکہ حساب برابر رہے۔

٭

راوی۔ اوائل اکتوبر ۱۹۲۴ء میں جب منشی طاہرالدین کو لدھیانے سے علامہ کا تار ملا کہ نومولود لڑکے کے بعد ان کی بیوی کا انتقال بھی ہو گیا ہے تو عبداللہ چغتائی منشی طاہرالدین اور چودھری محمد حسین تعزیت کیلئے اسی وقت لدھیانے روانہ ہو گئے۔ نصف شب کے قریب یہ لوگ سجان منزل پہنچے علامہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آبدیدہ ہو کر تمام کیفیت سنائی اور پھر کہا

علامہ۔ مرحومہ کا جنازہ میں نے خود پڑھایا ہے کیونکہ کوئی شخص سلسلہ قادریہ سے متعلق نہیں ملتا تھا۔ (۱)

٭

راوی۔ علامہ کی لدھیانے والی بیگم کا اوائل اکتوبر ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا تو علامہ لدھیانے میں موجود تھے اپنی آنکھوں سے مرحومہ کی تکلیف دیکھی اور بہت دل گیر ہوئے اپنے بھائی عطا محمد کو لکھا۔

"تقدیرِ الٰہی کا مقابلہ تدبیرِ انسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت دردانگیز تھا اس کی حالت اس قدر بیچارگی

اور بے کسی کی تھی کہ میرے لئے اس کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا میرا قلب سخت رقیق ہو گیا۔"

قتل کے بعد مرحومہ کے بھائیوں نے ان کا تمام زیور اور سامان واپس کر دیا ہر چند کہ علامہ نے کہا کہ شریعت کی رو سے مرحومہ کے حصے کے وارث مرحومہ کے بھائی ہیں مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ آخر کار علامہ نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا۔

عطا محمد۔ اس ساز و سامان کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

علامہ۔ میرا ارادہ تو یہ ہے کہ یہ ترکہ اس کی کسی یادگار کی صورت میں صرف کیا جائے کچھ روپیہ میں اور اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دوں گا اگر خدا تعالٰی نے توفیق دی تو بہت اچھی صورت ہو جائیگی۔ (۱)

☆

راوی۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کی شام کو علامہ کی تیسری بیوی سردار بیگم (والدۂ جاوید) کا انتقال ہوا۔ چند منٹ بعد عبد الرشید طارق اور صوفی تبسم جاوید منزل پہنچے انھیں علم نہیں تھا کہ چند منٹ پہلے کیا حادثہ رونما ہو چکا ہے علی بخش نے انھیں بتایا کہ جاوید کی والدہ ابھی ابھی رحلت کر گئی ہیں علامہ کھانے کے کمرہ کے دروازہ کے قریب فرش پر صبر و شکیب کی تصویر بنے

اقبال کی صحبت میں ص ۱۶۳۔

بیٹھے تھے۔ چہرہ پژمردہ اور پُر اندوہ تھا۔

صوفی۔ طارق۔ اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

علامہ۔ (چونک کر) اچھا ہوا آپ آ گئے ہیں میں بالکل اکیلا تھا۔

صوفی۔ (رسمی کلمات تعزیت کے بعد) بیگم صاحبہ کو کیا تکلیف تھی؟

علامہ۔ عرصے ہی سے صاحبِ فراش تھیں دل کے پاس پھوڑا ہو گیا تھا ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ مگر وہ نہ مانیں آخر ختم ہو گئیں (کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) بڑی نیک بخت عورت تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ حتی المقدور گھر کا سارا کام کاج خود کرتی، اس قدر سمجھدار اور باسلیقہ تھی کہ جی خوش ہوتا تھا ابھی چند روز ہوئے ہم یہاں آئے ہیں ایک وہ بیمار دوسرے نئی کوٹھی میں آنے کی افراتفری، روزمرہ کے استعمال کی اشیا بھی اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ اپنی موت کو سر پر دیکھ کر اس نے چارپائی پر ہی فہرست مرتب کی اور اس میں لکھا کہ فلاں جگہ فلاں چیز پڑی ہے تاکہ ہم لوگوں کو تلاش و جستجو میں تکلیف نہ ہو۔ (ذرا دیر بعد) مجھے زیادہ فکر اب جاوید اور منیرہ کی ہے ان کی دیکھ بھال مشکل ہو جائے گی (۱)

☆

راوی۔ مئی ۱۹۳۵ء میں جاوید منزل بن کر تیار ہوئی یہ بیشتر سردار بیگم کی بچت سے بنی تھی۔ زمین اور عمارت انہی کے نام تھی۔ مئی میں جب وہ نئے گھر میں آئیں تو اتنی بیمار تھیں کہ چارپائی پر ڈال کر اندر لائی گئیں

(۱) مدونگار فقیر۔

لیٹے لیٹے بتاتی رہیں کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے۔ دوسرے دن علامہ زنانخانے میں آئے تو ان کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے پھر یہ باتیں ہوئیں۔

علامہ۔ تم اس کوٹھی کو جاوید کے نام . . . . کردو۔

بیگم۔ ابھی سے کیسے کردوں ؟

علامہ۔ کیوں ؟

بیگم۔ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا کا بڑا ہوکر کیا نکلے۔ میں انشاء اللہ جلد صحت یاب ہوجاؤنگی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔

علامہ۔ دیکھو زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔

بیگم۔ اچھا لاؤ۔ (کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کرتی ہیں)

راوی۔ اس کے بعد علامہ نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے سامنے کے تین کمروں کا کرایہ جاوید کے نام ہر مہینے کی دو تاریخ پیشگی جمع کروادیا کرتے تھے۔ (۱)

ٌ

راوی۔ مئی ۱۹۳۵ء میں سردار بیگم والدۂ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ کو گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کی بہت پریشانی تھی ان کی اپنی بیماری نے اس مسئلہ کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے ایک جرمن گورنس کی خدمات

---

(۱) ملفوظاتِ اقبال

حاصل ہوگئیں یہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اہلیہ کی عزیزہ تھیں ڈورالینٹ ان کا نام تھا۔ نومبر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں جب پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر سعید اللہ اور عبدالواحد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک یوروپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کی بچی منیرہ کو گود میں لیئے ہوئے تھیں وہ ان کو دیکھتے ہی اُٹھیں اور مقابل کا پردہ اٹھا کر کمرے کے اندر چلی گئیں۔ مزاج پرسی کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر ان خاتون کا ذکر چھڑا

حمید احمد خان۔ یہ یوروپین خاتون کون تھیں؟

علامہ۔ یہ جاوید اور منیرہ کی گورنس ہیں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن بیوی کی عزیزہ ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے بھیجا ہے۔

بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی اور ہے بڑی شریف عورت، بہت اچھی منتظم ہے بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرصت ملتی ہے تو مکان کے جھاڑنے پونچھنے میں لگ جاتی ہے یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہوگیا ہے۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں۔ اردو خط جاوید لکھ دیتا ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا میری لڑکی منیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کیلئے کسی طرح نہیں جانا چاہتی

تھی بہت دفعہ کہا مگر اسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلنا
بالکل منظور نہیں تھا آخر کئی دن کے بعد یہ اس وقت راز کھلا
جب منیرہ نے کہا
"لوگ کہیں گے "میم کی بیٹی ہے بلا"۔"

٭

راوی۔ بچوں کی گورنس مس ڈورا النٹ کا علامہ کے متعلق بیان[1]
ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف النفس انسان نہیں دیکھا
جب پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب کھانے کے رسمی
کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دسترخوان کے وہ آداب
ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانے میں
نظر آتے ہیں لیکن ان کا مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے
بڑی صفائی اور بڑے ہی پرلطف انداز سے یہ خواہش ظاہر کی
کہ ان کو اس تکلف سے مستثنیٰ کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ صرف
بنیان اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور
ضعف زیادہ بڑھا تو کمرہ ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ایک روز فرمایا
علامہ۔ مس ڈورا میں تمہارا ممنون ہوں تمہارے ہونے
سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان ہے جس کا
میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

٭

---

(۱) اقبال کی صحبت میں ص ۴۶۸

راوی۔ اوائل جون ۱۹۳۵ء میں علامہ کو سر راس مسعود کا خط ملا۔
جس میں بھوپال کی طرف سے وظیفے کی منظوری کی اطلاع بھی تھی
اُس وقت منشی طاہرالدین بھی موجود تھے۔ خط ملتے ہی علامہ نے کہا
علامہ۔ منشی جی آفتاب کی ماں سے کہنا کہ وہ بھی آئندہ ہر مہینے
پچاس روپے آ کر لے جایا کرے۔
راوی۔ عبداللہ چغتائی جو اس واقعہ کے شاہد ہیں لکھتے ہیں کہ
ابھی آپ نے یہ جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ وہ خود آگئیں۔ چنانچہ
منشی صاحب نے علامہ کو ان کے آنے کی اطلاع دی۔

ؒ

والدین کی تکریم

راوی۔ علامہ کو اپنی والدہ امام بی بی سے بڑی عقیدت و محبت
تھی جب ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کی یاد میں
وہ مشہور مرثیہ لکھا جو " والدہ مرحومہ کی یاد میں " کے عنوان سے
بانگِ درا میں شامل ہے۔
علامہ کے دوست احباب تعزیت کیلئے آئے تو آپ
والدہ کا ذکر کرتے ہی اشکبار ہو گئے۔ اور بار بار کہتے والدہ ماجدہ
آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ علامہ کے عزیز و اقارب سمیت
سب اہل محفل حیران تھے کہ علامہ کس احسان کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔

حاضرین (ا)، کچھ ارشاد ہو آپ کا اشارہ کس احسان کی طرف ہے۔

(ب)، - اگر بارِ خاطر نہ ہو تو کچھ وضاحت فرمائیے۔

(ج)، - جی ہاں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس راز سے پردہ اُٹھائیں۔

علامہ حضرات آپ کو اصرار ہے تو عرض کرتا ہوں آپ کو معلوم ہے ـــــ کہ والدہ انتہا درجہ کی پرہیز گار خاتون تھیں تقوے میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں فرماتی تھیں کہ رزقِ حلال ایمان کی جان ہے۔ جب میں دودھ پیتا بچہ تھا تو انھیں شبہ ہوا کہ والد کی آمدنی شرعاً مشکوک ہے چنانچہ انھوں نے مجھے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا اور اپنی محنت کے پیسوں سے ایک بکری خریدی اور اس کا دودھ پلانا شروع کیا مقصد یہ تھا کہ مشکوک آمدنی کے رزق سے پیدا ہونے والا دودھ میرے جسم میں نہ جائے جب تک والد نے انھیں یقین نہیں دلا دیا کہ ان کی آمدنی رزقِ حلال ہے انھوں نے اپنا دودھ مجھے نہیں پلایا۔ اللہ اکبر۔

یہ ہے وہ احسانِ عظیم جو والدہ نے مجھ پر کیا اس سے مجھے رزقِ حلال کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

(الف)، لیکن حضرت آپ کے والد ماجد تو خود حد درجہ کے متقی انسان تھے ان کی روزی کے مشکوک ہونے کا گمان کیسے پیدا ہوا؟

علامہ۔ آپ لوگوں کو شاید معلوم نہیں شروع میں ہم لوگ انتہائی تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے ایک وہ وقت تھا کہ میں اور بڑے بھائی عطا محمد کاغذ بنانے کے ایک گھریلو کارخانے میں کاغذ کوٹ کر پیٹ بھرتے تھے حد یہ کہ اس زمانے میں میری تعلیم بھی رک گئی تھی۔

جب بھائی صاحب رسالے میں بھرتی ہو گئے تو کچھ آمدن کی صورت پیدا ہوئی میں نے سنا ہے ڈپٹی صاحب نے والد صاحب کو سنگر مشین خرید کر دی تھی جو اس زمانے میں ایک نئی چیز تھی۔
ڈپٹی صاحب کے ذرائع آمدن شرعی ہونے میں والد صاحب کو کچھ شبہات تھے چونکہ والد صاحب ڈپٹی کے ملازم تھے اس لئے وہ ان کی تنخواہ کو بھی مشکوک سمجھتی تھیں۔ اس لئے انھوں نے اپنا دودھ مجھے پلانا چھوڑ دیا تھا بعد کو جب والد صاحب نے انھیں اپنی کمائی کے پاک صاف ہونے کا یقین دلایا تو انھوں نے پھر مجھے اپنا دودھ پلانا شروع کیا۔
تو حضرات یہ داستان ہے اس احسان کی جو والدہ نے مجھ پر کیا اور جس سے مجھ پر رزق حلال کی اہمیت واضح ہوئی۔

راوی۔ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں علامہ نے عطیہ فیضی کو لکھا کہ وہ اپنے والد کی فرمائش پر بوعلی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی میں ایک مثنوی لکھنے کی ابتدا کر رہے ہیں اس کے ابتدائی اشعار بھی انھوں نے عطیہ فیضی کو لکھ کر بھیجے۔
۱۹۱۴ء میں اسرار خودی زیر تکمیل تھی اس لئے رات کی مجلسوں میں اسی کا ذکر رہتا۔ کبھی کبھی زیر تصنیف اشعار بھی سنانے ایک روز کہا۔

علامہ میں اس مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو جسے رسول مقبولؐ

نے پیش کیا تھا دکھانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمان اُس عربی اسلام کو بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں اور عجمی اسلام ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔

*

راوی۔ ۱۹۱۵ میں جب مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو صوفیہ کے ایک حلقے نے سخت احتجاج کیا۔ اور حافظ پر علامہ کی تنقید کو خاص طور سے ہدفِ ملامت بنایا۔ اُس سال گرمیوں کی تعطیل میں جب علامہ والد محترم کے پاس گئے تو یہ گفتگو ہوئی۔

شیخ نور محمد۔ تمہاری مثنوی پر صوفیاء بہت برہم ہیں۔

علامہ۔ حلقۂ صوفیاء کی برہمی کا کوئی جواز تو نہیں۔

شیخ نور محمد۔ حافظ پر اعتراضات جو ہیں۔

علامہ۔ میں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا میں نے صرف ایک اصول کی تشریح کی ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ مسلمانانِ وطن پر عجمی اثرات اتنے غالب آچکے ہیں کہ وہ زہر کو تریاق سمجھتے ہیں۔

شیخ نور محمد۔ اگر حافظ کے عقیدتمندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصول کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔

علامہ۔ یہ حافظ پرستی بھی تو بت پرستی سے کم نہیں۔

شیخ نور محمد۔ اللہ اور اس کے رسول نے تو بتوں کو بھی بُرا کہنے سے منع فرمایا ہے اس لئے آئندہ ان اشعار کو حذف کر دینا ہی

بہتر ہوگا۔

راوی۔ یہ سن کر علامہ سعادت مندانہ خاموش ہو گئے اور مثنوی کے دوسرے ایڈیشن سے وہ ۳۵ اشعار حذف کر دیئے جن کا پہلا شعر یہ ہے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

لیکن جب ۱۹۲۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ نکلسن نے شائع کیا اور اس پر مغربی دنیا میں بہت شاندار تبصرے ہوئے تو علامہ نے اپنے والد کو لکھا۔

"آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ جب یہ مثنوی شائع ہوئی تھی تو یہاں کے صوفیاء نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے لیکن مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوزِ صداقت ہے اس کی ہم تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

اسرارِ خودی پر مغرب میں بہ حیثیتِ مجموعی بہت اچھے تبصرے ہوئے ہیں ایک مبصر نے لکھا ہے کہ مصنف نے ایشیا والوں کو اور خصوصاً مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے۔ اس کے ہر لفظ میں ایک سیاسی قوت چھپی ہوئی ہے۔

راوی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے مولانا اسلم جیراجپوری طلوعِ اسلام کے مدیر غلام احمد پرویز اور چند دوسرے عقیدت مند علامہ کی مزاج پرسی اور ملاقات کے لئے آئے۔ قرآن حکیم کے رموز و معارف پر گفتگو ہو رہی تھی۔

پرویز۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ علم اور تجربے کی روشنی میں بھی وہی حقائق آشکارا ہو رہے ہیں جن کی طرف قرآن پاک نے اشارہ کیا ہے تو کیا دہریت سے بھی کچھ حقائق منکشف ہوئے؟ اشتراکی روس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

علامہ۔ کیوں نہیں مگر ایک حد تک پھر یہ حقائق بھی کچھ ایسے نہیں جن کے متعلق کہا جائے کہ ان کا انکشاف اس سے پہلے نہیں ہوا ہماری اپنی تاریخ ہی سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

نیازی۔ مثلاً جیسے جاوید نامہ میں روسی انقلاب کے بارے جمال الدین افغانی اہل روس سے کہتے ہیں۔

چیست قرآن خواجہ را پیغامِ مرگ
دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ

علامہ۔ جی ہاں بات اصل میں یہ ہے کہ قرآن مجید قلب کے راستے سے بھی شعور میں داخل ہوتا ہے اور دماغ کی راہ سے بھی سمجھ میں آتا ہے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ حقائق کا ادراک علم اور فکر تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔

نیازی قرآن کے دل کے راستے شعور میں داخل ہونے کی صورت کیا ہوگی۔؟

علامہ۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔

ایک روز کا ذکر ہے والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہنے لگے

"تم کیا پڑھا کرتے ہو؟"

مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا بلکہ ملال بھی، انھیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں بہر حال میں نے مودبانہ عرض کیا۔

"قرآن پاک۔"

کہنے لگے

"تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟"

میں نے کہا۔

کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے میں حیران تھا آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوئی۔ لیکن اس

واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسبِ معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔

بیٹا قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے کہنے لگے۔

تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔

میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت ویسا ہی کروں جیسے ان کا ارشاد ہے کہ انھوں نے کہا۔

" سنو اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفےٰ مجتبےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالتماٰب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک کہ خاتم الانبیا میں جتنے بھی نبی معبوث ہوئے ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارجِ

محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذات محمدیہ کی تشکیل پر ہوا۔

نیازی۔ مدارجِ محمدیہ میں سے گزرنے سے کیا مراد ہے۔؟

علامہ۔ والد ماجد نے خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی انھوں نے کہا۔

" شعور انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پا لے تو ذاتِ محمدیہ بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔ حضور رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تشریف لائے باب نبوت بند ہوا انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوہ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت مثال اور نمونہ ٹھہرا اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا یہ مطلب تھا میرے یہ کہنے کا کہ قرآن مجید اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ "

راوی۔ ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ علامہ بعض عزیزوں سے کبیدہ خاطر تھے اس بات کا میاں جی (علامہ کے والد شیخ نور محمد) کی طبیعت پر بوجھ سا تھا۔

علامہ۔ میاں جی۔ آپ کا مزاج کیسا ہے ؟

میاں جی۔ مزاج کیا پوچھتے ہو بس طبیعت اداس رہتی ہے۔

علامہ۔ آپ کی اداسی کا سبب مجھے معلوم ہے میری عرض سنیئے
کئی سال ہوئے میں نے ایک کتاب یوروپ میں خریدی تھی مگر آج
تک اس کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی ان تعطیلات میں اِسے دیکھنے
کا اتفاق ہوا اس کے آغاز اور اختتام پر یہ فقرہ ہے۔

"میری کوئی چیز نہیں اور میرے لئے تمام اشیا کا عدم اور
وجود برابر ہے" یہ ساری کتاب اسی جملے کی تشریح ہے۔ اور
حقیقت میں خوب ہے۔ حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان
اپنی اصل حقیقت کا خیال کرکے تمام تعلقات سے آزاد ہو
جائے یعنی بالاتر ہوجائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی اس کی مثال ملتی ہے
ان سے زیادہ اپنے عزیزوں سے محبت کرنے والا اور کون ہوگا؟ لیکن
ایک وقت ایسا بھی آتا تھا جب آپکو صرف یہ کہ معلوم ہوتا کہ عائشہ رضی کون
ہے اور ابوبکر رضی کون ہے نہ صرف یہ بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہے
ہمارے صوفیاء نے اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے لیکن صحیح بات
یہ ہے کہ یہ شخصیت یا خودی کا کمال ہے اسے فنا نہیں کہنا چاہیئے
اور انسانی حیات کی یہی کیفیت حیات بعد الموت کی تیاری ہے۔
لیکن آپ اِس نکتے کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

ہمارے عزیزوں میں جب آپس میں بگاڑ ہوتا ہے تو
ہم جو ان کی صلح و آشتی میں خوش ہوتے ہیں ان کا بگاڑ دیکھ کر
اور پریشان ہوتے ہیں جب اسی قسم کا بگاڑ اور لوگوں میں ہو جو عام
معنوں میں ہمارے عزیز یا رشتے دار نہیں ہیں۔ تو ہم کو کوئی رنج

نہیں ہوتا اور کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ جو آدمی انسانی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے اُسے معلوم ہے کہ تمام بنی نوع انسان آپس میں عزیز رشتے دار ہیں کیوں کہ حیاتِ انسانی کی جڑ ایک ہے کیا وجہ ہے کہ چند آدمیوں کے بگاڑ سے جن کو ہم خاص طور پر اپنا رشتہ دار کہتے ہیں ہم کو رنج ہوتا ہے اور باقی لوگوں کے بگاڑ سے ہم پر کچھ اثر نہیں ہوتا، حالانکہ عزیز تو حقیقت میں وہ بھی ہیں انسان اس نظر کی میلان سے مجبور ہے کہ جو آدمی خون کے اعتبار سے ہمارے قریب تر ہیں ان کو اپنے رشتے دار کہتا ہے اور جو دور ہیں ان سے بے تعلق ہو جاتا ہے حالانکہ خون اور زندگی میں قرب اور بُعد نزدیکی دوری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ تعلقات کی وجہ سے جو پریشانی ہم کو لاحق ہوتی ہے اس کی بناء اصل میں ناانصافی پر ہے ناانصافی یہ کہ بعض افراد کو قربِ خونی کی وجہ سے قریب جاننا اور بعض کو بُعدِ خونی کی وجہ سے بعید جاننا حالانکہ زندگی کی حقیقت قُرب و بُعد سے معریٰ ہے کامل انسان تمام عالم کیلئے رحمت ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہے۔

احترامِ استاد

راوی. علامہ کے بھانجے پروفیسر منظور احمد بیان کرتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے چھٹیوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے. رحیما عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے تختے پر حقہ دھرا ہوا تھا علامہ حقہ پی رہے تھے ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا سنہرے رنگ کی جوتی پہنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے مولوی میر حسن شاہ ادھر سے گزرے جوں ہی علامہ کی نظر ان پر پڑی جھٹ مولوی صاحب کی طرف لپکے۔ جلدی میں تختے پر جو پاؤں تھا اس کا جوتا نکل گیا جو ذرا ڈھیلا تھا وہ اسی طرح شاہ صاحب کے پیچھے ہولئے اب صورت یہ تھی کہ علامہ کے ایک پاؤں میں سنہری جوتا تھا دوسرا خالی اور سر جھکائے مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہے

تھے اسی حالت میں شاہ صاحب کو ان کے گھر کے دروازے تک پہنچا
کے واپس آئے جب دوسرا جوتا پہننے لگے تو رحیما نے کہا.

رحیما. باؤ جی تسیں حد کر دتی .

علامہ. رحیما ۔ تجھے کیا خبر کہ شاہ جی کا مرتبہ کیا ہے ؟ (۱)

٭

راوی. ذکی شاہ کا بیان ہے علامہ کو گردے کا درد ہو جاتا
تھا ایک مرتبہ دورہ لمبا ہو گیا تو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپریشن
کرا لیجئے چنانچہ آپریشن کی تیاری کر دی گئی علامہ نے گردے کی
تکلیف اور آپریشن کے بارے میں مولوی میر حسن کو بھی لکھ بھیجا آپریشن
سے ذرا پہلے جواب آیا آپریشن نہ کراؤ.

ڈاکٹر. اب آپ تیار ہو جائیے آپریشن کیلئے .

علامہ. وہ ٹھیک ہے لیکن اب میں آپریشن نہیں کراؤں گا .

ڈاکٹر. آخر کیوں ؟ سارا سامان تیار ہے

علامہ. میرے استاد نے کہدیا ہے کہ آپریشن نہ کراؤ .

ڈاکٹر. آپ کی بیماری ہم جانتے ہیں کہ آپ کے استاد ؟ اپنے
استاد کے کہنے پر بیماری کا علاج نہ رد کیئے .

علامہ. جو کچھ بھی ہو میں شاہ صاحب کے ارشاد کے خلاف کوئی
کام نہ کروں گا .

راوی. آخر علامہ نے آپریشن نہ کرایا اور حکیم نابینا صاحب کے علاج

---

(۱) روایات اقبال

سے اچھے ہوگئے (۱)

ؐ

راوی۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پہلے اقبال کو لندن بھیجنے کے حق میں نہیں تھے۔ مولوی میر حسن نے اصرار کر کے انھیں راضی کیا بار بار کہتے تو نہیں جانتا کہ اقبال کیا ہے۔ میں جانتا ہوں اس کو باہر بھیجو بہرحال شیخ عطا محمد نے اقبال کو باہر بھیجا اور تعلیم میں بڑی مدد دی۔ سید ذکی شاہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی آخر عمر میں دونوں بھائیوں میں کسی قدر رنجش پیدا ہوگئی تھی ایک روز یہ بات ہوئی۔

سید میر حسن شاہ۔ بھئی عطا محمد نے تمہاری بڑی خدمت کی ہے اس خدمت کا حق ادا کرتے رہو۔

علامہ۔ جی، میں نے اصل مع سود ادا کر دیا ہے یہاں تک کہ جدی مکان میں بھی حصہ چھوڑ دیا ہے۔ (۲)

ؐ

راوی۔ مولانا میر حسن سے سرسید کے تعلقات بہت گہرے تھے دونوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا میر حسن ایک طرح سے پنجاب میں سرسید کے نمائندے تھے ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کے انتقال کی خبر آئی تو وہ کالج جا رہے تھے راستے میں

(۱) روایاتِ اقبال ص ۳۱ (۲) روایات اقبال ص ۲۸

اقبال مل گئے ۔

مولانا میر حسن ۔ سر سید فوت ہو گئے ہیں ذرا تاریخ وفات کی فکر کرنا ۔

اقبال ۔ بہت بہتر شاہ جی ۔

راوی ۔ اقبال ایک شناسا کی دکان پر بیٹھے تھے مولینا کے چھوٹے صاحبزادے سید ذکی شاہ بھی ساتھ تھے تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد سید ذکی شاہ سے کہنے لگے ۔

اقبال ۔ لو بھئی تاریخ وفات ہو گئی ہے جاؤ ابھی شاہ صاحب کو سنا دو ۔

" انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک "

ذکی شاہ ۔ کمال ہو گیا ابھی جاتا ہوں ۔

راوی ۔ ذکی شاہ نے یہ تاریخ مولانا میر حسن کو جا کر سنائی تو فرمایا بہت خوب ہے میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے غفرلہ [1]

راوی ۔ ایک دفعہ راجہ نریندر ناتھ نے علامہ کو چائے پر مدعو کیا راجہ صاحب کے کمرے میں ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں علامہ ان سے بچ بچ کے گزر رہے تھے ۔

راجہ نریندر ناتھ ۔ (حیران ہو کر) ڈاکٹر صاحب آپ ان سے بچ کیوں رہے ہیں ؟

علامہ ۔ میرے استاد محترم مولوی میر حسن نے ایک مرتبہ مرا ہوا ہرن کا جائے نماز استعمال نہ کرنے کا سبب بتاتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ ہرن کی کھال پر بیٹھنے سے انسان کے دل میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس ہوتا ہے ۔ [2]

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۹   [2] روزگار فقیر ص ۴۷

ملازم اور پڑوسی

راوی۔ علامہ کے یہاں کام نہ ہونے کے برابر تھا پھر بھی تین تین
نوکر تھے اور ایک شوفر مستزاد، دوست احباب اور نیاز مند افسوس
کرتے کہ ڈاکٹر صاحب کا پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔ ڈرائیور فیروز نے
تو بیکاری سے تنگ آکر کوٹھی سے باہر خوانچہ لگا لیا تھا اس
لئے کہ علامہ گھر سے تو شاذ و نادر ہی نکلتے تھے ایک روز بے تکلف
حاضرین نے کہا

حاضرین۔ ڈاکٹر صاحب آپ کے ہاں کام تو کچھ ہے نہیں صرف
علی بخش چلم بھرتا نظر آتا ہے۔ باقی نوکر کس لئے ہیں اس اسراف
سے کیا حاصل؟

علامہ۔ آپ لوگوں کا خیال صحیح ہے کام تو کوئی خاص نہیں بس کیا
کروں ان کو نکالا نہیں جاتا ویسا میں نے انھیں اپنی مرضی سے بھرتی
نہیں کیا۔

حاضرین۔ تو پھر یہ کیسے جمع ہو گئے علی بخش تو خیر ہوا آپ کا پرانا خدمتگار۔
یہ باقی دو کس مرض کی دوا ہیں یہ کہاں سے ساتھ لگ گئے۔

علامہ۔ اس کا بھی ایک لطیفہ ہے ایک دفعہ علی بخش چھٹی لیکر گیا۔
اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا۔ جب علی بخش واپس آیا تو رحمے نے

پریشانی ظاہر کی اب میں کہاں جاؤں گا ۔ میں نے کہا چلو تم بھی رہو۔ اس کے بعد ایک بار رحما چھٹی گیا اور اپنی جگہ ایک اور شخص دیوان کو رکھوا گیا جب رحما واپس آیا تو یہ تیسرا نوکر پریشان ہوا ۔ میں نے کہا اچھا بھئی اب تم بھی رہو ۔

٭

راوی ۔ کانگڑہ کے زلزلہ (۱۹۰۴ء) لاہور پر بھی بڑی آفت آئی شہر میں بہت سے مکان گر گئے ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا علی بخش کا یہ حال تھا کہ کبھی گھبرا کے کوٹھے پر چڑھ جاتا کبھی نیچے آ جاتا علامہ اپنے کمرے میں چارپائی پہ لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے ۔ لیکن جس طرح لیٹے تھے اسی طرح لیٹے رہے ذرا ہلے جلے تک نہیں علی بخش نے گھبرا کر پکارا ۔

علی بخش ڈاکٹر صاحب ، ڈاکٹر صاحب ۔

علامہ ۔ علی بخش یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ ۔

راوی ۔ اور علامہ یہ کہہ کر پھر اسی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے ۔(۲)

٭

راوی ۔ علی بخش کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو خود کھاتے تھے وہی نوکروں کو بھی کھلاتے تھے نوکروں کیلئے کبھی الگ کھانا نہیں پکتا

(۲) حیات اقبال ۔

تھا ایک بار ایسا ہوا کہ نوکروں کیلئے گھر سے دال پک کر آئی جس میں
گھی نہیں ڈالا گیا تھا جب علامہ کو پتہ چلا تو اندر سے گئے۔

علامہ۔ (سخت ناراضگی کے لب و لہجہ میں) یہ چیز تم نے نوکروں
کو نہیں کھلائی، مجھے کھلائی میں ایسی بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا
نوکر ہمارے دست و بازو ہیں ہم ان کے پروں پر اُڑتے ہیں
ہمارے کام ان کے سہارے چلتے ہیں یہ بات بہت بُری ہے کہ
کھانے میں ان کو الگ رکھا جاتے (۱)

٭

راوی۔ ایک روز صبح سویرے علامہ اپنے مکان کے برآمدہ میں
دوستوں کیساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہندو آیا اور ہاتھ جوڑ کے
چلا گیا علامہ دوستوں سے یوں مخاطب ہوئے۔

علامہ۔ پتہ ہے یہ کون ہے؟

حاضرین۔ نہیں، ہمیں نہیں معلوم۔

علامہ۔ یہ مالک مکان ہے اس کو اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ
کوئی مسلمان بھی پیشگی کرایہ دے سکتا ہے، چونکہ میں اسے ہر مہینے
پیشگی کرایہ دے دیتا ہوں یہ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ یہ دھرماتما
ہے اور ہر روز صبح سویرے آکر مجھے پرنام کرتا ہے۔

راوی۔ ایک بار ممتاز حسن سے مالک مکان کے متعلق گفتگو
کرتے ہوئے علامہ نے بیان کیا۔

---

(۱) روایاتِ اقبال۔

علامہ
میرا مالک مکان ایک دفعہ میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ آپ بڑے آدمی ہیں میں نے کہا لالہ جی جو میں لکھتا ہوں اس میں سے تو آپ نے خاک بھی نہیں دیکھا تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ میں بڑا آدمی ہوں کہنے لگے میرے پاس بہت سے کرایہ دار ہیں لیکن آپ ہی ہیں کہ جس سے کرایہ پہلی تاریخ کو باقاعدہ بلا ناغہ اور بغیر کسی دقت کے مل جاتا ہے (۱)

☆

راوی۔
جون ۱۹۲۹ء کو عبدالرشید طارق اپنے بھائیوں کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے انھیں عہدِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ایثار اور اولوالعزمی کے واقعات سنائے ایک واقعہ کا تعلق حضرت ابوایوب انصاریؓ اور قسطنطنیہ کی اولین فتح سے تھا۔ نوے برس کی عمر میں ان کے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کو یاد کر کے علامہ پر رقت طاری ہوگئی اور اشکبار ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد چند کتابیں بغل میں دبائے ایک اجنبی ملاقاتی آیا اور جھک کے بصد عقیدت سے آداب بجالایا۔

علامہ۔
کہاں سے آئے ہو؟

اجنبی۔
حیدرآباد دکن سے حضور کا نیاز حاصل کرنے آیا ہوں۔ صرف دیدار کرنے۔ ۔ ۔ ۔

علامہ۔
بیٹھو۔

---

(۱) نقوشِ اقبال ۲۲۳۔

اجنبی۔ (ایک کتاب کھول کر) اس پر کچھ لکھ دیجئے۔

علامہ۔ یہ پیامِ مشرق ہے بھئی اس میں جو کچھ لکھا ہے میرا ہی لکھا ہوا ہے۔

اجنبی۔ حضرت آپ اپنے قلم سے کوئی شعر لکھ دیجئے

علامہ۔ (کچھ سوچ کر)

سروری، در دیں خدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است

اجنبی۔ میں آپ کا بیحد ممنون ہوں (ذرا دیر بیٹھ کر چلا جاتا ہے)

طارق (میکلوڈ روڈ کے شور و غوغے سے پریشان ہو کر)
ڈاکٹر صاحب یہ شور تو آپ کے آرام میں بہت مخل ہوتا ہوگا؟

علامہ۔ ہاں مگر اب عادت ہوگئی ہے

طارق آپ کوٹھی کو بدل کیوں نہیں لیتے یہ تو یوں بھی بوسیدہ اور پرانی ہے آپ اس کا کتنا کرایہ دیتے ہیں؟

علامہ۔ ایک سو تیس روپے

طارق۔ اتنے روپوں میں آپ کو بہت اچھی کوٹھی مل سکتی ہے۔

علامہ۔ ٹھیک ہے مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔

طارق کیوں؟

علامہ۔ بات در اصل یوں ہے کہ یہ کوٹھی دو یتیم بچوں کو وراثت میں ملی ہے میرے چلے جانے سے ان کو بہت تکلیف ہوگی اتنا کرایہ شاید کوئی اور نہ دے (۱)

(۱) ملفوظاتِ اقبال ۲۹۰

فقر و درویشی

راوی۔ علامہ نسبت بیعت کے قائل تھے مولینا سید سلیمان ندوی کو بھی لکھا تھا میں سلسلہ قادریہ میں بیعت رکھتا ہوں ایک روز بیعت کے موضوع پر پیر جماعت علی شاہ سے باتیں ہو رہی تھیں

پیر جماعت علی۔ آپ کس سلسلے میں بیعت ہیں؟

علامہ۔ میں اس کو راز ہی رکھنا چاہتا تھا حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں۔ ان کے پاس ایک مجذوب حیثیت درویش آیا کرتے تھے وہ انہی سے بیعت تھے اور ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔ (۱)

٭

راوی۔ ایک بار ایک درویش علامہ کے پاس آیا۔

علامہ۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے۔

درویش۔ دولت چاہتے ہو؟

علامہ۔ میں درویش ہوں دولت کی ہوس نہیں۔

---

(۱) ذکر اقبال ۲۴۸۔

درویش۔ عزو جاہ مانگتے ہو؟

علامہ۔ وہ بھی خدا نے کافی بخش رکھی ہے۔

درویش۔ تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو؟

علامہ۔ سائیں جی کیا کہہ رہے ہو؟ میں بندہ وہ خدا، بندہ خدا سے کیوں کر مل سکتا ہے؟ میں بندہ کی حیثیت میں رہ کر دریا پینا چاہتا ہوں۔

درویش بابا، جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تو تو خود آگاہ راز ہے تجھے کسی کی دعا کی کیا ضرورت ہے۔

٭

راوی۔ داتا گنج بخش کی درگاہ میں ایک روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے تھے۔ اقبال ان سے ایک سوال کا جواب چاہتے تھے کہ جب مسلمانوں سے وعدہ ایزدی ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز و سربلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے؟

ایک روز بزرگ کی خدمت میں باریاب ہونے کا قصد کیا لیکن نہ جا سکے دوسری صبح کا واقعہ ہے

علی بخش۔ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔

علامہ۔ بلا لو۔

درویش۔ (خاموشی سے اندر آ کر) جی

علامہ۔ (کچھ وقفے کے بعد) آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے؟

درویش۔ ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے میں تمہارے سوال کا

جواب دینے آیا ہوں ۔

گفت رومی ، ہر بنائے کہنہ کہ باداں کنند
تو ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

راوی۔ درویش نے یہ کہا اور چلا گیا اس واقعہ کے کچھ دیر بعد فقیر نجم الدین پہنچے ۔

فقیر نجم الدین۔ اقبال ۔ خیر تو ہے آپ اس قدر حیراں و پریشاں کیوں ہیں ؟

علامہ ۔ فقیر ۔ میرے قریب آ کے بیٹھو ۔ ابھی ایک عجیب واقعہ ہوا ہے میں تو کل داتا دربار تمہارے ساتھ جا نہ سکا تھا ابھی ابھی ایک درویش آیا کہا تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں ۔ اور رومی کا یہ شعر پڑھا میں تو چند لمحوں کیلئے اپنے گرد و پیش سے بیخبر ہو گیا تھا حواس ٹھکانے ہوئے اور بزرگ سے بات کرنے کیلئے نظر اُٹھائی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن اس درویش کا کہیں سراغ نہ ملا ۔

☆

راوی ۔ فقر اور درویشی کی باتیں ہو رہی تھیں ۔ راجہ حسن اختر بھی بیٹھے تھے پوچھا ۔

راجہ حسن اختر۔ فقر کی پہلی منزل کیا ہے ؟

علامہ ۔ فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے نور ایمان بھی کسبِ حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔

یہاں سب مجھے ایک قصہ یاد آیا بغداد کے ایک بزرگ کی ہمشیرہ

قاضیٔ شہر کے پاس گئیں اور سوال کیا ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے میں اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں فرمائیے کہ شریعت کی رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام ؟ قاضی تقوے کا یہ لطیف احساس دیکھ کے حیرت زدہ ہوگیا۔ پوچھا آپ کون ہیں ؟ خاتون نے جواب دیا۔ میں فلاں درویش کی ہمشیرہ ہوں۔ قاضی نے کہا۔ آپ کیلئے حرام ہے دوسروں کیلئے حلال۔

راوی۔ راجہ حسن اختر کا بیان ہے کہ اس ذکر سے علامہ پر سخت رقت طاری ہوگئی جس سے سب ہم نشیں متاثر ہوئے ۔ (۱)

۳

راوی۔ اقبال گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے پروفیسر آرنلڈ فلسفہ کے استاد تھے ، ایک روز آرنلڈ نے محسوس کیا کہ کلاس میں اقبال چند روز سے کچھ کھوئے کھوئے سے دل گرفتہ نظر آتے ہیں۔

آرنلڈ۔ کیا بات ہے اقبال کچھ افسردہ دل گرفتہ نظر آتے ہو ؟

اقبال کچھ بات ہی ایسی ہے

آرنلڈ کیا ؟

اقبال ایک مولانا جو اپنے کو بڑا عالمِ دین کہتے ہیں انھوں نے جھوٹ

(۱) ذکرِ اقبال ص ۲۴۷ ۔

بولا ہے اس حادثہ نے مجھے بےچین کر دیا ہے۔

آرنلڈ۔ اقبال! آئندہ زندگی میں ایسے واقعات تم اکثر دیکھو گے (۱)

٭

قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریمؐ سے وابستگی

راوی۔ علامہ کے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام کے زمانے کی بات ہے ایک نئے ملاقاتی آئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی یکایک پوچھا۔

ملاقاتی۔ آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب، آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟

علامہ۔ (کرسی سے اُٹھ کر اندر جاتے ہوئے) آپ ذرا ٹھہریئے ابھی بتاتا ہوں

(اندر سے ایک کتاب لاتے ہوئے)

یہ ..... قرآن کریم (۲)

٭

---

(۱) ذکرِ اقبال۔ روزگارِ فقیر ص ۹۳

راوی۔ ۲ فروری ۱۹۳۸ء کو میاں رشید احمد اپنے چھوٹے بچوں کیساتھ علامہ کی زیارت کیلئے جاوید منزل حاضر ہوئے۔

رشید احمد۔ جناب یہ بچے آپ کی زیارت کے مشتاق تھے ان کو کوئی نصیحت فرمائیے۔

علامہ۔ دیکھو تم ہی کو اب یہاں رہنا ہے ہم تو مسافر ہیں یاد رکھو مسلمانوں کیلئے جائے پناہ صرف قرآن کریم ہے۔ زمانے کیساتھ ضرور چلنا چاہیئے لیکن اپنے دامن کو اس کے برا اثرات سے آلودہ نہ ہونے دو۔ میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں جس گھر سے علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے۔ کلام مجید کو صرف پڑھو ہی نہیں بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

⁂

راوی۔ علامہ کی چھوٹی ہمشیرہ وزیر آباد میں بیاہی تھیں۔ ان کے سسرال والوں کا سلوک ان سے کچھ اچھا نہ تھا وہ میکے آگئیں پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان کے سسرال ان کو پھر لبانے پر مُصر ہوئے مصالحتی بات چیت شروع ہوئی علامہ کے والدین بھی راضی ہو گئے۔ اتفاق سے انہی دنوں علامہ بھی سیالکوٹ آئے تھے۔ علامہ کے والد نے ان سے بھی مشورہ کیا۔

شیخ صاحب۔ اقبال کیا رائے ہے اس معاملہ میں، پھر اس کو سسرال بھیج دیا جائے۔

اقبال دس درجہ برہم ہو کر، مصالحت نہیں ہو سکتی۔

شیخ صاحب۔ ہوا جو کچھ ہوا اب وہ لوگ شرمندہ ہیں اور اچھے سلوک کا وعدہ کرتے ہیں
اقبال۔ شرمندگی سے کیا ہوتا ہے ان لوگوں نے بڑی زیادتی کی ہے ظلم کیا ہے مصالحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ انہیں واپس بھیج دیجئے۔
شیخ صاحب۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں والصلح خیر فرمایا ہے۔
(علامہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ رقت طاری ہو گئی ہے اور رنگ متغیر ہو جاتا ہے)
شیخ صاحب پھر کیا فیصلہ کیا جائے؟
اقبال۔ وہی جو قرآن کہتا ہے (۱)

٭

راوی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بڑے خلوص سے درود بھیجنا علامہ کے معمولات میں سے تھا اسی طرح دعا پر انہیں بڑا اعتقاد تھا ایک روز اپنے بھتیجے اعجاز احمد سے کہا۔
علامہ۔ تمہیں شاید معلوم نہیں جب تم بی اے کا امتحان دے رہے تھے تو میاں جی کی ہدایت پر میں نے تمہاری کامیابی کیلئے آیت کریمہ کا ورد بھی کیا تھا اور دعا کی تھی یاد رکھو مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے اس سے کام لینا چاہیئے ہر وقت دعا کرنی چاہیئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنا چاہیئے۔ قرآن کریم کی تلاوت میں زیادہ اصرار اس لئے کرتا ہوں کہ اس کے

(۱) روزگار فقیر جلد دوم ص ۵۵ - ۱۵۴

پڑھنے کے فوائد میرے تجربے میں آچکے ہیں ۔

روحانی کیفیات میں سب سے بڑا معاون کھانے پینے میں احتیاط ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے معاملات میں اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں

ؔ

راوی ۔ اقبال کے مشہور نیاز مند م۔ش راوی ہیں ۔ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ علامہ بنیان اور تہمد پہنے اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے علی بخش ان کے پاؤں دبا رہا تھا ڈاکٹر عبدالحمید ملک آگئے جو ان دنوں انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے سرگرم کارکن تھے ۔ سلام و کلام کے بعد گفتگو کا دور چلا ۔

دفعتاً عبدالحمید ملک نے نہایت بے تکلفی سے علامہ سے پوچھا ۔

عبدالحمید ڈاکٹر صاحب ، آپ حکیم الامت کیسے بنے ؟

علامہ ۔ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں آپ چاہیں تو آپ بھی حکیم الامت بن سکتے ہیں ۔

عبدالحمید وہ کیسے ؟

علامہ ۔ میں نے گن کر ایک کروڑ مرتبہ درود شریف کا ورد کیا ہے آپ بھی اس نسخہ پر عمل کریں تو حکیم الامت بن سکتے ہیں ۔

راوی ، واقعہ یہ ہے کہ علامہ کو جب بھی فراغت ملتی تھی رسول رحمت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود سلام بھیجتے رہتے تھے خود فرماتے ہیں۔

کافر ہند ہیں دیکھ میرا ذوق و شوق

لب پہ صلوٰۃ و درود، دل میں صلوٰۃ و سلام

ث

راوی۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کیلئے علامہ سمیت پنجاب کے چوٹی کے وکیلوں کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی پر ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو علامہ جب اپنے کمرے میں گئے تو اُسے عشرت کدہ پایا۔ آسائش و آرام کی قیمتی سے قیمتی چیز موجود تھی۔ ان کیلئے جو بستر لگایا گیا تھا وہ تو خاص طور پر نرم و نفیس تھا۔ اس پر لیٹتے ہی یکایک اٹھ بیٹھے اور غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ کر رونے لگے پھر ملازم کو آواز دی۔

علامہ۔ علی بخش، علی بخش۔

علی بخش۔ کدھر ڈاکٹر صاحب ؟

علامہ۔ ادھر غسل خانہ کی طرف آؤ۔

علی بخش۔ غسل خانہ میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا کمرہ اور بستر تو بادشاہوں جیسا ہے۔

علامہ۔ علی بخش، ہاں مجھے بھی معلوم ہے لیکن بستر پر لیٹتے ہی مجھے خیال آیا کہ جس رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزار دی تھی اس خیال سے دل بھر آیا۔

اب اس نرم نفیس بستر پر لیٹنا میرے لئے ممکن نہیں جاؤ باہر سے کوئی معمولی سی چارپائی اٹھا لاؤ اور اس پر میرا معمولی بستر بچھا دو۔

علی بخش۔ جو حکم لیکن آپ ذرا اس کے مزے بھی اٹھاتے۔

علامہ۔ مجھے اپنے بوریئے میں زیادہ آرام ملے گا۔

راوی۔ اسوہ رسولؐ کی باتیں ہو رہی تھیں

وحیدالدین۔ ان حضرتؐ کا دیدار کیسے ہوسکتا ہے؟

علامہ۔ کسی بزرگ سے کسی نے یہی سوال کیا تھا انھوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنا اپنا شعار بناؤ اور زندگی میں ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو۔ یہی ان کا دیدار ہے

راوی۔ اقبال کو عزت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جو والہانہ محبت تھی اس کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ ان کا یہ شعر۔

بہ مصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ان کے احساسات کا آئینہ ہے۔

ایک مرتبہ اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

علامہ میں جو اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والد مکرم مجھے علوم دینی ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ صحیح راہ معلوم تھی تو وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہیں دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا۔ اور مجھ سے بھی جو ہو سکا میں نے کیا۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی (۱)

٭

راوی ۔ ۱۱ رجنوری کو ایک معتقد پیر صاحب علامہ سے ملنے آئے۔ بڑے احترام سے ملے کچھ تحائف بھی لائے تھے علامہ نے بھی غیر معمولی توجہ دی۔ وہ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوا رہے تھے اور ایک فرنگی گورنس کی تلاش میں تھے ان کے جانے کے بعد سید نذیر نیازی سے یہ گفتگو ہوئی۔

نیازی ۔ آپ ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں مجھے بھی ان کا احترام ہے

(۱) روزگار فقیر ص ۱۸۹ ۔

لیکن سوال عام پیروں کا ہے۔ یوں کہنے کو تو یہ حضرات آپ کی بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں لیکن کرتے کچھ نہیں .... ان پیروں کی زندگی بڑے ناز و نعم سے گزرتی ہے بقول آپ کے

ع گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ طرزِ زندگی شاید ہی انھیں کچھ کرنے دے۔

علامہ۔ دلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے مجھے تو کسی کے نام کی شرم ہے اسی کے بھروسے ان سے کچھ کہہ بھی دیتا ہوں (یہ کہتے ہوئے آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں) ممکن ہے اس نام سے ان کا انتساب ہی کسی نہ کسی دن ان کی زندگی کا رخ بدل دے۔ (۱)

ٍ

راوی۔ راجپال نامی ایک آریہ سماجی ہندو نے ایک دل آزار کتاب لکھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی گئی تھی اس حرکت سے سب مسلمان آزردہ اور مشتعل تھے۔ لاہور کے ایک نوجوان علم دین نے اسے قتل کر کے اس کی دریدہ دہنی کی سزا دی جب یہ خبر علامہ کو پہنچی تو علامہ نے کہا۔

" اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔"

(ہم تو باتیں ہی کرتے رہے یہ ترکھان کا بیٹا بازی لے گیا۔)

---

(۱) اقبال کے حضور

علمدین نے کھلم کھلا اقرار کیا تھا قتل میں نے ہی کیا ہے لیکن اس کے رشتے دار چاہتے تھے کہ کسی طرح جان بچ جائے اور وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے ۔ وہ لوگ علامہ کے پاس آئے ۔

رشتے دار ۔ ڈاکٹر صاحب آپ بڑے نامی وکیل ہیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ علمدین کو بچانے میں کچھ ہماری مدد کریں ۔

علامہ ۔ اس نے بڑا نیک کام کیا ہے اس سے جھوٹ بلوا کر کیوں اس کی نیکی برباد کرتے ہو ۔ اگر وہ شہید بھی ہو گیا تو بھی کوئی بات نہیں (۱)

ٹ

راوی ۔ حکیم احمد شجاع بقول خود ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اقبال کے شباب کا طلوع اور اس کا عروج دیکھا اور پھر غروب بھی دیکھا علامہ کی آخری علالت کے زمانے میں علامہ سے اُن کی یہ گفتگو ہوئی ۔

علامہ ۔ حکیم جی کیا عمر ہو گی میری ؟

حکیم شجاع یہ صحیح صحیح تو آپ ہی بتا سکتے ہیں ۔

علامہ ۔ میرا خیال ہے کہ میری عمر ساٹھ سال ہو چکی ہے ۔

حکیم شجاع بجا ہے ۔

علامہ ۔ اب میں زیادہ دیر تک زندہ رہنا نہیں چاہتا مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری عمر ۶۳ سال سے زائد نہ ہو جائے اس لئے کہ

---

(۱) نقوشِ اقبال نمبر۲ ص ۶۳۴ ۔

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر جہاں تک یقینی طور پر معلوم ہو سکا ہے ۶۳ برس کی تھی۔

روزِ محشر اعتبار ماست او
در جہان ہم پردہ دار ماست او

راوی۔ حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی ان کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں بڑی دھیمی اور پرسوز آواز میں یہ شعر پڑھا تھا پھر ان کی آواز بھرّا گئی اور سسکیاں بھر کے رونے لگے۔ (۱)

ش

راوی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو جامعہ ملّیہ دہلی کے مولانا اسلم جیراجپوری، طلوعِ اسلام کے مدیر غلام احمد پرویز ملاقات اور عیادت کیلئے تشریف لائے۔

پرویز۔ کیا حج کا پختہ ارادہ ہے؟

علامہ۔ ارادہ تو ہے بشرطیکہ صحت اجازت دے ورنہ اب کے سال نہیں تو اگلے سال سہی آگے جو اللہ کو منظور۔

پرویز۔ ہمیں تو آپ کی صحت کی فکر ہے دنیا میں ہر کسی کی کوئی غرض ہوتی ہے ہماری غرض آپ ہیں۔

علامہ۔ جو اللہ کو منظور ...... ایک طرح سے تو میں حج ہی کے راستہ میں ہوں چاہتا ہوں کہ یہ راستہ جلد طے ہو جائے یہ راستہ طے ہو جاتا لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ میں تو

(۱) نقوشِ اقبال: ۲ ص ۵۶۷

اب جو کچھ کہتا ہوں وہیں کیلئے کہتا ہوں۔

(جذبات کی شدت سے رک رک کر) آستانۂ اقدس پر پہنچ جاؤں تو کچھ اور بھی عرض کروں۔ (اشارہ ارمغان حجاز کی طرف تھا)

مولانا اسلم، پرویز۔ حضرت! کچھ تبرک کے طور پر عطا فرمائیے۔

علامہ۔ میں تو معذور ہوں انھیں کچھ یاد ہو تو سن لیجئے (اشارہ نذیر نیازی کی طرف)

پرویز۔ تو پھر نیازی صاحب۔ کچھ

تو سلطان حجازی من فقیرم
ولے در کشور معنی امیرم

علامہ۔ (دوسرے مصرعے پر رقت طاری ہونے لگتی ہے) دوسرا مصرع بار بار دہراتے ہیں۔

ولے در کشور معنی امیرم
ولے در کشور معنی امیرم
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم
من دارم

راوی۔ ابھی علامہ چوتھا مصرعہ پورا نہ کر سکے تھے کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے چوتھا مصرعہ ہے کہ

من دارم ہوائے منزل دوست (۱)

---

(۱) اقبال کے حضور ص ۳۸

راوی۔ علامہ کا دل عشقِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے لب ریز تھا حضور کا نام آتا تو اشکبار ہو جاتے دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو فقیر نجم الدین سے اس سفر کے تجربات پر باتیں ہو رہی تھیں۔

نجم الدین۔ اقبال تم ہو آئے۔ مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضہ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔

علامہ۔ (رقت کی حالت میں) فقیر امیں کس منہ سے روضہ اطہر پر حاضر ہوتا (۱)

ہ

راوی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو علامہ کو عشق تھا ارباب علم جمع تھے کسی نے ذکر چھیڑ دیا۔

یکے از حاضرین۔ مسجد نبوی کے اندر بلی نے بچے دیدیئے ایک صحابی نے کسی قدر برہمی سے انھیں باہر پھینکنے کی کوشش کی آنحضرتؐ کی نظر پڑ گئی تو بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔

علامہ۔ (رقت کی حالت میں) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں سب سے زیادہ اہمیت (مدرہوڈ) مادرانہ شفقت کی، ہے کہ یہی بنی نوع انسان کی بقا کا مقدس ذریعہ ہے (۲)

ہ

(۱) روزگارِ فقیر ص ۳۷ - (۲) روزگار فقیر ص ۷۱ -

راوی۔ علامہ لڑکیوں پر شفقت و محبت کے سلسلے میں اسوۂ رسولؐ پر کاربند تھے انہیں باعث رحمت سمجھتے تھے سر راس مسعود کے بیٹی ہوئی تو ایک قطعہ لکھا اور اس کے چوتھے مصرعے میں لڑکی کے وجود کو باعث برکات لامحدود قرار دیا۔ (۱)
علامہ کے بھتیجے اعجاز احمد کے ہاں تیسری بیٹی ہوئی تو ان سے کہا۔

علامہ۔ لڑکیوں کی افزائش رزق کی افزائش ہے کیا عجب خدا تعالیٰ تمہارے رزق میں توسیع کر دے۔

وحیدالدین۔ کیا یہ صحیح ہے کہ حج کرنے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟

علامہ۔ نہیں یہ بالکل غلط ہے۔

وحیدالدین۔ تو حج کی غرض و غایت کیا ہے؟

علامہ۔ بس خدا کا حکم ہے۔

ﭘ

پردہ اور مخلوط تعلیم

راوی۔ پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں علامہ کے خیالات بہت واضح تھے ایک روز بیگم سر راس مسعود نے شکایتاً کہا۔

بیگم مسعود۔ مرد خود تو تفریح کیلئے اور دل بہلانے کیلئے رقص و سرور

(۱) روزگار فقیر جلد ۱، ص ۱۶۵۔

کی محفلوں اور کلبوں میں چلے جاتے ہیں اور عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

علامہ۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس میں تمام تر خواتین ہی کا فائدہ ہے۔

بیگم مسعود۔ قرآن کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔

علامہ۔ بلاشک قرآن مجید میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے لڑکیاں ایک درس گاہ میں متحمل کر تعلیم حاصل کریں۔

ث

راوی۔ شعائرِ اسلام کے بارے میں علامہ کا کیا رویہ تھا اس کا اندازہ اس جواب سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایم اسلم کی معرفت میاں نظام الدین کو دیا میاں صاحب سے علامہ کے دیرینہ مراسم تھے۔ علامہ میاں صاحب کی آم پارٹیوں میں شوق سے شریک ہوتے تھے اور اپنی تصانیف اپنے دستخطوں سے میاں صاحب کو پیش کرتے تھے میاں صاحب بھی ان کی خاطر داری کا کوئی موقعہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ ایک روز میاں صاحب کے ہاں تقریب تھی انھوں نے اپنے بیٹے ایم اسلم کو علامہ کے پاس بھیجا۔

ایم اسلم۔ السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ آؤ جی میاں جی۔ میاں صاحب بخیریت ؟

ایم اسلم۔ شکر ہے سب ٹھیک ہیں۔

علامہ۔ کیسے آنا ہوا؟

ایم اسلم۔ میاں صاحب نے کہا ہے آج شام ہمارے یہاں ایک خاندانی تقریب ہے اگر آپ کیساتھ آپ کی بیگم صاحبہ بھی تقریب میں شامل ہوں تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔

علامہ۔ (کچھ توقف کے بعد) میاں صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں اور کہیں کہ میں عورتوں کا محفلوں میں مل جل کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا یہ ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔

☼

راوی۔ ایم اسلم کا بیان ہے گرمیوں کا موسم تھا۔ علامہ حسب دستور کوٹھی کے برآمدے کے سامنے پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے نصف آستین کی بنیان اور لٹھے کا تہمد پہنے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ایک طرف وہ اور دوسری طرف چودھری محمد حسین بیٹھے ہوئے تھے ایک صاحب جو اخبار کے رپورٹر تھے ہانپتے کانپتے آئے۔

محمد حسین۔ کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟

رپورٹر۔ سیدھا سینٹ ہال کی میٹنگ سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔

علامہ۔ کیا ہوا وہاں؟

رپورٹر۔ آج خلیفہ صاحب نے سینٹ میں مخلوط تعلیم کا ریزولیشن پاس کروا لیا۔

علامہ۔ (غصے سے چہرہ سرخ اور پلنگ پر زور سے ہاتھ مار کر) آج مسلمانوں کی ذلت پر مہر لگادی گئی ہے۔

☆

راوی۔ لندن میں روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی ایک مشہور دکان ہے سیلف رجز۔ گول میز کانفرنس کے قیام کے دوران علامہ سید امجد علی کے ہمراہ وہاں گئے۔

علامہ۔ (سیلز گرل سے) جرابیں دکھائیں؟

لڑکی۔ بہت بہتر...... یہ لیجئے۔

علامہ۔ تم یہاں کس لئے کھڑی ہو؟

لڑکی۔ میرے والدین کی آمدنی بہت ہی کم ہے اس آمدنی میں وہ میری کفالت نہیں کر سکتے اس لئے مجھے نوکری کرنی پڑتی ہے۔

(دکان سے واپسی پر)

امجد علی۔ آپ نے اس لڑکی سے یہ سوال کیوں کیا؟

علامہ۔ اس لڑکی کو گھر سنبھالنا ننھے بچوں کی صحیح تربیت کرنی تھی اس کی تخلیق کا مقصد دکان کی رونق بڑھا کر جرابیں بیچنا تو نہیں تھا

☆

راوی۔ فقیر سید وحید الدین علامہ کی خدمت میں باریاب تھے

فقیر۔ عورتوں کی آزادی کے بارے میں آپکی رائے کیا ہے؟

علامہ ۔ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت نہیں مل سکتی اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کے ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا مثلاً عورت کو جس کا اصلی کام آئندہ نسل کی تربیت ہے ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم برہم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے ۔

ٹ

راوی ۔ ۱۹۲۷ء کی بات ہے علامہ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک تقریب میں مدعو تھے باتوں باتوں میں پردے کا ذکر چھڑ گیا کالج کے پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے علامہ سے کہا۔

یوسف علی ۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو پردے کا مخالف ہونا چاہیے ۔

علامہ ۔ لیکن میں تو پردہ کا بڑا حامی ہوں ۔

یوسف علی ۔ وجہ؟

علامہ ۔ پردہ سے جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے جو جنسیت کی جان ہے

اقبالؒ اور نقطہ پاکستان

راوی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور کا ایک معتبر انگریزی اخبار) میں ڈاکٹر اسٹینلے جونز کا ایک مضمون چھپا تھا

علامہ۔ (نذیر نیازی سے) آج کی کیا خبر ہے؟

نیازی۔ خبر تو خاص نہیں ابتدا میں ایک خاص مضمون ضرور دیکھا۔

علامہ۔ کیا؟

نیازی۔ ڈاکٹر جونز کہتے ہیں کہ موجودہ تہذیب کا سب سے بڑا مرض قلب کی موت ہے۔ آپ کا بھی ایک شعر ہے۔

ع گفت مرگ قلب؛ گفتم ترک ذکر۔

علامہ۔ ٹھیک ہے۔

روحانی اعتبار سے دنیا کی حالت کبھی ایسی پست نہیں تھی جیسی اب ہے۔ تاریخ سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور ملکوں پر اخلاقی موت طاری رہی۔ لیکن بحیثیت مجموعی آج کا انسان کہیں زیادہ گر گیا ہے۔

مسلمانوں ہی کو دیکھ لو دنیا کا کوئی عیب نہیں جو ان میں موجود نہ ہو۔ ہماری اخلاقی پستی کیسی افسوسناک ہے۔ تھوڑا بہت اتحاد جو لیگ کی بدولت قائم ہو گیا بڑا اُمید افزا ہے کانگریس کس قدر

مرعوب ہے اس اتحاد کے نتائج بڑے شاندار ہوں گے اگر کہیں مسلمانوں کو ایک قطعۂ ارض مل جائے تو اور بھی اچھا ہو۔

نیازی۔ پاکستان۔؟

علامہ۔ ہاں پاکستان یا اسے جو بھی چاہے کہہ لو۔ (۱)

اقبالؒ اور جناحؒ

راوی۔ اپریل ۱۹۳۶ء کے اواخر میں قائدِ اعظم مسلم لیگ پارلیمانی گروپ کی تشکیل کیلئے لاہور تشریف لائے پہلے میاں سر فضل حسین سے ملے ان سے مایوس ہو کر علامہ سے ملاقات کیلئے جاوید منزل کا رخ کیا۔ کچھ سال پہلے جداگانہ انتخاب کے مسئلے پر دونوں میں شدید اختلافِ رائے رہ چکا تھا یہاں تک کہ علامہ جناح لیگ کی حریف جماعت شفیع لیگ کے سیکرٹری بھی رہے تھے ایک روایت یہ بھی ہے دوسری گول میز کانفرنس کے بعد ان کی پہلی ملاقات تھی۔ قائدِ اعظم اپنی روایتی جامہ زیبی کے ساتھ تشریف لائے علامہ اپنی درویشی میں مست تھے۔ جسم پر معمول کے مطابق بنیان دھوتی تھی اور تکیئے کے سہارے بستر پر نیم دراز تھے۔

قائدِ اعظم۔ (پارلیمانی گروپ کی تشکیل کی ضرورت کی وضاحت کے بعد)

(۱) اقبال کے حضور ص ۱۳۱۔

اس سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔

علامہ۔ میں آپ کو اپنی بھرپور امداد کا یقین دلاتا ہوں اگر آپ یو۔ پی کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔

قائدِ اعظم (کرسی سے دو انچ اٹھ کر اور بڑے جوش سے) مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔ (۱)

⁂

راوی۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے اور مسلمانوں سے رابطے کی تحریک کے سلسلہ میں علامہ سے بھی ملے۔

نہرو۔ چونکہ فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کے سلسلہ میں مسٹر جناح بہت متشدد ہیں لہذا آپ ہی ہمارے ساتھ بات چیت کر کے مفاہمت کی کوئی راہ نکالئے۔

علامہ۔ پنڈت جی اگر فلسفہ اور شعر وغیرہ پر کوئی بات کرنی ہو تو میں حاضر ہوں جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے اس سلسلے میں میرے تمام تر اختیارات میں نے مسٹر جناح کو دے رکھا ہے ان کے علاوہ کوئی بھی دوسرا شخص کانگریس کے ساتھ مفاہمت تو کیا بات چیت بھی نہیں کر سکتا۔ (۲)

⁂

---

(۱) سرگزشتِ اقبال ص ۵۱۵ ۔ (۲) اقبال کی صحبت میں ص ۲۴۶

راوی۔ م۔ ش لکھتے ہیں کہ جون ۱۹۳۶ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے بعض نوجوان اراکین علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

اراکین۔ اب تک ہم نے اپنی توجہ مسلم طلبہ کی اخلاقی اصلاح تک مرکوز رکھی ہے نئے سیاسی حالات کے پس منظر میں آپ ہماری کچھ رہ نمائی فرمائیں۔

علامہ۔ ہندی مسلمانوں کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ان کے اعلیٰ درجہ کے سیاسی دماغ یا تو حکومت کے کیمپ میں ہیں یا وہ کانگریس سے منسلک ہو چکے ہیں ملتِ اسلامیہ قابلِ اعتماد قیادت کی راہ نمائی سے محروم ہونے کے باعث آج چوراہے پر کھڑی ہے اس بظاہر مایوس کن ماحول میں امید کی ایک کرن مسٹر جناح کی شخصیت کی شکل میں نظر آتی ہے وہ ہندوستان میں واحد شخص ہیں جنھیں نہ تو ہندو خرید سکتا ہے اور نہ حکومت دبا سکتی ہے۔

مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی میں ۷ فروری ۱۹۳۶ء کو اپنے تدبر سے انگریزی حکومت اور کانگریسی اپوزیشن کے مابین مٹھی بھر مسلم اراکین کو پاسنگ کی حیثیت دے کر ایک طرف کمیونل آوارڈ کو منظور کروالیا ہے اور دوسری طرف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت مجوزہ مرکزی فیڈریشن کا منصوبہ بھی مسترد کروالیا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ملی مفاد کے ایسے بے خوف اور باتدبیر نگہبان کی حمایت میں سرگرم عمل ہوں میں آپ لوگوں کو یہ مشورہ بھی دوں گا کہ آپ مسٹر جناح کی تائید میں ایک اخباری بیان جاری کریں تاکہ یونینسٹوں کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کس

طرح سوچتی ہے۔

راوی۔ چنانچہ علامہ کے ارشاد کے مطابق مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی حمایت میں ایک زوردار بیان جاری کر دیا گیا پنجاب کی اس وقت کی سیاست کے پس منظر میں یہ بھی ایک اہم سیاسی کام تھا۔

اس واقعہ کے کچھ عرصے کے بعد علامہ کے مشورہ سے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا (جس نے آگے چل کر قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر یونی نیسٹ پارٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی) فیڈریشن کے پہلے صدر حمید نظامی اور دوسرے عہدیدار علامہ کی خدمت میں اس تنظیم کے نام پیغام کیلئے حاضر ہوئے تو گفتگو کا اختتام ان الفاظ پر ہوا۔

اراکین۔ بجا فرمایا آپ نے ہم مسلم طلبہ پنجاب کی سیاست میں ایک قوت بن کر اُبھرنا چاہتے ہیں۔

علامہ۔ لیکن میں آپ لوگوں کو یاد دلا دوں کہ

"طاقت حاصل کرنا بُری بات نہیں لیکن طاقت کا غلط استعمال کرنا شیطان کا کام ہے۔"

*

راوی۔ م۔ش نے جو علامہ کی زندگی کے آخری دو سالوں میں کم و بیش ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ لکھا ہے مارچ ۱۹۳۷ء میں ہند اور بیرونِ ہند ایک ہزار مقامات پر یوم اقبال منایا گیا۔ نیروبی (کینیا) سے ایک قرارداد موصول ہوئی چونکہ ہوتیا

اثر نے کی وجہ سے علامہ خود لکھنے پڑھنے سے معذور تھے اس لئے م.ش ان کیلئے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے قرارداد کے بارے میں ان کے اور علامہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

م.ش۔ نیروبی کے مسلمانوں کی قرارداد کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔

علامہ۔ جی کچھ یاد تو پڑتا ہے کیا تھا اس ریزولیشن میں؟

م.ش۔ منجملہ اور باتوں کے اس میں آپ کے علاوہ قائداعظم رح اور اتاترک کی درازیٔ عمر کی دعائیں کی گئی ہیں۔

علامہ۔ آپ نیروبی کے مسلمانوں کی انجمن کو میرا یہ پیغام لکھ دیجئے میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں میرے بجائے آپ صرف قائداعظم اور اتاترک کی درازیٔ عمر کیلئے دعا کریں۔

م.ش۔ آپ کی صحت تو سنبھل رہی ہے آخر آپ اپنی زندگی سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟

علامہ۔ شفیع جی! میں اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکا ہوں، اب مجھے زیادہ زندہ رہنے کی ہوس نہیں ہے۔

پ

راوی۔ ۲ فروری ۱۹۳۸ کی شام کا ذکر ہے راجہ حسن اختر اور سید نذیر نیازی حاضر خدمت ہیں۔

علامہ۔ ملک کے حالات کیا ہیں؟

راجہ حسن اختر دلی کے مسلم لیگ کے اجلاس کی کاروائی آئی ہے (اخبار

سے سناتے ہیں)

علامہ۔ جناح کی زبان سے دین کا لفظ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

نیازی۔ اب تو ان کی تقریروں میں اچھی ٹیٹرھی کا رنگ آچلا ہے۔

علامہ۔ مسٹر جناح کی تقریر سب مجھے بھی پڑھ کر سنایئے۔

نیازی۔ (پوری تقریر پڑھ کر سناتے ہیں)

علامہ۔ دو باتوں سے جی بہت خوش ہوا ہے ایک تو جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی کی تحریک دراصل اردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر۔ (۱)

۴

راوی۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں علامہ کا دم واپسیں ہی تھا بدن حد درجہ مضمحل ہونے کے باوجود دل و دماغ مضمحل نہیں تھے ہر طرح کی بحثوں میں حصہ لیتے اور بڑے جوش و خروش سے، دم کشی کی تکلیف ہو جاتی تو تھوڑی دیر کیلئے تکیوں کا سہارا لے لیتے۔ جوں ہی سانس ٹھیک ہوتی پھر گفتگو شروع کر دیتے وہ ابن سینا کا یہ قول اکثر دہراتے۔

" ما عرض حیات خواہیم، طول حیات نمی خواھیم "

ہمیں عرض حیات چاہیئے، طول حیات نہیں۔

حکیم قرشی۔ مسلمان صحیح قیادت سے محروم ہیں۔

---

(۱) اقبال کے حضور ص ۱۳۶

علامہ۔ ٹھیک ہے قوم کو اس وقت قیادت کی ضرورت ہے۔ ایسی قیادت جس سے اس کے دل و دماغ میں جلا پیدا ہو جو ان کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔

بر دست ایک ہی صورت ہے مسلمانوں کو چاہیئے جناح کے ہاتھ مضبوط کریں۔ لیگ میں شامل ہو جائیں ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اب جس طرح حل کیا جا رہا ہے اس میں ہمارا متحدہ محاذ ہی انگریزوں اور ہندوؤں کی مخالفانہ کاروائیوں کا واحد جواب ہے۔ بغیر اس کے ہم اپنے مطالبات کیسے منوا سکتے ہیں لوگ کہتے ہیں ان مطالبات سے فرقہ داری کی بو آتی ہے یہ محض پروپیگنڈا ہے ان مطالبات کا تعلق ہمارے قومی وجود کے تحفظ سے ہے۔

متحدہ محاذ لیگ ہی کی سربراہی میں قائم ہو سکتا ہے اور لیگ قائم رہے گی تو جناح کے سہارے، جناح کے سوا اب کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔

❊

راوی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کی صبح اخبارِ انقلاب کے عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر حاضرِ خدمت تھے یونینسٹ پارٹی زیرِ بحث تھی۔

علامہ۔ ہمارے مسائل کا صرف ایک حل ہے۔ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے سب اس میں شامل ہو جائیں سب اس کو تقویت پہنچائیں۔ مسلمانوں کی زمامِ قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں رہے۔ (۱)

(۱) اقبال کے حضور ص ۲۹۰

"ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔"

۞

راوی۔ ارسطو کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی اکاڈمی میں ٹہل کر فلسفہ کا درس دیا کرتا تھا۔ جاوید منزل کی اکاڈمی میں علامہ اپنے بستر پر نیم دراز گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے علم و حکمت کے موتی بکھیرتے تھے ایک صحافی بادشاہ حسین علامہ کی وفات سے تقریباً دو سال پہلے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ایک انٹرویو کے انداز میں اس زمانے کے سیاسی حالات پر گفتگو کی جسے انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء کے پاکستان ٹائمز میں نقل کیا ہے مضمون کا عنوان ہے (Why Iqbal's Choice fell on Jinnah)

بادشاہ حسین۔ اگر زحمت نہ ہو تو قوم کی موجودہ زبوں حالی اور سیاسی حالات پر کچھ روشنی ڈالیئے۔

علامہ۔ میرے نظریے کے مطابق ہماری قوم کی ترقی کا راز سیاسی آزادی میں پنہاں ہے۔

برطانوی استعمار ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ہندوؤں کا غلبہ بھی ہمارے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے دونوں طرف کا دباؤ ہمیں کچل رہا ہے ان حالات میں ہر صحیح الفکر مسلمان نہ صرف ہندوستانی سیاست میں حصہ لے رہا ہے بلکہ بیحد مضطرب بھی ہے

بادشاہ حسین ۔ کیا اسی وجہ سے آپ سیاست کے میدان میں داخل ہوئے ہیں ؟

علامہ ۔ میرے سیاست میں داخل ہونے سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟ میں پہلے بھی میدانِ سیاست میں تھا اور اب بھی ہوں مسلمانوں کی فلاح و بہبود میری ساری زندگی کا مشن رہا ہے ۔ کیا یہ سیاست سے کوئی مختلف چیز ہے ؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں عوامی رہنما نہیں رہا ، تو یہ محض غلط فہمی ہے ۔

میں نے اپنے کلام سے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا ۔ کیا میں نے مسلمانوں میں کمتری کے غلط احساس کو کم نہیں کیا ؟ کیا میں نے یہ تلقین نہیں کی کہ مسلمان مجاہد ہیں ؟ کیا میں نے انجام کار اس برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک الگ وطن کا تصوّر نہیں دیا ؟

بادشاہ حسین ۔ آپ بجا فرماتے ہیں برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی و ملّی بیداری بڑی حد تک آپ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحیح رہنما ہے جو ان مجاہدوں کی قوت کو منزلِ مقصود حاصل کرنے کیلئے استعمال کر سکے ۔ کیا آپ کے خیال میں مسٹر جناح وہ تقدیر ساز شخصیّت ہیں ؟

علامہ ۔ جی ہاں میری بصیرت کہتی ہے کہ مسٹر جناح ملتِ اسلامیہ کو منزلِ مقصود تک پہنچائیں گے ۔

بادشاہ حسین ۔ کیا آپ نے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے ؟

علامہ ۔ میں نے تقریباً تمام اہم مسائل پر خط و کتابت کے ذریعے عملاً ان سے گفتگو کی ہے ۔

بالمشافہ ہی تفصیل سے تبادلہ خیالات کیا ہے مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح سے بڑھ کر کوئی دوسرا رہنما اس مشکل کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

بادشاہ حسین۔ لیکن شاید عوام میں انہیں ابھی مقبولیت حاصل نہیں۔

علامہ۔ یہ میری پیشگوئی ہے کہ مسٹر جناح ایسے کردار و اخلاق، فہم و تدبّر اور عزم محکم کے مالک ہیں جن کی بنا پر جلد ہی وہ ایک ایسے عوامی ہیرو بن جائیں گے کہ مسلم ہندوستان میں ابھی تک اس قسم کا کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوا۔

مسٹر جناح برطانوی سامراج کی اصلیت سے بھی بخوبی واقف ہیں اور وہ کانگرس کی ذہنیت کے بھی بھیدی ہیں یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور ان کو شکست دے سکتے ہیں۔

بادشاہ حسین۔ شکریہ۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔

☆

اقبالؒ، سرسیّدؒ اور نظریۂ وطنیّت

راوی۔ جنوری ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ سیّد نذیر نیازی جاوید منزل میں علامہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ سرسیّد کے زمانے کی سیاست زیرِ بحث تھی۔

نیازی۔ سرسید کی قیادت ہماری نشاۃ ثانیہ کی تمہید ہے۔ لیکن سرسید نے جو کچھ کہا تھا وہ باعتبار حالات اور بہ تقاضائے مصلحت تھا اطاعت و وفاداری بھی ایک وقتی چیز تھی اور حصول تعلیم بھی مسلمانوں کی ذہنی بیداری میں ایک ضروری مرحلہ لیکن ہوا یہ اور سرسید کے خلاف منشاء ..... کہ اطاعت نے وفاداری لہذا محکومیت اور تعلیم نے انگریزیت بہ الفاظ دیگر مغربیت کا راستہ اختیار کیا۔

علامہ۔ سرسید کی ذات بڑی بلند تھی بڑی ہمہ گیر۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔

نیازی۔ علی گڑھ ایک نئی قومی زندگی اور نئی روح کا مظہر تو بنا وہ روح جو ہمارے جذبہ ملی اور قومی عصبیت کا سرچشمہ ہے اور جس کی بدولت ہم نے ماضی سے نکل کر مستقبل میں قدم رکھا لیکن علی گڑھ یہ نہیں سمجھا کہ اسلام نے تہذیب و تمدن کا ایک اپنا تصور قائم کیا ہے اور ہماری انفرادیت اور جداگانہ تشخص کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ اس تصور کی ترجمانی اپنے عمل میں کریں ایسے ہی یہ حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہی کہ اسلام بجائے خود ایک نظام اجتماع و عمران ہے۔

علامہ۔ غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل و دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا یا پھر یوں کہنا چاہیئے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے یہ قوت علیگڑھ میں کارفرما تھی لہذا باوجود مغربی تعلیم کے مسلمانوں کا جذبۂ ملی قائم اور برقرار رہا۔[۱]

---

(۱) اقبال کے حضور ص ۲۶

راوی۔ وکالت کے ابتدائی دور میں علامہ کا زیادہ اُٹھنا بیٹھنا مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ساتھ تھا۔ ایک روز مرزا صاحب نے پوچھا۔

مرزا صاحب۔ سرسید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے

علامہ۔ میں سرسیّد کی اصلاحی تحریک کا مداح ہوں لیکن جہاں تک اُنکی تفسیر کا تعلق ہے اس سے اختلاف کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مرزا صاحب۔ تو پھر آپ متنازعہ نکات کی وضاحت کی خاطر قرآن پاک کی تفسیر خود کیوں نہیں لکھتے۔

علامہ۔ لکھنا تو چاہتا ہوں یہ میری خاص خواہش ہے۔

مرزا صاحب۔ تو لکھنے رکاوٹ کیا ہے؟

علامہ۔ کام بڑا ہے اس کیلئے وقت وسائل ضروری مواد عملہ بہت کچھ چاہیئے جو میسّر نہیں۔

٭

راوی۔ قوم اور وطنیت کے پس منظر میں سرسیّد کی تحریک زیر بحث تھی۔

علامہ۔ سرسید کے مخالف علماء نے یہ نہیں سوچا کہ سرسیّد نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ تہذیب الاخلاق نکالا۔ علی گڑھ کالج قائم کیا مسائل الٰہیات پر قلم اُٹھایا تو اس سے اُن کا مدعا کیا تھا یہی کہ مسلمانوں کو اپنی وحدت کا شعور ہو وہ ایک قوم ہیں۔ لہٰذا بہ حیثیت ایک قوم اُنھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ مغرب کے سیاسی معاشی غلبے یا علوم وفنون میں ان کے اجتہادات اور اختراعات نے ہمارے لئے کیا مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ وہ اتحاد

دکھیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور علم وحکمت کی جو رو انگریزی تسلط کیساتھ آگئی ہے ڈرنے کی چیز نہیں ہے ہم اس سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیئے اسلامی عقائد کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سر سیّد کے خیالات اور ان خیالات کے تحت اُنھوں نے جو اقدامات کئے وہ تنقید سے بالاتر نہیں۔ ان میں گفتگو کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ اقدامات ضروری تھے حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جائے۔ جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی سر سیّد کی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ کام کیا۔ یہ اقدام بہر حال ضروری تھا یہی بات ہے جو ان نکتہ چینیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

نیازی۔ اور دیوبند ؟

علامہ۔ دیوبند بھی نہیں سمجھا کہ سر سیّد نے ایک نیا دار العلوم قائم کیا تو کیوں ؟

یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند میں تعاون کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ نہ مفاہمت کی دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹتے چلے گئے۔ ایک نے قدامت، دوسرے نے تجدد کا سہارا لیا مگر یہ جو کچھ ہوا ٹھیک نہیں ہوا اگر علی گڑھ اور دیوبند ایک دوسرے کو سمجھ لیتے تو ہمارے ذہن میں دین کا تصور اور زیادہ راسخ ہوجاتا ہم اپنے مسائل کو زیادہ بہتر سمجھتے اور جیسے بھی حالات ہیں ان میں اپنا موقف زیادہ صحت اور یک جہتی سے متعین کر سکتے۔

نیازی۔ دیوبند کی نظر بھی تعلیم اور معاشرہ پر تھی اس کے مقاصد

سیاسی تھے۔

علامہ۔ قوموں کی زندگی تحریکوں سے ہوتی ہے تحریکیں ہیں تو قومیں بھی زندہ ہیں وہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھتی اور ان کے پیش نظر مختلف سمتوں میں قدم اُٹھاتی ہیں۔ یوں ان کے مستقبل کا رخ متعین ہو جاتا ہے تحریکیں گویا وہ اقدامات ہیں جو زندگی کی پیش رو حرکت کے باعث ناگزیر ہو جاتے ہیں لیکن تحریک جب ہی تحریک ہے کہ اس سے قوم کی وحدت میں فرق نہ آئے۔ بلکہ جس انداز سے بھی آگے بڑھے اس سے حیاتِ ملّی کو تقویت پہنچے افراد سمجھیں کوئی منزل ہے جو ان کے سامنے ہے اور جس کو انھیں طے کرنا ہے۔

مجھے دیوبند پر بہ حیثیت دیوبند کوئی اعتراض نہیں وہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ ماضی سے ہمارے تعلق کا رہنا ضروری تھا میری پختہ رائے ہے کہ قدامت پسندی قوموں کی زندگی میں ایک تقویت بخش عنصر ہے گو تنہا یہ عنصر کافی نہیں۔ قدامت پرستی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ ہمارا ماضی محفوظ رہے۔ ہم ماضی ہی کو ساتھ لئے آگے بڑھتے ہیں یہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے دیوبند آگے نہیں بڑھا۔ دیوبند کی حیثیت ایک واقعہ کی ہے تحریک کی نہیں ہے جیسے علیگڑھ کی۔

سوچنے کی بات ہے جس مصلحِ اعظم نے اس تحریک کی ابتدا کی اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ بابِ اجتہاد وا ہو۔ اور اُمت تقلید کے بندھنوں سے رہا ہو جائے چونکہ ردِ بدعات کے سلسلے میں حدیث کا مطالعہ ضروری تھا لہٰذا حدیث کے مطالعہ

پر زور دیا گیا لیکن ہوا یہ کہ اس تحریک نے بجائے تحریک کے ایک نئے فرقے کی شکل اختیار کر لی۔ یوں عالم اسلام کے ملی اور سیاسی استحکام کو بڑا ضعف پہنچا۔

نیازی۔ کیا یہ اس لئے کہ اس تحریک نے جس آزادی اجتہاد پر زور دیا تھا اس کا دائرہ بڑا محدود تھا۔ یہ احتجاج بعض سطحی باتوں سے آگے نہیں بڑھا۔

علامہ۔ اسلام ایک وحدت ہے جس میں فرد اور جماعت کو جزو کل جیسا تعلق ہے یہی نسبت حیاتِ ملی کے ایک پہلو کو دوسرے سے ہے۔

اسلام کی روح اجتماعی ہے لہٰذا عالمِ اسلام کا زوال وانحطاط رک سکتا ہے۔ تو کسی ایسی تحریک سے جو اس پورے کل پر محیط ہو جسے ہم دینِ اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یوں دیکھنے میں اس کی نوعیت سیاسی ہو یا اجتماعی، اخلاقی یا مذہبی یعنی کسی ایک پہلو پر مرکوز۔

گو بحالت موجودہ جو تحریک بھی اُٹھے گی اس کی نوعیت لازماً سیاسی ہو گی بغیر اس کے ناممکن ہے کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ میں کوئی معنی پیدا ہوں۔ ہم اپنا اختیار واقتدار کھو بیٹھے ہیں ہمارا شیرازہِ وحدت بکھر چکا ہے۔ ہماری کوئی سیاست نہیں۔ سیاست نام ہے اتحاد وارتباط کا سیاست عبارت ہے اختیار واقتدار سے۔

سیاست کو قوم سے وہی نسبت ہے جو جسم سے جان کو۔

ہماری نشاۃِ ثانیہ کیلئے جو تحریک بھی اُٹھے گی اس کی نوعیت لازماً سیاسی ہوگی۔ یوں بھی ایک ایسی تحریک کو جس کی روح اجتماعی ہے یعنی جس نے حیاتِ ملّی کا تمام و کمال احاطہ کر رکھا ہے سیاسی کہا جائے گا لیکن ہماری سیاست ان نسلی اور وطنی یا سیاسی اور معاشی قوتوں کی پیداوار نہیں جن کو آج بنائے اجتماع اور قومیت تصور کیا جاتا ہے ہماری سیاست کی روح اخلاقی ہے یعنی ان مصالح اور مقاصد کی مظہر جن کا تعلق نوع انسانی کے مستقبل اور خیر و سعادت سے ہے۔

اس تحریک کو بجز صحیح معنوں میں ملّی اور اسلامی ٹھہرا سکتے ہیں۔ سید ہماری نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی جس کی حقیقی روح اور اغراض و مقاصد کو اگرچہ بہت کم لوگ سمجھے باایں ہمہ وہ اپنے مقاصد میں ناکام نہیں اس تحریک کا بہ نگاہ غائر مطالعہ ضروری ہے۔ اہل یوروپ کی تحریروں نے اس پر ایک پردہ سا ڈال رکھا ہے لیکن ایک ایسی تحریک جو محض سیاسی ہے (یعنی آجکل کی اصطلاح میں سیاسی) اس سے نہ اتحاد و ملّت کا راستہ کھل سکتا ہے نہ اجزائے ملّت کی شیرازہ بندی کا امکان ہے لہذا ایک طرح سے دیکھا جائے یعنی ان مثبت تصورات کے اعتبار سے جو بحیثیت ایک نظام حیات اسلام کے سامنے ہیں تو اس قسم کی تحریکوں کی نوعیت بڑی حد تک سلبی ہوگی۔

لیکن اگر کسی تحریک کی نوعیت محض فقہی ہے یا اخلاقی اور اصلاحی یا اس کا رخ ان معنوں میں سیاست کی طرف ہے کہ اس سے کسی خطرے کی پیش بندی مقصود ہے جو کسی پہلو سے ملّت کو درپیش ہے

تو اس کی ضرورت اور مصلحت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی اساس خالصتًا اسلامی ہو یعنی اس اصول پر مبنی جو ہماری حیاتِ ملی کا صورت گر ہے بعینہٖ جیسے ایک طبیب حاذق کسی معمولی سے معمولی مرض کا علاج بھی کرتا ہے تو پورے جسم کی صحت اور حفاظت کی رعایت سے۔

لیکن یہی بات ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ ہر اصلاحی اخلاقی تحریک کسی نہ کسی فرقہ بندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ عالم اسلام میں اکثر ایسا ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے بہ طرز عمل اتحاد ملت کے منافی ہے۔ اس سے نہ اُمت کے احیاء کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے نہ تو ذمہ داریوں سے پورا اُترنے کی جس کیلئے اس کی تشکیل ہوئی۔ کانگریسی خیال کے علماء میں سیاسی بصیرت کا فقدان ہے وہ نہیں جانتے کہ ھندو آزادی اور شہنشاہیت دشمنی کے پردے میں کیا کھیل کھیل رہے ہیں البتہ سر سید اس نکتے کو خوب سمجھے انھوں نے نہایت صحیح کہا کہ مجھے ایسے آئین سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں میرا کوئی حصہ نہیں یا اگر کہنے کو ہے لیکن نہ تو میں اپنا حق منوا سکوں نہ اسے چھیننے سے روک سکوں۔ کانگریس کے مطالبہ آزادی کی بھی روح اور اساس وہی ہے۔ ان کے پیش نظر سر سید نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ھم کانگریس سے الگ رہیں کانگریس میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے اس فرضی اور خیالی یعنی ہندوستانی قومیت کا وجود تسلیم کر لیا ہے جو در اصل ہندو قومیت ہی کا ایک دوسرا نام ہے

ہندوستانی قومیت کا اقرار اُمت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے۔

یہ سب حقائق اس وقت دبے دبے تھے لیکن جیسے جیسے اس دین سیاست کے خدوخال اُبھرنے لگے جس کی ابتدا انگریزی حکومت نے محض اپنے مفاد کے پیش نظر یا اپنے مخصوص آئین سیاست سے مجبور ہوتے ہوئے کی تھی یہ حقائق بھی رفتہ رفتہ منظرِ عام پر آتے گئے اور اب یہ تمام و کمال ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے ہمیں طے کرنا ہے کہ ہم جغرافیائی قومیت کا اصول تسلیم کرلیں یا جیسا کہ اسلام کا تقاضا ہے اپنا ملی اور سیاسی وجود قائم رکھیں جغرافیائی قومیت میں اسلام کی حیثیت محض ایک نظام اخلاق کی رہ جائے گی جس کی انتہا بہت ممکن ہے لادینیت پر ہو۔

یا پھر مسلمان ہندو اکثریت سے دب جائیں گے یعنی ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی اختیار کرلیں گے۔

سرسیّد کی رائے نہایت صائب تھی سرسیّد نے خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ کیا ہے سرسیّد کو علماء نے کیا کچھ نہیں کہا۔ کافر، ملحد، کرسٹان، لیکن سرسیّد کا کتنا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا جو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کو درپیش تھا انھوں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت پر زور دیا وہ جب تعلیم پر زور دیتے یا تہذیب و تمدن میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتے جب بھی ان کا کہنا یہی تھا کہ ہم اپنا جداگانہ ملّی وجود ہر حالت میں قائم رکھیں۔

یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا

ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے۔ یہ گویا ہماری نشأۃ ثانیہ ہی کی تحریک تھی۔

مسلمانوں کیلئے اس وقت دو خطرے ہیں ایک جغرافی قومیت دوسرا وحدت اُمت کی نفی، پہلا خطرہ مغرب کے الحاد پرور خیالات، مغربی تہذیب و تمدن کے اثر و نفوذ اور نئی تعلیم کا پیدا کردہ ہے جسے کانگریس کی لادین سیاست طرح طرح سے ہوا دے رہی ہے اور جس کا بعض علماء انگریز دشمنی کے فریب میں نادانستہ خیر مقدم کر رہے ہیں دوسرا قادیانیت کی طرف سے ہے۔[1]

راوی۔ نظریۂ وطنیت کی بات ہو رہی تھی

علامہ اہل مغرب کا اتحاد تہذیب و تمدن کا اتحاد ہے اس لئے کہ باوجود اختلافِ نسل اور جذبۂ وطنیت کے اہل یورپ کی زندگی بڑی حد تک مشترک اور سطح نظر یکساں ہے۔ وہ چاہتے ہیں ان کا ربطِ باہمی بہر حال قائم رہے اپنا کھویا اتحاد پھر سے حاصل کرنے کی آرزو بار بار ان کے سینے میں اُبھرتی ہے۔

نپولین کی بڑی کوشش تھی کہ اس اتحاد کی تجدید کرے لیکن وہ جس متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہا تھا اس کی تعبیر انگلستان کے تجارتی اور سیاسی مصالح نے پوری نہ ہونے دی۔ نپولین نے طاقت سے کام لینا چاہا اور ناکام رہا آگے چل کر وہی خواب نطشے نے دیکھا بظاہر وہ طاقت کا پرستار اور جنگ کا داعی تھا لیکن بہ باطن ایک

---

[1] اقبال کے حضور۔ سید نذیر نیازی

جدید نظام اجتماع کا علمبردار اس کی کوششیں بھی نپولین کی طرح رائیگاں گئیں۔ انجمن اقوام بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے لیکن یہ کوشش بھی ناکام ہو رہی (گفتگو کا رُخ مسلمانوں کے اتحاد اور متحدہ قومیت کے نظریے کی طرف پھرنے کے بعد) وطنیت پسند مسلمان تو خیر اپنی تربیت سے مجبور ہیں۔ ان کا دل و دماغ مغربی تعلیم کے زیرِ اثر اس حد تک بدل چکا ہے کہ وہ کسی دوسرے رنگ میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ یوں بھی دنیا میں ہر کہیں وطنیت کا غلبہ ہے اور بلادِ اسلامیہ میں بھی یہ جذبہ ہر کہیں اُبھر رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محکوم قومیں جب کسی قوم کے ہاتھوں اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں اور دوسری قوموں کو آزاد یا آزاد ہوتے دیکھتی ہیں تو ان کے اندر بھی قومی اور نسلی عصبیتوں کو تحریک ہوتی ہے لہٰذا آج کل کے نوجوان اگر نشۂ قومیت میں سرشار ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن (نیشنلسٹ) علماء کو کیا ہو گیا ہے؟ علماء کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور وطنیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام لاوطن ہے۔[1]

راوی۔ ایک دن مرزا جلال الدین اور علامہ میں باتیں ہوئیں۔

مرزا۔ آپ فقہ میں کس سکول کو مانتے ہیں؟

علامہ میں کسی خاص سکول کا پابند تو نہیں ہوں عملاً سُنّی ہوں اور اپنے امور میں اہلِ سنت ہی کے شعار کا پابند ہوں۔

مرزا۔ پھر مسائلِ شرعی کی بحث میں اتنی آزاد خیالی سے بحث کیوں کرتے ہیں؟

---

[1] اقبال کے حضور صفحہ 317

علامہ۔ خدا کا ارشاد ہے فتفکروا و تدبروا ۔۔۔۔ ہر شخص کا فطری حق ہے۔

مرزا آپ قرآن حکیم کی تفسیر کیوں نہیں لکھتے؟

علامہ۔ لکھنا چاہتا ہوں بلکہ جو کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے اس کی نشر و اشاعت بھی بہت ضروری ہے۔ اگر حالات مساعدت کرتے تو ایک ایسے دار الاشاعت کی طرح ڈالتا جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی سعی کرتا

علوم اسلامی کے متعدد اوراق ایسے ہیں جن کی اشاعت اس زمانے کیلئے ازبس ضروری ہے۔ ایک ایسی اسلامی لائبریری کی ضرورت بھی ہے جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں مہیا ہوں۔ ایک ایسے اسلامی ادارے کے قیام کا بھی خواہش مند ہوں جس کے توسط سے علوم اسلامی کا احیاء ہو۔ اگر کہیں سے زمین اور اخراجات کا انتظام ہو سکتا تو اپنی دیرینہ آرزو کو عملی شکل دیتا۔

ﷺ

راوی۔ علامہ کی ابتدائی طالب علمی کے زمانے کا قصہ ہے ان کے ایک استاد کافی دراز قد ہے۔ لڑکوں نے مذاقاً ان کا نام ماسٹر جھنڈا رکھ چھوڑا تھا۔ اقبال بھی ذہین شرارتوں میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ طبیعت تو موزوں تھی ہی ماسٹر صاحب کی شان میں ایک ہجویہ شعر کلاس کے بلیک بورڈ پر لکھ دیا ماسٹر صاحب اندر تشریف لائے تو بورڈ پر نظر پڑی بڑے چیں بہ چیں ہوئے تفتیش ہوئی تو بات کھل گئی۔ اقبال ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔

ہیڈ ماسٹر۔ وہ شعر تم نے لکھا تھا۔

اقبال جی ہاں۔

ہیڈ ماسٹر۔ آٹھ آنے جرمانہ۔

اقبال۔ بہت بہتر جناب۔

(دوسرے روز)

اقبال۔ (ایک روپیہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی میز پر رکھتے ہوئے) جرمانہ حاضر ہے جناب۔

(واپس مڑتے ہیں)

---

[1] اقبال کے حضور صفحہ 317

شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی

راوی۔ حالی نے غالب کو حیوانِ ظریف کہا ہے اقبال بھی اس لحاظ سے کم نہیں تھے۔ دوست و احباب کی بے تکلف محفلوں میں ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی جوبن پر ہوتی تھی۔ بقولِ مرزا جلال الدین (جو برسوں ان کے ہمدم و دمساز رہے تھے) ایسے ایسے فقرے چست کرتے ایسی ایسی پھبتیاں کستے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ بدیہہ اور برجستہ گوئی میں ان کا بچپن میں بھی جواب نہیں تھا۔

راوی۔ سیالکوٹ میں علامہ کے زمانہ طالب علمی کا قصہ ہے اقبال کے استاد مولوی میر حسن کسی کام کے لئے گھر سے نکلے ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں سے تھا ان کے ساتھ تھا۔

مولوی میر حسن۔ اقبال اسے گود میں اٹھا لو۔

اقبال۔ (اٹھا کر چلتے ہوئے) کیا نام ہے تمہارا؟

بچہ۔ احسان۔

اقبال۔ احسان، بھئی واہ نام تو خوب ہے۔

(کچھ دیر کے بعد تھک کر بچے کو ایک دکان کے تختے پر

کھڑا کر کے سستانے لگتے ہیں)

مولوی میر حسن ۔ (واپس آکر) اقبال اس کی برداشت بھی دشوار ہے۔

اقبال ۔ تیرا احسان بہت بھاری ہے۔

ٔ

راوی ۔ اقبال بھاٹی دروازے میں رہتے تھے شاعری کا آغاز تھا ان سے ایک بزرگ ملنے آئے غالباً ان کی شاعری نے ملاقات کی خواہش پیدا کی ہوگی۔

اقبال ۔ (تولیہ ہاتھ میں ہے نہانے جا رہے ہیں) فرمایئے کس سے ملنا ہے؟

بزرگ ۔ شیخ محمد اقبال ایم۔ اے سے

اقبال ۔ آپ تشریف رکھیئے میں آپ کے آنے کی اطلاع شیخ محمد اقبال ایم۔ اے کو کئے دیتا ہوں۔

بزرگ ۔ شکریہ۔

(نہا دھو کر واپس آکر)

اقبال ۔ فرمایئے میں آگیا ہوں۔

بزرگ ۔ گل رنگین اور ترانۂ ہندی لکھنے والے شیخ محمد اقبال آپ ہیں؟[1]

ٔ

---

[1] روزگارِ فقیر حصہ اول ص ۵۸

راوی۔ جرنیل نادر خان سے (جو بعد کو نادر شاہ کے نام سے افغانستان کے بادشاہ بنے) اقبال کی پہلی ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر ہوئی جب وہ کابل جاتے ہوئے لاہور ٹھہرے تھے۔

نادر خان۔ (بڑی حیرانی سے) اچھا آپ اقبال ہیں؟ میں تو سمجھا کہ آپ لمبی ڈاڑھی والے بزرگ صورت ہونگے۔

اقبال۔ آپ سے زیادہ مجھے حیرانی ہے آپ تو جرنیل ہیں میں سمجھتا تھا کہ آپ دیو ہیکل ہوں گے۔ مگر آپ میں جرنیلی کی کوئی شان نہیں اس قدر دُبلے پتلے۔

﷽

راوی۔ اقبال جب یورپ گئے تو وہاں تمام مشرق خصوصاً ہندوستان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ درندوں اور خوفناک اژدہوں کا ملک ہے۔ ایک مجلس میں اقبال کی ملاقات ایک تیز طرار خاتون سے ہوئی۔

خاتون۔ کیوں مسٹر اقبال کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز ایک کوڈیالہ سانپ ہوتا تھا؟

علامہ۔ (نہایت سنجیدگی سے) نہیں محترمہ ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن۔

﷽

راوی۔ روزگارِ فقیر کے مصنف فقیر سید وحید الدین کے والد سید نجم الدین سے علامہ کے دوستانہ مراسم تھے۔ بھاٹی دروازہ میں وہ ان کے یہاں اکثر جایا بھی کرتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی بار سید وحید الدین کو علامہ سے نیاز حاصل ہوا وہ لکھتے ہیں

اس زمانہ میں اقبال خوش رو اور خوش زیب نوجوان تھے عام طور پر بڑھیا انگریزی لباس پہنتے لیکن ہمارے یہاں آتے اور طویل صحبت کا سامان ہوتا تو سوٹ اُتار کے دھوتی پہن لیا کرتے واپسی پہ دوبارہ سوٹ پہن لیتے۔ لباس سے مستقل بے اعتنائی انھوں نے چند سال بعد اختیار کی جب ۱۹۲۲ء میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اُٹھ آئے تھے اس کے بعد میں نے انھیں دھوتی اور بنیان کے علاوہ کسی اور لباس میں کم دیکھا۔

فقیر وحید الدین کم عمر تھے کم عمری کی شوخی میں دوران گفتگو کہہ بیٹھے۔

وحید الدین۔ ڈاکٹر صاحب انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں۔ آپ اپنا نام (اے۔ کے۔ بل) رکھ لیتے۔

---

(۱) ملفوظاتِ اقبال ص ۱۳۷

علامہ۔ بھئی ہم نے ایسا نہیں کیا اب تم ولایت جاؤ تو اس نسخے پر عمل کرنا اور اپنا نام (ڈبلیو۔ اے۔ ہیڈ) رکھ لینا (۱)

٭

راوی۔ فقیر سید نجم الدین اپنی ملازمت پر واپس جانے سے پہلے اپنے بیٹے فقیر سید وحید الدین سے کہہ گئے تھے کہ کتابیں پڑھو نہ پڑھو ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں اکتساب فیض کیلئے ضرور حاضری دیتے رہنا۔ وحید الدین جا نہ سکے۔ فقیر نجم الدین پھر لاہور آئے تو صاحبزادے کو پکڑ کر علامہ کی خدمت میں حاضر کیا۔

فقیر نجم الدین۔ اقبال! میں جاتے ہوئے اسے ہدایت کر گیا تھا کہ ہر روز تمہارے پاس آیا کرے لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نالائق ایک دفعہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچا۔

علامہ۔ بھئی فقیر جو کام باپ نے نہ کیا ہو وہ بیٹا کیوں کرے؟

٭

راوی۔ ایم اسلم چونکہ تمباکو نوشی سے سخت پرہیز کرتے تھے اس لئے علامہ کے حقے کے دھوئیں تک سے بچتے تھے۔ علامہ نے مزاحاً انہیں خالصہ جی کا خطاب دے رکھا تھا۔ جب کبھی ایم اسلم حاضر خدمت ہوتے تو دیکھتے ہی مسکرا کر فرماتے آئیے خالصہ جی"
ایک روز جب ایم اسلم بھی موجود تھے چودھری محمد حسین نے کہا۔

(۱) روزگار فقیر ص ۲۹

محمد حسین۔ تمباکو نوشی تو آجکل فیشن میں داخل ہے تمہیں اس سے اتنی نفرت کیوں ہے؟

ایم اسلم۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں تمباکو ہوتا تو دوسری منشیات کی طرح یہ بھی حرام ہو جاتا۔

علامہ۔ یہ تم نے کس سے سنا؟

ایم اسلم۔ میں نے دو چار علماء دین سے دریافت کیا تھا انھوں نے یہی جواب دیا تھا۔

علامہ۔ (مسکرا کر) میں اپنی علمائے دین کی اجازت سے حقہ پیتا ہوں لیکن اتنا ضرور مانتا ہوں کہ مکروہ ضرور ہے۔

ایم اسلم۔ بجا ارشاد ہوا۔

راوی۔ نوجوانی میں علامہ کی طبیعت فکر انگیز شوخی سے خالی نہیں تھی۔ پروفیسر عبدالمجید نے اپنی کتاب اقبال کے جواہر ریزے میں علامہ کے قیام لندن کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے ایک روز علامہ کے استاد پروفیسر آرنلڈ نے انہیں بلایا اور کہا

آرنلڈ۔ اقبال! آج میں تمہارے سپرد ایک اہم خدمت کر رہا ہوں اُمید ہے کہ تم اِسے دلچسپی سے انجام دو گے۔

اقبال۔ پروفیسر صاحب فرمائیے آپ کا کہنا سر آنکھوں پر۔

آرنلڈ۔ علی گڑھ سے ایک مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں سر سید کے رفیق کار رہ چکے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے ممبر ہیں اور صورت و شکل سے چھوٹے بچانے پر سر سید نظر آتے ہیں میرے ان سے علیگڑھ کی پروفیسری کے زمانے سے تعلقات ہیں مولوی صاحب لندن کی

سیر کرنا چاہتے ہیں تم مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں اور چیزیں دکھا دو۔

اقبال یہ کون سی بڑی بات ہے میں لندن کی ہر قابلِ دید چیز مولوی صاحب قبلہ کو دکھا دوں گا ۔

راوی۔ اور اقبال نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ انھوں نے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا۔ تمام قابلِ دید مقامات دکھائے۔ اور سرِ شام مولوی صاحب کو لے کر لندن کے ایک مشہور پب (قہوہ خانے یا شراب خانے) میں جا پہنچے وہاں چا، اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ میزبان لڑکیاں بھی موجود تھیں اور خدا جانے اقبال کے اشارے پر یا خود اپنی جولانیِ طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہو گئیں کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پیش کرتی، کوئی ان کی نورانی داڑھی پر والہ و شیدا تھی ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت کی ایک دو مہریں بھی ثبت کر دیں۔ اس مصیبت سے جب نجات ملی تو وہ غصے سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچے اور اقبال کی شکایت کی۔ دوسرے روز اقبال اپنی کارکردگی کی داد لینے جب آرنلڈ کے ہاں گئے تو وہ برہم تھے ۔

آرنلڈ ۔ اقبال تم لندن میں آکر کچھ زیادہ شوخ ہو گئے ہو۔ مولوی صاحب ایسے ثقہ بزرگ کو اس طرح کے قہوہ خانے میں لے جاتے تمہیں کچھ حجاب نہ آیا ؟ وہ بے حد ناراض ہیں۔

اقبال ۔ قبلہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھا دوں اگر میں مولوی صاحب کو صرف

لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات، تاریخی عمارتیں وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے اور ہندوستان جاتے ہوئے لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے۔ لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رخ خواہ بُرا ہو یا بھلا بہت اہم ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں۔ میں انھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا۔

⁂

۶ راوی۔ اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے ان کے فلسفۂ زندگی کا ایک اہم تصور تھا جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پرانے زمانے سے فلاسفہ اور مذاہب میں رائج ہو چکی ہے علامہ کے خیال میں اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مذاہب میں جسم اور اس کی خواہشات کو بُرا کہا گیا ہے لیکن اسلام میں نہ جسم کو بُرا کہا گیا ہے اور نہ جسمانی لذت کو کوسا گیا ہے۔ صرف اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذت حاصل کرے اس سے مواخذہ نہیں اور نہ وہ گنہگار ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کیلئے قربان نہ کرے۔ دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذتِ جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں کہ خود جسم کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح

سے جسم کو ایذا دی جائے اور جسمانی لذت کے حصول کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے۔ اِدھر جسم میں خودی ہے جس قدر اس کو ٹھکراؤ بگڑتا ہے دباؤ تو اُبھرتا ہے لذات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا ہے۔ علامہ نے اس نظریے کو بار بار اپنے کلام میں پیش کیا ہے ان کی محفلوں میں اکثر یہ مسئلہ زیر بحث آتا رہتا تھا۔ علامہ کے میکلوڈ روڈ کے قیام (غالباً ۲۷۔ ۱۹۲۶ء) کا قصہ ہے کہ لاہور کے چند مقتدر پڑھے لکھے ہندو علامہ سے ملنے آئے۔

علامہ۔ آپ لوگوں نے کیسے زحمت کی؟

ملاقاتی ۲۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سوامی جی آپ کے گہرے دوست تھے۔

" ۳۔ آپ کو ایک عرصے سے جانتے تھے۔

علامہ۔ آپ کا فرمانا بجا ہے لاہور میں طالب علمی ہی کے زمانے سے میری ان کی دوستی ہوگئی تھی۔ میں نے ان سے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی اور خود انھیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا بلکہ مثنوی اُنھیں پڑھائی بھی تھی۔

ملاقاتی ۱۔ پھر تو آپ انھیں خوب جانتے ہوں گے۔

علامہ۔ ہاں جانتا بھی ہوں اور ان کے خلوص نیت اور روحانی سرشاری کا بڑا معترف ہوں۔

ملاقاتی ۲۔ اسی لئے تو ہم حاضر ہوئے ہیں ہم نے رشی سوامی جی کی ایک سیرت لکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس سیرت پر نظر ثانی کریں اور ہمیں مزید مواد دیں بلکہ خود لکھیں بھی۔

علامہ۔ جو سیرت آپ نے لکھی ہے ذرا وہ دکھایئے

ملاقاتی ۲۔ یہ لیجئے۔

علامہ۔ میں اس کو ایک نظر دیکھ لوں کہ آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

(جستہ جستہ دیکھ کر)

آپ لوگوں نے اپنی عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے ان کو فرشتہ سیرت ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرّا ثابت کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے اور بڑے پائے کے آدمی تھے میں ان کے خلوص اور روحانی کمالات کا قائل بھی ہوں۔ لیکن آپ نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ملاقاتی کیا مطلب؟

علامہ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اس درس عبرت کا جو ان کی زندگی سے حاصل ہو سکتا ہے اس کتاب میں کوئی ذکر ہے۔

ملاقاتی ۲۔ وہ کیا؟

علامہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ سوامی جی کی تعلیمات کا محور ہمہ اوست کا نظریہ اور برہمچاریہ (جسمانی خواہشات سے مکمل پرہیز) کی تلقین کرنا تھا اسی مشن کی تبلیغ کیلئے وہ امریکہ تشریف لے گئے تھے وہاں بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے ان کے حلقہ اثر میں آ گئے ان میں ایک مرید کی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ چھوڑ آئے۔

یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے۔ جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ خود برہمچاریہ (تجرد کی

زندگی) کو نباہ نہ سکے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس غلط تعلیم اور غلط اصول کو چھوڑتے انھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا اور اس وجہ سے انھوں نے بچہ اور اس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا۔

آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کا زندگی کے اس اہم واقعہ کو کھول کر بیان کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کیلئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی کس حد تک کامیاب رہے۔

ملاقاتی۔ ہم سمجھتے تھے کہ آپ ان کی کچھ قدر کرتے ہوں گے۔

علامہ۔ قدر تو میں کرتا ہوں آپ لوگ میرا مطلب نہیں سمجھے میں ان کی بہت سی خوبیوں کا معترف ہوں۔ سوامی جی کے برہمچار میں ناکامی ان کی حیات کا اہم ترین سبق ہے۔ ذرا سوچیے جو بات سوامی جی ایسے پائے کے آدمی سے نہ نبھ سکی وہ ہے ہی غلط۔

راوی۔ سوامی جی کی سیرت پر علامہ کے تبصرے سے اس امر کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ سیرت نگاری کے سلسلے میں علامہ کا نظریہ کیا تھا؟ (۱)

راوی۔ ۔اٹلی کے امیر کبیر خاندان کی ایک نہایت شائستہ اعلیٰ تعلیمیافتہ خاتون علامہ کی بڑی مداح تھی اور مسولینی سے علامہ کی ملاقات کا اہتمام کرایا تھا۔

اٹلی میں علامہ کے چند روزہ قیام کے دوران اس خاتون

(۱) اقبال کے چند جواہر ریزے ص ۲۲۔

نے پوچھا

خاتون۔ اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہو تو فرمایئے تاکہ اس انتظام کیا جائے۔

علامہ۔ اطالیہ کا حسن مشہور ہے میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

راوی۔ چنانچہ موسوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں جن سے علامہ نے ملاقات کی۔ علامہ فرمایا کرتے تھے کہ اطالیہ کا حسن یورپ میں لاجواب ہے (۲)

راوی۔ علامہ کے ہمزلف خواجہ فیروز الدین بیرسٹر سے بازار حکیماں کے دنوں کی روایت ہے کہ سر فضل حسین اور اقبال تاش کھیل رہے تھے۔ ترپ کی بازی لگی ہوئی تھی یکایک سر فضل حسین بولے۔

سر فضل حسین۔ میرا رنگ اینٹ ہے۔

علامہ۔ (بے تکلفی سے) بھائی اس رنگ کے ساتھ تو تمہارا بیر تھا تم نے اینٹ کیوں بولی۔

راوی۔ پنجابی کی مثل ہے "اینٹ اور کتے کا بیر" یہ اسی طرف اشارہ تھا۔

راوی۔ چوہدری سر شہاب الدین سے علامہ کے بے تکلفی کے مراسم تھے۔ چونکہ چوہدری صاحب نہ صرف لحیم شحیم تھے بلکہ حد درجہ سیاہ فام بھی۔ علامہ اکثر ان پر فقرے چست کرتے رہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انہیں دیکھتے ہی علامہ پر لطیفوں کی آمد

(۲) ایضاً صفحہ ۳۰۳۔

شروع ہوجاتی۔

مرزا جلال الدین شاہد ہیں کہ شاہدہ میں ایک مرتبہ ایک پارٹی ہوئی بہار کا موسم تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور چودھری سر شہاب الدین بھی اس میں شامل تھے۔

چودھری صاحب نے بالکل سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

ڈاکٹر صاحب۔ بھئی دیکھو دیکھو "کپاہ وچہ کٹا وڑھ گیا اے"

راوی۔ ایک دفعہ چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار پارٹی تھی۔

چودھری صاحب ذرا پانی لانا۔

علامہ۔ بھئی بالٹی لانا چودھری صاحب پانی مانگتے ہیں۔

راوی۔ چودھری صاحب نے جب اپنی کوٹھی بنوائی تو مرزا جلال الدین اور ڈاکٹر اقبال کو بلایا۔

چودھری صاحب۔ بھئی اس کا نام کیا رکھا جائے؟

ڈاکٹر اقبال۔ اس کے متعلق کاوش کی کیا ضرورت ہے، اس کا نام دیو محل رکھیئے۔

چودھری صاحب بھئی ڈاکٹر تم ہر وقت مذاق کرتے رہتے ہو۔

اقبال۔ چودھری! تمہیں دیکھ کر لطیفوں کی آمد شروع ہوجاتی ہے خدا کیلئے مجھے لطیفوں سے نہ روکا کرو۔

راوی۔ ایک دفعہ نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہاں مہترِ چترال کی دعوت تھی تعارف کرانے کے فرائض ڈاکٹر اقبال کو سونپے گئے جب سیاہ فام اور دیو قامت چودھری شہاب الدین جو اس زمانے میں لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر تھے کی باری آئی تو۔

اقبال۔ جناب! اور یہ مہترِ لاہور ہیں۔

(قہقہہ)

چودھری شہاب الدین } (بعد کو تخلیہ میں) دیکھو اقبال۔ تم موقعہ محل بھی نہیں دیکھتے اور میری بے عزتی کر دیتے ہو۔

اقبال۔ بھئی اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے وہ مہترِ چترال ہیں تم مہترِ لاہور۔ مہتر تو ہر بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔[۱]

٭

راوی۔ ایک روز ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی صبح صبح پہنچے تو فرمایا آؤ آج چودھری شہاب الدین کے ہاں چلیں۔ موٹر میں چودھری صاحب کے یہاں پہنچے وہ غسل کر کے دھوپ میں بیٹھے تھے

چودھری۔ دیکھو، ایسی ویسی بات مت کرنا۔

علامہ۔ ہماری کیا مجال ہے؟

(ساتھ ہی ان کے ننگے بازو پر چٹکی لے کر) آپ نے یہ صوف کیا بھاؤ لیا ہے۔[۲]

۱۔ روایاتِ اقبال ۹۷۔ ۲۔ روایاتِ اقبال ۱۳۵-۱۳۶

راوی۔ ایک روز بیماری کا کچھ افاقہ تھا مگر ہائے ہائے برابر کر رہے تھے۔

منشی طاہرالدین۔ خیر تو ہے؟

علامہ۔ میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

چ

راوی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اکثر علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے علامہ لانے لے جانے کے چھوٹے موٹے بہت سے کام ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے گرمی کے دن تھے وہ آئے تو ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ علامہ نے استفسارات کی بوچھاڑ کر دی۔

علامہ۔ ماسٹر، شامی کی کتاب الموافقعات لے آئے۔ سید طلحہ سے ملے؟ مولانا روحی کو دعوت دی؟ سالکؔ سے بات ہوئی؟ زمیندار کے دفتر گئے تھے۔؟

چغتائی۔ جی، کچھ نہیں کر سکا۔

علامہ۔ کیوں؟ کیا وقت نہیں ملا؟

چغتائی۔ جی وقت ملتا ہے مگر فرصت نہیں ملتی۔

علامہ۔ (قہقہہ لگا کر) علی بخش فوراً مہرؔ اور سالکؔ کو بلا کر لاؤ ماسٹر نے فلسفے کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے وقت ملتا ہے مگر فرصت نہیں ملتی واہ واہ ساتھ ہی کسی طرح

چودھری محمد حسین کو بھی اطلاع دیدو۔

راوی۔ بعد میں علامہ یہ واقعہ بار بار دہراتے رہے[۱]۔

☸

راوی۔ جب علامہ پنجاب کونسل کے الیکشن میں کامیاب ہو گئے تو حاجی دین محمد کاتب نے ضیافت کی۔ ان کی دعوتِ پلاؤ بہت مشہور تھی۔ عبداللہ چغتائی بھی علامہ کے ساتھ تھے باہر نکلے تو کوئی شناسا ملے۔

شناسا۔ کہاں جا رہے ہیں؟

علامہ۔ مت پوچھو آج پلاؤ کی شہادت کا دن ہے[۲]۔

☸

راوی۔ جن دنوں علامہ زمان و مکان پر تحقیق کر رہے تھے لاہور کے چند علماء سے ملتے رہتے۔ اس سلسلہ میں مولانا روحی کو دعوت دی۔ جب وہ آئے علامہ حقہ گڑگڑا رہے تھے چونکہ مولانا بھی حقے کے عادی تھے انھوں نے بیٹھتے ہی بے تکلفی سے حقہ کو اپنی طرف کر کے زور کا کش لگایا۔ مگر اس میں کچھ بھی نہ تھا انھیں بڑا بُرا لگا۔

مولانا روحی۔ یہ کیا مذاق ہے آپ حقہ اس طرح پیتے ہیں؟

علامہ۔ حضرت، میں اسے پی نہیں رہا تھا بلکہ محض

۱؎ روایاتِ اقبال ۳۰۔ ۲؎ اقبال کی صحبت میں ۷۰۴

اِس سے باتیں کر رہا تھا۔[1]

٭

راوی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے عقب میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کا غلغلہ تھا۔ ووٹروں کو پھانسنے کے ہزار کھیل کھیلے جا رہے تھے ایسے میں کسی منچلے نے ایک مصرعے کا شوشہ چھوڑ دیا۔

ع ووٹ حاضر ہے اگر چاء کی پیالی مل جائے

جو آناً فاناً زبانِ زدِ خاص و عام ہو گیا کسی نے علامہ کے سامنے بھی ازرہِ تفنّن دھرا دیا۔

علامہ نے چھوٹتے ہی کہا

۔۔۔ چلبلی شوخ نرالی مل جائے ــــــ!

نوجوان مرتے ہیں جس پر وہی بالی مل جائے

راوی۔ یہ وہ زمانہ جب رئیسوں خصوصاً نوجوانوں میں شہر کی مشہور مغنیّہ "بالی" کی بڑی دھوم تھی۔[2]

٭

راوی۔ ایک زمانہ تھا کہ امراء اپنے بچوں کو ولایت میں تعلیم دلاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ علی بہادر حبیب اللہ بھی رئیس ابنِ رئیس تھے ایک عرصہ تک لندن میں زیرِ تعلیم رہے

---

(۱) اقبال کی صحبت میں ص ۵۴ ۔ (۲) ایضاً ص ۴۷۔

اور وہاں سے آتے ہی سیاست میں حصہ لینے لگے وہ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے لاہور آئے اور علامہ سے بطورِ خاص ملاقات کی۔ علامہ ان کے والد کو جانتے تھے

علامہ۔ کیوں بھئی ولایت ہو آئے ؟

علی بہادر۔ (فخریہ انداز میں) جی ہاں میں تو آٹھ سال کی عمر میں انگلینڈ چلا گیا تھا۔ پندرہ سال بعد واپس آیا۔

علامہ۔ پھر تو آپ کو یوں کہنا چاہیئے

ع۔ "میموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔"

٭

راوی۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ بھی کیا جا رہا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور متضاد فتوؤں اور قراردادوں کی زد میں تھا۔ علامہ ان دنوں انجمن حمایت اسلام کے جنرل سیکرٹری تھے۔ خواجہ عبد الحمید اور اسلامیہ کالج کے چند دوسرے اساتذہ نے فیصلہ کیا کہ علامہ سے استصواب رائے کیا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ علامہ کی خدمت میں پہنچے۔

خواجہ عبد الحمید۔ ڈاکٹر صاحب۔ تحریکِ عدمِ تعاون کی یلغار کالج پر بھی ہے متضاد فتوے نکل رہے ہیں مسلم زعماء دو دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں آپ کی اس ضمن میں کیا رائے ہے؟

علامہ۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کی ضرورت اور اہمیت کے

متعلق میں نے ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی۔

ایک استاد۔ آج کل گاندھی جی ملکی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں تحریک عدم تعاون کے سب سے بڑے نیتا (لیڈر) وہی بنے ہوئے ہیں۔

علامہ۔ گاندھی جی کی ایک لحاظ سے میں تعریف کروں گا یہ شخص ہندو قوم کیلئے بہت کچھ کر رہا ہے اور اپنی قوم کی نفسیات بھی خوب سمجھتا ہے مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر ہندوؤں کی آئندہ نسلیں اُسے اوتار تسلیم کرلیں۔

خواجہ عبدالحمید۔ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

علامہ۔ (حقہ کا کش لیکر) جس قدر کام کالج میں ہو سکتا ہے۔ کرتے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ کالج ٹوٹ جائے اور آپ لوگوں کو تلاش روزگار کی زحمت اُٹھانا پڑے بلکہ میرا مشورہ یہ ہے۔ (ظریفانہ لہجے میں) کہ ایک وقت کا کھانا چھوڑ دو میں نے بھی یہ کام شروع کر دیا ہے اور میری صحت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا ہے[1]

حاضرین۔ (قہقہہ)

ڽ

راوی۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان ۱۹۲۱ء میں ملاقات کے لئے گئے مولوی محمد عبداللہ قصوری کے ساتھ علامہ پر استغراق کا عالم تھا۔

علامہ۔ ایک انجمن بنانے کی فکر میں ہوں۔

---

[1] اقبال کی صحبت میں ص ۱۱۱

مولوی صاحب۔ پھر دیر کیا ہے آپ کیلئے انجمن بنانا کیا مشکل ہو گا؟

علامہ۔ مشکل تو ہے انجمن کیلئے موزوں ارکان نہیں ملتے بعد تلاشِ بسیار صرف ایک رکن مل سکا ہے۔

مولوی صاحب۔ وہ کون ہے؟

علامہ۔ وہ خود میں ہوں۔ [1]

٭

راوی۔ لارڈ کچنر جو ایک زمانے میں ہند کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا بڑے مشہور برطانوی جرنیلوں میں سے تھا مہدی سوڈانی کے خلاف معرکے میں اس کا خاص حصہ تھا پہلی جنگِ عظیم کے زمانہ میں وہ غرقاب ہوا۔

علامہ فقیر سید نجم الدین سے باتیں کر رہے تھے کہ

یکے از حاضرین سنا ہے کچنر زندہ ہو گیا ہے

علامہ۔ ہاں ممکن ہے کا ڈلیور آئیل کی صورت میں آ گیا ہو۔[2]

٭

راوی۔ اخبارِ وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان، علامہ کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں انار کلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں میونسپلٹی نے ان کیلئے دوسری جگہ تجویز کی چنانچہ انھیں وہاں سے اٹھوا دیا گیا اس زمانے میں

---

[1] اوراقِ گم گشتہ۔ [2] روزگارِ فقیر ۱،

مولوی انشا اللہ خان کئی مرتبہ علامہ سے ملنے گئے لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہ باہر گئے ہوئے ہیں اتفاق سے ایک دن جو گئے تو علامہ گھر پر موجود تھے۔

مولوی انشا اللہ۔ ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں آپ کا دل یہاں نہیں لگتا۔

علامہ۔ مولوی صاحب! آخر وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہیں۔

ڞ

راوی۔ میکلوڈ روڈ کی کوٹھی کے قیام کا واقعہ ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک طالب علم سید الطاف حسین اپنے ایک دوست کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ان کی یہ باتیں ہوئیں

علامہ۔ کون سی کلاس میں ہو؟

الطاف۔ تھرڈ ائر میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے۔

علامہ۔ کون سے مضامین لوگے۔؟

الطاف۔ عربی اور اے کورس۔

علامہ۔ اے کورس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

بی اے وغیرہ میں ریاضی تو چند مخصوص قسم کے سوالات تک محدود ہے جن سے اس کے چند موٹے موٹے اصول طلباء کو ذہن نشین کرانا مقصود ہوتا ہے البتہ ریاضی اعلیٰ کے لئے تخیل کی ضرورت ہے۔

الطاف ۔ خاموش ۔

علامہ ۔ تعلیم سے کچھ مقصد پیشِ نظر ہے ۔ ؟

الطاف ۔ فی الحال کچھ نہیں ۔

(کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد)

علامہ ۔ مجھے اپنے ایک کلاس فیلو کا قصہ یاد آگیا وہ ہر سال امتحان میں فیل ہوا کرتا تھا جس طرح ایک ملاح ہر مرتبہ مسافروں کو دریا پار کرانے کے بعد واپس کنارے پر آجاتا ہے اُس کا بھی یہی حال تھا چنانچہ ہم اِسے ملاح کے نام سے پکارا کرتے تھے اور اکثر بطور تمسخر اس سے کہا کرتے تھے کہ بھئی تم نے تو یونیورسٹی کا سالانہ وظیفہ مقرر کر رکھا ہے ۔

⁂

راوی ۔ علامہ کی انارکلی کی رہائش کے زمانے کا واقعہ ہے کہ سرحد کے ایک پیر صاحب چند مریدوں کے معیت میں علامہ سے ملنے آئے ۔

پیر صاحب ۔ اسلام علیکم علامہ صاحب

علامہ ۔ وعلیکم اسلام تشریف رکھیئے آپ لوگ (مریدوں سے) آرام سے بیٹھیئے ۔

پیر صاحب ۔ کیسے مزاج ہیں آپ ؟

علامہ ۔ الحمد للہ ، کیسے زحمت کی آپ نے

پیر صاحب وہاں سرحد میں ہمارے مریدوں کا سال کے سال

اجتماع ہوا کرتا ہے ایک تو جگہ تنگ ہے اور دوسرے اشیائے خوردنی کم ملتی ہیں۔ آپ گورنر بہادر کی طرف ایک درخواست لکھ دیں کہ ہمیں اس مقام پر چند مربع اراضی مرحمت فرمائیں کہ کاشت سے آمدنی کی صورت بھی ہو جائے۔

علامہ۔ پیر صاحب! آپ سیّد ہیں سیّد کونین کی اولاد سے ہیں جس نے غیر کے سامنے کبھی دستِ سوال دراز نہ کیا آپ زمین انگریز سے مانگتے ہیں جس کا اس پر کوئی حق نہیں آپ اس سے کیوں نہیں مانگتے جو ارض و سما کا مالک ہے۔

پیر صاحب۔ اگر آپ کو سفارش نہیں کرنا تو نہ کیجئے لیکن اس طرح کی باتیں نہ کیجئے۔

(برہم ہو کر اٹھ کر چلے جاتے ہیں)

علامہ۔ آپ کی مرضی۔

(دوسرے روز پیر صاحب تنہا آتے ہیں)

پیر صاحب۔ (آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے مریدوں کی موجودگی میں آپ کے الفاظ مجھے گراں گزرے لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے سچ فرمایا تھا میں اب ایسی دریوزہ گری نہ کروں گا)

ؔ

راوی ان کے چلے جانے کے کوئی ہفتہ عشرہ بعد علامہ کو تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ زمین مل گئی ہے اس کی تفصیل یوں ہوئی کہ پیر صاحب دہلی گئے تو ان کے بے شمار فوجی مریدوں نے ان کا

تعارف کمانڈر انچیف سے کرایا۔ سپاہیوں کو خوش کرنے کیلئے اس نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پیر صاحب کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہو۔ مریدوں نے زمین کی احتیاج ظاہر کی تو کمانڈر انچیف نے اسی وقت سر مائیکل اور ڈائریکٹر گورنر پنجاب کو خط لکھا اور زمین دلوا دی۔

یہ واقعہ خود علامہ نے عبدالرشید طارق کو سنایا جب وہ ۱۹۳۵ء میں جاوید اقبال کو پڑھانے جاوید منزل جاتے تھے۔[۱]

٭

راوی۔ کشمیری خاندان کا ایک فرد کسی دوسرے خاندان میں شادی کرنا چاہتا تھا علامہ سے مشورے کیلئے آیا کچھ طالب علم بھی بیٹھے تھے۔

علامہ۔ بھئی میری مانو تو یہ خیال ترک کر دو۔

طالب علم۔ لیکن آپ تو ہمیشہ ذات پات کو مٹانے کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

علامہ۔ ٹھیک ہے اگر یہ صاحب وہاں شادی کریں گے تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہو گی۔

میری خواہش ہے کہ مسلمانوں کے بچے سرخ و سپید ہوں تاکہ ہم مسلمان صحیح معنوں میں ملتِ بیضا بن جائیں۔

٭

۱۔ ملفوظاتِ اقبال ص ۳۱۵

راوی۔ شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو جب کبھی لاہور آتی تھیں تو عام طور پر پروفیسر مرزا سعید کے ہاں قیام کرتی تھی ایک دن علامہ سے ان کی ملاقات ہوئی تو پوچھنے لگیں۔

مسز سروجنی۔ میری غزلیات کیسی ہیں ؟

علامہ۔ (شوخی سے)، تمہاری چشم غزال تمہاری غزلیات سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

٭

راوی۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا علامہ اور مسز سروجنی نائیڈو بھی شریک ہوئے۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں گاندھی جی نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی مسز سروجنی نائیڈو نے کوشش کر کے علامہ کو گاندھی جی سے ملنے پر آمادہ کر لیا۔ ملاقات ہوئی۔ سروجنی کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے اپنی شخصیت سے علامہ کو متاثر کر لیا ہوگا اور ان کے متعلق علامہ کے خیالات میں تبدیلی آگئی ہوگی۔ جوں ہی علامہ نے گاندھی جی کے کمرہ سے باہر قدم رکھا سروجنی لپک کر ان کے پاس پہنچیں۔

سروجنی۔ کیوں ڈاکٹر صاحب، مہاتما جی کو آپ نے کیسا پایا؟

علامہ۔ (مزاحیہ سنجیدگی سے)، گاندھی جی اچھے آدمی ہیں کھانے پینے میں احتیاط کرتے ہیں۔ اور تندرست رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنی عمر کے اعتبار سے توانا ہیں۔

سروجنی۔ (زچ ہو کر) میں تو ایک بڑے آدمی کے متعلق ایک بڑے

آدمی کی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی۔

علامہ۔ گاندھی کے متعلق میری رائے یہی ہے جو میں نے آپ کو بتا دی ہے اور یہ میری آخری رائے ہے اس سے زیادہ اور کیا کہوں ؟

راوی۔ یہ جواب اور بھی مایوس کن تھا۔ سروجنی نائیڈو خاموش ہو گئیں اور بات ختم ہو گئی۔ ۱؎

ؔ

راوی۔ ایک روز ڈاکٹر سید محمد حسین حسب معمول دس بجے کے قریب تانگے پر آئے۔ پہلے وہ اندر چلے گئے اور پھر باہر آ کر علامہ کی خیریت دریافت کی اور جاتے جاتے انھوں نے علامہ سے کہا ذرا گوشت سے پرہیز کیجئے ابھی وہ تانگے پر بیٹھے ہی تھے کہ علامہ نے علی بخش کو آواز دی۔

علامہ۔ علی بخش، علی بخش۔

علی بخش۔ آیا جی۔

علامہ۔ جاؤ اور عمدہ سا گوشت لے آؤ آج کباب بنائیں گے۔

علی بخش۔ جناب، ابھی تو شاہ صاحب نے گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔

علامہ۔ ڈاکٹر لوگ تو اس طرح کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ فوراً گوشت لے آؤ۔

۱؎ اقبال کی صحبت میں ۲۹۳

(ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی طرف توجہ کر کے) ، تم بھی کباب کھا کے جانا ۔ ؎۱

٭

راوی ۔ جب علاج کیلئے علامہ نے حکیم نابینا صاحب (حکیم عبدالرزاق انصاری دہلوی) سے رجوع کیا تو گفتگو یہاں سے شروع ہوئی ۔

علامہ ۔ حکیم صاحب قبلہ ، پہلے میں ایک بات عرض کر دوں ۔

حکیم نابینا ۔ فرمائیے ۔

علامہ ۔ کھٹائی اور مرچ سے پرہیز میرے لئے ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ چیزیں میری کمزوری ہیں ۔ ؎۲

٭

راوی ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۲۷ء کی دوپہر کو لاہور کے خواجہ سلیم نے اپنے نادر مخطوطات دکھانے کیلئے علامہ سید سلیمان ندوی کی دعوت کی تھی جس میں علامہ کے علاوہ بہت سے ذی علم اور ارباب علم بھی مدعو تھے ۔

کھانے کے بعد زمیندار اخبار کیلئے لطائف کے کالم کیلئے موزوں عنوان کی بحث جاری تھی ۔ سید سلیمان ندوی نے ذکاہات تجویز کیا اس کے بعد ضعیف راویوں پر گفتگو ہو رہی تھی ۔

؎۱ اقبال کی صحبت میں ۲۹۰ ؎۲ یادِ اقبال ۔

سیّد عبداللہ۔ یہ معاملہ بھی خاصا اہم ہے۔

محمود شیروانی۔ ضعیف راویوں کا موضوع بہت تحقیق چاہتا ہے۔

علامہ۔ ہمارا راوی (دریائے راوی) بھی ضعیف ہو گیا ہے۔

(قہقہہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ۔ لطیفہ و لطائف کے سلسلہ میں ملا علی بن حسین کاشفی کی کتاب لطائف الطوائف بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

علامہ۔ ملا کاشفی کو کیا خبر کہ "الطوائف" کیا شے ہے؟

حاضرین۔ (قہقہے) [۱]

ڽ

راوی۔ حکیم یوسف حسن، اقبال کے پرانے عقیدت مند تھے۔ کبھی ان کا رسالہ نیرنگِ خیال چوٹی کے رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے ہی سب سے پہلے نیرنگ خیال کا اقبال نمبر نکالا۔

۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ حکیم صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حکیم یوسف۔ السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ آؤ جی حکیم جی تشریف رکھو۔

حکیم یوسف۔ نیرنگ خیال کیلئے کوئی نظم مرحمت ہو۔

علامہ۔ کوئی نئی چیز نہیں ہے نہرو رپورٹ ذہن میں گردش

[۱] اقبال کی صحبت میں ۴۹۶

کر رہی ہے۔

حکیم یوسف۔ جب میں پچھلی مرتبہ حاضر ہوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک نیا شعر سنایا تھا۔

یہ پنڈت، یہ بنیئے یہ ملا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہضم تر نوالے

اس شعر کے بعد کچھ اور شعر ہوئے ہوں گے۔؟

علامہ۔ کوئی اور شعر نہیں ہوا وہی ایک ہے۔۔۔۔ (کچھ دیر محورہ کر) اچھا لکھو۔

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے
یہ تکیئے یہ مندر یہ گرجے شوالے!
یہ پنڈت یہ بنیئے یہ ملا، یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہضم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی
وطن کیا ہے اِک نوع سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھاری
یہ دیکھو چلی آ رہی ہے سواری
نئے جال لائے پرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

حکیم یوسف۔ بہت خوب۔

علامہ۔ اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجئے مگر مجھے اس کی ایک کاپی بھجوا دیجئے گا

حکیم یوسف۔ بہت بہتر

میرے اختیار میں ہو گا ضرور کروں گا۔

علامہ۔ اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا ہم لوگ تو مسلمان ہیں آپ کے اس وعدے ہی سے خوش ہو گئے ہیں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں (۱)

راوی۔ علامہ کو جاوید منزل میں آئے ہوئے کچھ دن ہوئے تھے کہ ایک پیر صاحب ان سے ملنے آئے۔ ابھی علیک سلیک ہی ہوئی تھی اور دو چار رسمی باتیں ہوئی تھیں کہ ہانپتا کانپتا پسینے میں شرابور ایک شخص آیا اور پیر صاحب کے قدموں پر گر پڑا یہ ان کا مرید تھا۔

مرید۔ حضور کی آمد کی اطلاع ملی تھی صبح ہی صبح مغلپورہ سے چل پڑا کئی مقامات پہ گیا آپ وہاں سے تشریف لے گئے تھے آخر معلوم ہوا یہاں ہیں خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے۔ حضور میری حالت بڑی خراب ہے دو سو روپے کا قرض دار ہوں ملازمت ملتی نہیں، آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میری مشکلات کا خاتمہ ہو۔ (جیب سے دو روپے نکال کر پیر کی نذر گزارتے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے) للّٰہ کچھ کیجئے۔

پیر۔ (روپے جیب میں ڈالتے ہوئے) (دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب دعا کیجئے۔

علامہ۔ آپ پہلے دعا مانگ لیجئے میں بعد میں مانگوں گا۔

---

(۱) اقبال کے جواہر ریزے ۲۹۔

پیر۔ (آنکھیں میچ کے دعا کرتے ہیں ہاتھ منہ اور داڑھی پر پھیر کے مرید پر پھونک مار کر) جا اللہ فضل کرے گا۔

مرید۔ مہربانی پیر صاحب، مہربانی (پھولا نہیں سماتا)

علامہ۔ پیر صاحب اب میری باری ہے مجھے دعا کر لینے دیجئے۔ (ہاتھ اٹھا کر اور بلند آواز سے) آج کل کے پیر بھٹک گئے ہیں یا اللہ تو انھیں راہِ ہدایت دکھا۔

پیر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

علامہ۔ دیکھئے میں آپ کی دعا میں بالکل مخل نہیں ہوا۔ مجھے بھی اطمینان سے دعا مانگ لینے دیجئے۔ (دوبارہ ہاتھ اٹھا کر) اے خدا آجکل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ وہ اپنے پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔

پیر صاحب۔ یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟

علامہ۔ یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا قرض دار ہو گیا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ اب دو سو دو روپے کا قرض دار ہو گیا ہے۔

پیر صاحب۔ یہ بڑی زیادتی ہے آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔

علامہ۔ اچھا اب میں دعا ختم کرتا ہوں لیکن ایک شرط پر آپ یہ دو روپے مرید کو واپس کر دیجئے۔ اِسے قرض سے سبکدوش کرنے کا بندوبست کیجیئے اور اسے نوکری دلائیے۔

پیر صاحب۔ اچھا بابا، مانا (با دلِ نخواستہ دو روپے واپس دیتے ہیں) دعا ختم کرو۔

علامہ۔ اور باقی کام؟

پیر صاحب اس کی بھی کوشش کروں گا۔ خدا کیلئے میری جان چھوڑ دیجئے۔

راوی۔ خود علامہ نے یہ واقعہ عبدالرشید طارق سے بیان کیا [۱]

ؐ

راوی۔ مدراس کے لیکچرز کیلئے علامہ ۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی سے مدراس فرنٹیئر میل سے روانہ ہوئے۔ عبداللہ چغتائی شریکِ سفر تھے ٹکٹوں کی جانچ پڑتال کراتے ہوئے ان کا قلم دہلی ریلوے اسٹیشن کے ایک کلرک کے پاس رہ گیا۔ کچھ دیر بعد خیال آیا۔ تو بولے۔

عبداللہ چغتائی۔ غضب ہو گیا ڈاکٹر صاحب قلم تو کلرک ہی کے پاس رہ گیا۔

علامہ۔ ماسٹر تمہاری تو گویا بیوی دہلی میں رہ گئی ہے۔

(زور دار قہقہہ)

راوی۔ عبداللہ چغتائی کہتے ہیں اسی طرح تمام سفر لطائف و ظرافت چلتے رہے [۲]

ؐ

راوی۔ علامہ گول میز کانفرنسوں کے سلسلہ میں اپنے تجربات

---

(۱) ملفوظاتِ اقبال ۳۱۷ - (۲) اقبال کی صحبت میں ۴۴ -

بیان کر رہے تھے۔ نذیر نیازی نے پوچھا۔

نیازی۔ ڈاکٹر صاحب وہ ذالک الکتاب کا کیا قصہ ہے۔

علامہ۔ لندن سے واپسی پر ہمارا جہاز عدن پہنچا تو مولوی شفیع داؤدی عرشۂ جہاز پر کھڑے گرد و پیش کے مناظر کا لطف اُٹھا رہے تھے اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو اتفاقاً سمندر میں گر گئی۔

مولوی صاحب پریشان ہو گئے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں کہ دفعتاً ان کی نگاہ ان صومالی لڑکوں پر پڑی جو چھوٹی چھوٹی کشتیاں لئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے تاکہ مسافر چاہیں تو اُنھیں اپنی غوطہ خوری کے کرتب دکھائیں مولوی صاحب نے جو اُنھیں دیکھا تو سمجھے کہ مشکل حل ہو گئی چلائے اور کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکوں سے کہنے لگے یاشیخ یاشیخ ذالک الکتاب، ذالک الکتاب، بیچارے عربی تو جانتے نہیں تھے یاشیخ اور ذالک الکتاب سے کام نکل گیا لڑکے ان کے اشارے سمجھ گئے کہ مطلب اس کتاب سے جو سطح سمندر پر تیر رہی ہے اور قریب تھا کہ موجوں میں غائب ہو جائے اس پر ایک نے کشتی سے پانی میں چھلانگ لگا دی اور کتاب لے کر عرشہ جہاز پر چڑھ آیا۔ مولوی نے اطمینان کا سانس لیا۔

(حقے کے کش لیکر)

زبان بھی اتحاد کا کتنا بڑا ذریعہ ہے افسوس ہے کہ

یوروپ کے غلبے نے اس رشتے کا بھی خاتمہ کردیا کتنے مسلمان ہیں جو عربی جانتے ہیں اور اپنا مافی الضمیر اس میں ادا کرسکتے ہیں۔ حالانکہ عربی ہماری بین الاقوامی زبان ہے ہمارے دینی ثقافتی اور ادبی رابطے کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔

٭

راوی۔ سید واجد علی گول میز کانفرنس میں بھی علامہ کے ساتھ تھے اکثر علامہ کے ہاں ملاقات کو جاتے تھے ان کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا ایک بار وہ اور فقیر وحید الدین علامہ سے ملنے گئے تو کتے موٹر میں ساتھ لے گئے یہ دونوں خود تو ملاقات کے کمرہ میں جا بیٹھے۔ اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا تھوڑی دیر میں علامہ کی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی۔

منیرہ۔ موٹر میں کتے آئے ہیں

علامہ۔ نہیں۔ بٹیا یہ تو آدمی ہیں۔

٭

راوی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے سخت گرمی کا زمانہ تھا پروفیسر ڈکنس جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان دنوں تازہ تازہ علی گڑھ سے وارد ہوئے تھے علامہ کے یہاں آئے میکلوڈ روڈ کی کوٹھی کے درمیانی کمرے میں علامہ کی نشست تھی اور نہایت بے ترتیبی سے کموکی دیوار پر ملکہ وکٹوریہ کی رنگین تصویر بغیر شیشے کے

آویزاں تھی۔ پروفیسر ڈکنس کی نظر جب تصویر پر پڑی تو

ڈکنس (مسکرا کر) آپ کو تصاویر کا ذوق بھی ہے۔

علامہ۔ یہ دیکھئے

راوی۔ علامہ نے تصویر کو اپنے ہاتھ سے ذرا سی حرکت دی تو پیچھے سے دیوار میں ایک شگاف نمودار ہوا جسے تصویر نے ڈھانپ رکھا تھا اور یہی اس تصویر کا مصرف تھا۔

ٌ

راوی۔ والدہ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ بجھ کے رہ گئے۔ بیمار بھی تھے لیکن کبھی کبھی ان کی خوش طبعی اور ظرافت عود کر آتی تھی اور بڑی زندہ دلی کی باتیں کرتے تھے۔ والدہ جاوید کے انتقال کے کچھ دنوں بعد کا ایک واقعہ عبدالرشید طارق نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ مختلف موضوعات پر باتیں ہو رہی تھیں نہ جانے کیسے صنف نازک کا تذکرہ آ گیا۔

علامہ۔ جاوید کی والدہ کی وفات کے بعد سے مجھے شادی کے کئی ایک پیغامات آ چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بڑی ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ ہر وقت آپ کا کلام پڑھتی رہتی ہوں۔ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔

میں نے جواب دیا: تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ میرا کلام پڑھتی رہو۔

راوی۔ علامہ یہ واقعہ سنا کر خوب ہنسے جس میں حاضرین بھی

شامل ہو گئے۔

راوی۔ میکلوڈ روڈ پر اقبال کی کوٹھی زیارت گاہ خواص و عوام تھی دور دور سے تشنگانِ علم و عرفان آتے اور اپنی پیاس بجھاتے۔ اپریل ۳۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک نوعمر طالب علم مودود صابری ان کی زیارت کیلئے علی گڑھ سے لاہور آئے اور علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے پورچ کے قریب، ان کی علامہ کے خادم علی بخش سے یہ گفتگو ہوئی۔

مودود صابری۔ میں ایک طالب علم ہوں علامہ اقبال سے ملاقات کیلئے وقت لینا چاہتا ہوں۔ آپ اطلاع کر دیں۔

علی بخش۔ آپ نئے بندے ہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنے کیلئے کسی اطلاع کی ضرورت نہیں وقت لینے کی بھی لوڑ نہیں وہ سامنے بیٹھے ہیں تُسی بے کھٹکے جاؤ اور گل بات کرو

راوی۔ مودود صابری حیران ہو کر آگے بڑھے تو دیکھا سامنے چبوترے پر ایک نواڑی پلنگ پڑا تھا علامہ سفید تہمد اور سفید نیم آستین کی بنڈی پہنے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے حقے سے شوق فرما رہے تھے مودود صابری اور علامہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مودود صابری۔ اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔

علامہ۔ وعلیکم اسلام آؤ جی بیٹھو۔

صابری صاحب میں ایک ناچیز طالب علم ہوں علی گڑھ سے صرف آپ کی زیارت کیلئے لاہور آیا ہوں۔ تاکہ اس اقبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں جس کے سوز فکر نے میری راتوں کو بے خواب کر دیا۔ اور جس کے پیام کی حرارت نے میرے جسم و جان کو جلا ڈالا ہے۔

علامہ کب آئے تھے؟

مودود صابری۔ کل رات آیا تھا

علامہ۔ جب اقبال سے ملنے کیلئے اس نوعمری میں اتنا طویل سفر کر کے آئے ہو تو پھر تم میرے مہمان ہو سامان لے آؤ اور میرے پاس ہی ٹھہرو۔

مودود صابری۔ میں کہاں، اور آپ کہاں میں بانگ درا اور پیام مشرق کے خالق سے ملاقات کی تمنا لیکر آیا تھا میرے لئے آپ کی زیارت ہی سب کچھ ہے۔

علامہ۔ میاں صاحبزادے تم پیام مشرق والے جس اقبال سے ملنے آئے ہو وہ یہاں نہیں رہتا یہاں تو سیالکوٹ والا اقبال رہتا ہے اس سے ملنا پسند کرو تو حاضر ہے۔

مودود صابری۔ جس اقبال سے میں ملنے آیا ہوں سنا ہے ان کا آپ کے
ہاں بہت آنا جانا ہے جب آئیں تو میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے۔

علامہ۔ (مسکراتے ہوئے) تم نے ٹھیک سنا ہے مگر افسوس
جب تمہارا اقبال میرے پاس آتا ہے تو مجھ کو اپنا بھی ہوش نہیں
رہتا اس کے آنے کا علم مجھے اس کے جانے کے بعد ہوتا ہے
کبھی ہوش باقی رہا تو تمہارا پیام ضرور پہنچا دوں گا۔ مگر اس کی
توقع بہت کم ہے۔ کیونکہ اس اقبال کا میں بھی ویسا ہی دیوانہ
ہوں جیسے تم ہو۔

راوی۔ چنانچہ علامہ خود فرماتے ہیں

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو تمنّا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

راوی۔ علامہ کی صحبت میں چند روز نیاز مندانہ حاضر رہنے
کے بعد اور ان کی بے پناہ شفقت سے دلیر ہو کر مودود صابری
نے جسارت کی کہ وہ ان اعتراضات کا تذکرہ کریں جو بعض حلقوں
کی طرف سے ان کی شاعری پر کئے جا رہے تھے۔

مودود صابری۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان اعتراضات کا تذکرہ

کروں جو بعض زبان اور شعر کے نقاد آپ کے کلام پر کر رہے ہیں۔

علامہ۔ مثلاً

مودود صابری۔ مثلاً آپ کا ایک شعر ہے

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارہ کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

اس میں نقص یہ بتایا جاتا ہے کہ دوسرے مصرعے میں علامت مفعول لفظ لیلیٰ کے بعد محذوف ہے جو فصاحت کے منافی ہے اسی طرح بعض دوسرے نقادوں نے آپ کی زبان پر نکتہ چینی کی ہے ان اعتراضوں کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے؟

علامہ (قدرے سنبھل کر اور متانت سے) میاں تم مجھ سے بہت محبت رکھتے ہو ان جھگڑوں میں نہ پڑو میرے پاس ان زبان و بیان کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں میں پنجاب کا رہنے والا ہوں اردو میری مادری زبان نہیں ہے لکھنو اور دہلی والے اہل زبان ہیں مجھے تسلیم ہے۔ مگر لوگ مجھ پر ظلم کرتے ہیں کہ مجھ کو شاعر سمجھتے ہیں اور میری تحریر میں شاعرانہ نکتہ سنجیاں ڈھونڈھتے ہیں اس کا ذکر تم کو یاد ہوگا میں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں کئی جگہ کیا ہے جو بات میں کہتا ہوں اگر اس کی اردو درست نہیں ہے تو اہل زبان کو اجازت ہے کہ وہ اردو صحیح کر کے پڑھ لیں مگر میری بات ضرور سنیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

جو کچھ میں کہتا ہوں اگر مسلمان اس کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا گم شدہ اقبال

پھر لوٹ آئے میری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اگر میرے نقاد اس کا دسواں حصہ بھی دیکھ لیں تو شاید دماغی توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹے ماریں۔

جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ پورا کہہ بھی نہیں سکتا اِس لئے کہ زبان کا دامن تنگ ہے اور ان مضامین کا متحمل نہیں جو میں کہنا چاہتا ہوں کاش میرے نقاد الفاظ سے گزر کر معانی اور مطالب پر غور کریں اور مجھ کو بجائے شاعر سمجھنے کے اقبال اسلام کا پیامی سمجھیں

راوی۔ چند روز بعد جب مودودی صاحب رخصت ہونے لگے تو علامہ نے فرمایا

علامہ۔ جاؤ خدا حافظ جب علی گڑھ پہنچو تو سر سید کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھنا اور میرا سلام پہنچا دینا (۱)

راوی۔ خالد نظیر صوفی نے اپنی والدہ کے حوالے سے (جن کو ایک طرح سے علامہ نے اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا اور جوان کے ساتھ ایک عرصے تک رہیں) لکھتے ہیں۔

"ایک روز ڈرائینگ روم میں باتیں ہو رہی تھیں۔ والدہ اور چچی جان (بیگم اقبال) ساتھ والے کمرہ میں تھیں۔ بیچ کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے وہ سب کچھ سن سکتی تھیں۔ اس وقت علامہ سفر دکن کے حالات بیان کر رہے تھے فرمایا ایک روز حیدر آباد کے وزیر اعظم سر کشن پرشاد کے ہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی کھانے کے بعد ناچ گانا ہوا جام چھلکنے لگے علامہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حاضرین میں سے کسی نے کہا

سوال کیا آپ نے بھی شوق فرمایا؟

علامہ۔ نہیں بھائی میں محفل سے اُٹھ گیا۔ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔

⁂

راوی۔ علی بخش نے ایک عمر علامہ کے قدموں میں گزاری تیس پینتیس سال کے عرصے میں انھوں نے کبھی اسے سخت سست نہیں کہا سوائے ایک آدھ بار کے۔ وہ واقعہ جب اُسے سخت ڈانٹ پڑی۔ یہ تھا کہ ان کے انتقال سے سال پہلے کی بات ہے۔ ایک سکھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں آیا۔ ان کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اس نے

آتے ہی گلاس مانگا۔ علی بخش نے گلاس لا کر دیا۔ اس نے جھٹ
بغل سے بوتل نکالی۔ گلاس میں شراب انڈیل غٹاغٹ چڑھا گیا۔

علامہ۔ نکالو اس نامعقول کو یہاں سے

علی بخش بہت بہتر۔ (علی بخش اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کرتا ہے)

علامہ۔ تم نے اس کم بخت کو گلاس کیوں لا کر دیا اور جب وہ
شراب پینے لگا تھا تو اسے روکا کیوں نہیں بیوقوف، ساری غلطی
تمہاری ہے (۱)

راوی۔ اقبال کے نواسے اور اقبال درونِ خانہ کے
مصنف خالد نظیر صوفی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ علامہ
کو درد گردہ کی شکایت ہوئی۔ ڈاکٹر آیا۔

علامہ۔ ڈاکٹر صاحب جب دورہ پڑتا ہے تو ناقابلِ
برداشت درد ہوتا ہے۔ گھنٹوں ٹیسیں سی اٹھتی رہتی
ہیں۔

ڈاکٹر۔ (نسخہ لکھتے ہوئے)
یہ چند دوائیں استعمال کیجئے
اور
ایک پیگ برانڈی کا کھانے کے بعد لے
لیا کیجئے۔

علامہ ایک پیگ برانڈی کا ؟

ڈاکٹر۔ جی ہاں ۔ دوا کے طور پر ۔

علامہ۔ برانڈی میں ہرگز نہ لوں گا۔ جس چیز کو میں نے قیامِ یورپ کے دوران بھی منہ نہیں لگایا۔

اب اس معمولی سے تکلیف کے لئے کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔

میں موت سے بچنے کیلئے بھی کسی حرام چیز کا سہارا لینے کا روا دار نہیں ہو سکتا۔

٭

باب ۳

راوی۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :

اقبال شاعر ہی نہ تھے بلکہ بہت کچھ اور بھی لیکن یہ بات ان لوگوں کو کیسے بتائی اور سمجھائی جائے جنھوں نے اقبال کو کتاب میں پڑھا ہو اور زندگی میں نہ دیکھا ہو۔

میں تو اقبال کے ظرف کا قائل ہوں کہ وہ کتنی بات جانتے پہچانتے تھے۔ لیکن جس جگہ جس طور پر جم کر بیٹھ گئے تھے وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے

ایک دن رشید احمد صدیقی نے بقولِ خود کسی قدر گستاخ ہو کر علامہ سے کہا۔

رشید احمد صدیقی۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے دنیا کو دھوکا دے رکھا ہے اس فریب کو دنیا نے کبھی پالیا تو کیا ہوگا ؟

علامہ۔ (متحیر ہو کر لیکن مسکرا کر) کیوں کیا بات ہے ؟

رشید احمد صدیقی۔ ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت اور بڑے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات اپنے اشعار میں قلم بند کر دیئے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف

اتنا ہی جان کر اکتفا کر لیں اور آپ غضب یہ کر رہے ہیں کہ شعر و شاعری سے آگے نہیں بڑھتے ۔

آپ کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کے اشعار میں کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی مل جاتی ہے حالانکہ آپ بات بات میں وہ نکتے بتاتے جاتے ہیں جو مدتوں کے مطالعے کے بعد بھی شاید معلوم نہ ہوتے ۔

علامہ۔ (زور سے ہنس کر، پھر حقے کا ایک گہرا کش لے کر)
دیکھو دنیا جس آفت میں مبتلا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے اور جو لوگ نہیں جانتے وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں اور بتاتے بھی ہیں[1]

*

راوی۔ دوسرے اہل نظر جن کو علامہ کی مجلسوں اور محفلوں میں بیٹھنے کا اور علامہ سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ان کا خیال بھی یہی ہے کہ ان کی شخصیت دریا تھی ان کے کلام کی حیثیت چند موجوں سے زیادہ نہیں۔

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں لکھتے ہیں ۔

علامہ اقبال کے علم و فضل کا شہرہ ان کی شاعری اور ان کی تصانیف سے نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا ذمہ دار ان کا تکلم ہے وہ دور حاضر کے بہت بڑے متکلم تھے ۔

---

[1] نقش ہائے رنگ رنگ ص ۸۷

صبح سے رات تک یہ مردِ قلندر اپنے سادہ کپڑوں (بیشتر بنیان اور تہمد میں) ملبوس سیدھی سادی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھا رہتا اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا. صوبے کے سیاسی اکابر وکلاء علماء کالجوں کے پروفیسر اخباروں کے ایڈیٹر شعراء ادباء. طالب علم ان پڑھ، عقیدت مند فقیر اور درویش ..... غرض ہر قسم اور ہر طبقے کا انسان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا معمولی معمولی جھگڑوں سے لیکر قانون فلسفہ سیاست دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیر بحث آتے اقبال ان سب پر اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر ہو جاتا.

صوبے بھر کے تعلیم یافتہ حضرات اپنی ذہنی اور فکری الجھنیں علامہ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ انھیں سلجھا دیتے.

ان کی مجلس میں بڑے چھوٹے کا امتیاز نہ تھا. معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا ان کے گھر میں داخل ہو کر ان کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا بیٹھا رہتا.

علم و فکر کے اس دربار میں سر فضل حسین، سر سکندر حیات مسز سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، قائدِ اعظم محمد علی جناح، لارڈ لوتھیان، ڈاکٹر سگاریا، موسیٰ جار اللہ اور بے شمار اکابر علم و سیاست حاضر ہوتے اور مستفیض ہو کر جاتے. (۱)

---

(۱) ذکر اقبال صفحہ ۱۳۲-۱۳۳.

راوی۔ جنوری ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ سیّد نذیر نیازی علامہ کی خدمت میں حاضر تھے اور قوم وملت کی گفتگو کے پس منظر میں میثاقِ مدینہ زیرِ بحث تھا۔

علامہ یہ جو ارشادِ باری ہے "کنتم خیر امت اخرجت للناس" تو ثابت ہوا کہ اُمت کی بنا وطن کی بجائے عقیدے پر ہے اور عقیدہ کا تقاضا تھا کہ حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائیں، میثاقِ مدینہ نے عملاً اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی وطن قومیت کی کوئی مستقل اساس نہیں ہے۔

عالمِ اسلام کب سے روبہ انحطاط ہے نہ علم باقی رہا نہ عمل نہ مدرسوں کی قیل قال میں کچھ رکھا ہے نہ خانقاہوں کی ہائے و ہو میں نہ اہلِ شریعت میں دم ہے نہ اہلِ طریقت میں۔

⁂

راوی۔ پنجابی رسالے سارنگ کے دسمبر ۱۹۳۱ء کے پرچے میں اس رسالے کے ایڈیٹر ایس ایل براشر کا علامہ اقبال سے انٹرویو چھپا تھا۔ اس کا ترجمہ جو حامد علی خان نے کیا تھا اگست ۱۹۳۸ء کے ہمایوں میں چھپا اس انٹرویو کا تمثیلی اقتباس یہ ہے

براشر آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے؟

علامہ۔ پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں اس میں نثر بہت

کم ہے لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں جٹکا پن بہت ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے ہی اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پنجابی میں بحر پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بھاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے اس کا دعویٰ ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر قافیے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔

پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات میں بھٹکی ہوتی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادی، نرم اور میٹھی ہوتی ہے جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھلے انداز میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے ایک شعر میں نتھ کا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

جے بینسری جھک لیاں تے ای کوئی آب حیات دے ہونے توں
پات پت جلیب حسن دی پئی کڑاہ تلیو نے نوں

(حیدر علی)

عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے نہیں بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہے پنجابی

شاعری تصوف سے بھری ہوئی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے اس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پرجوش گیت ملتے ہیں۔ فوجی گیتوں کی بھی کمی نہیں عام لوگوں کے گیتوں اور بولیوں کی تو کوئی حد ہی نہیں۔

اردو میں تصوف کی شاعری ہے ہی نہیں صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے اردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں، اس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا زور کم ہے عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری، درباروں امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔

اس کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا اسی وجہ سے اردو شاعری میں امیرانہ رنگ آگیا تھا۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھی جاتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر قافیے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

لیکن پنجابی کیلئے اردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے۔

پنجابی شاعروں کو اردو شاعروں کی طرح سنتو د خیالات و الفاظ کی تراش خراش ، پر قدرت حاصل کرنی چاہیئے ۔ اور اردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں بھی پیدا کرنی چاہیئے ۔

براشر۔ کیا آپ کیلئے زبان کا سوال پیدا نہیں ہوا تھا ، آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا ؟

علامہ۔ نہیں میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوتی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا اور نہ ہی میں اب لکھ سکتا ہوں

براشر۔ فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا ؟

علامہ۔ میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں دوسرے فارسی دنیا کے بہت سے حصوں میں سمجھی جاتی ہے ۔

براشر۔ ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جاننے اور ماننے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا ۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو دنیا کی ایک مسلمہ عظیم الشان زبان بنا دیا تھا اسی طرح آپ پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے ۔

علامہ۔ کوئی بولی بھی ہو ایک زبردست شخصیت اِسے بنا سکتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی کوئی گوئٹے جیسا آدمی مل جائے ۔

براشر۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت

کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا ۔

علامہ۔ میں نہیں مان نہیں سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا ۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا خواہ کوئی زبان ہو صرف مشق ہونی چاہیئے ہر ایک زبان میں کہا جا سکتا ہے اصل چیز تو خیال ہے ۔

بُراشر ۔ معاف کیجئے آپ کا یہ عقیدہ کہ زبان سوال کا اتنا اہم نہیں ہوتا ۔ ایک ناول یا ڈرامہ لکھنے والے کیلئے کس طرح درست ہو سکتا ہے ناول یا ڈرامہ لکھنے والے کو بہر حال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے اس کیلئے لوگوں کی زبان استعمال کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ۔

علامہ۔ ہاں ۔ ناول یا ڈرامہ لکھنے کیلئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈرامہ لکھنا چاہے تو کیا حرج ہے کہ وہ پنجابی میں لکھے ۔

براشر ۔ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ کا خیال ہے کہ کوئی بدیشی آدمی کسی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اٹھا سکتا اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

علامہ۔ میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا اصل شاعری روح کی شاعری ہے اور وہ ساری دنیا کیلئے ہوتی ہے ۔

یا اهل الکتب تعالو الیٰ کلمۃ سوا بیننا بینکم
ہم سب خدا کو مانتے ہیں ہمیں مل جل کر رہنا چاہیئے ۔ اس

لحاظ سے جو بھی خدا کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔

براشر۔ تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب ایسے ہی مسلمانوں سے ہوتا ہے۔؟

علامہ۔ ہاں، آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے۔

براشر۔ تو پھر آپ اپنی شاعری میں مسلمانوں کے پیغمبروں کے نام اور ان کی روائتیں کیوں لے آتے ہیں!

علامہ۔ میں اپنے ہندو اور سکھ دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ آپ مسلمان ہادیوں اور پیغمبروں کے ناموں کی جگہ شوق سے ہندو اور سکھ بزرگوں کے نام استعمال کر لیا کیجئے میں جو مسلمان بزرگوں کے نام لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں مسلمان گھر میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا اور میری تعلیم اسلام کی تاریخ اور مذہب میں ہوئی ہے۔ [۱]

ٌ

راوی۔ روحانیت پر گفتگو ہو رہی تھی سید امجد علی بھی موجود تھے

علامہ۔ شاعر پر بھی روحانی غلبہ کا ایک خاص دور ہوتا ہے جب یہ کیفیت شباب پر ہو اور صحیح رہنمائی میسر نہ ہو تو وہ بہک جاتا ہے۔

امجد علی۔ مثلاً

علامہ۔ مثلاً نطشے۔ جب جذب و وجدان نے اس پر غلبہ

---

۱ صحیفہ اقبال ص ۶۵ - ۶۰

کیا تو وہ ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے کوئی تربیت دینے اور راہ دکھانے والا میسّر نہیں تھا۔

امجد علی۔ اِسی لئے آپ نے کہا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا کہ مقامِ کبریا کیا ہے

ؔ

راوی۔ سیّد امجد علی حاضرِ خدمت تھے۔ علامہ کی طبیعت شگفتہ تھی فکر و فن کی باتیں ہو رہی تھیں۔

امجد علی۔ آپ کی نظر میں سب سے اچھا شاعر کون ہے؟

علامہ۔ رومیؔ تخیل میں
بیدلؔ اندازِ بیان میں

امجد علی۔ آپ کو کونسا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟

علامہ۔ سایہ من، ہم چو من در ملک ہستی
سایہ تو در عدم پیغمبر ہمتائے من

امجد علی۔ پسندیدگی کی وجہ بھی ارشاد فرمائیں۔

علامہ۔ فارسی کا یہ شعر نعت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ہے اور اس شعر میں خوبصورت تعلی موجود ہے [۱]

ؔ

---

[۱] روزگارِ فقیر ص ۱۴۰

راوی ۔ علامہ کی محفل علم و دانش میں منجملہ اور لوگوں کے فقیر سیّد نجم الدین بھی موجود تھے ۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ گفتگو جاری تھی کہ یکایک ایک ملاقاتی نے پوچھا۔

ملاقاتی ۔ ڈاکٹر صاحب آپ عالم بھی ہیں فلسفی بھی کیا آپ خدا کی ہستی اور وجود کو فلسفیانہ دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں ۔

علامہ ۔ نہیں ۔

ملاقاتی ۔ تو پھر آپ نے خدا کی حقیقت کو تسلیم کیسے کیا ؟

علامہ ۔ اس کیلئے مجھے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبرؐ نے جن کے متعلق ان کے دشمن بھی کہتے تھے کہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جب فرمایا ہے کہ خدا مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے تو خدا کی ہستی یقیناً ہے [۱]

*

راوی ۔ ایک دفعہ علامہ اپنے گھر سیالکوٹ گئے ان کی چھوٹی بہن بھی وہیں تھیں اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کا ذکر ہو رہا تھا ۔

بہن ۔ وہ منصف ہے اور انصاف کریگا ۔

علامہ ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ ہمارے ساتھ اپنی صفت عدل کا مظاہرہ نہ کرے کہ ہم اس کے متحمل

[۱] روزگار فقیر جلد اوّل ص ۱۴۷ ۔

نہیں ہو سکتے البتہ وہ ہم پر اپنا فضل و رحم فرمائے (۱)

ٹ

راوی۔ پروفیسر محمد دین بھٹی جو اقبال کے ہم مکتب رہے تھے سے روایت ہے کہ

۱۹۰۸ء میں جب اقبال انگلستان سے واپس وطن تشریف لائے تو سیالکوٹ کی مشہور جامع مسجد دو دروازے والی میں ایک روز انھوں نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا ان کی تقریر کے دوران کسی نے پوچھا

سائل۔ خدا کی ہستی کس طرح ثابت ہوتی ہے ؟

علامہ۔ ؎ فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

عالم انسانیت کی وہ عظیم ہستی جس کو نبوت ملنے سے پہلے ہی لوگ صادق و امین کے لقب سے پکارتے تھے فرماتے ہیں کہ خدا موجود ہے اس لئے میرے نزدیک خدا کی ہستی پر سب سے بڑی دلیل خود پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اپنا وجود ہے۔

ٹ

راوی مشہور ناول نگار ایم اسلم کو علامہ کا شاگرد ہونے کا

(۱) روزگار فقیر ص ۱۴۰

فخر بھی حاصل تھا۔ اور ان کے علامہ سے خاندانی مراسم بھی تھے۔
ایم اسلم نے شاعری علامہ ہی کے کہنے پر ترک کی اور بامقصد افسانہ اور ناول نگاری اختیار کی۔

ایم اسلم علامہ کی خدمت میں اکثر رہتے تھے۔ ایک ایسی ہی حاضری کی رُوداد یہ ہے۔

ایم اسلم: ڈاکٹر صاحب، آپ میرے استاد ہیں اور مربی بھی۔ اگر اجازت دیں تو ایک سوال پوچھوں۔

علامہ: میاں جی، ضرور پوچھو۔

ایم اسلم: میں نے اکثر آپ کی میز پر قرآن مجید کو دوسری کتابوں کے ساتھ پڑا دیکھا ہے کیا یہ سوءِ ادبی نہیں؟

علامہ: یہ کسی قیمتی اور خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر اور عطر میں بسا کر اونچی جگہ پر رکھنے والی کتاب نہیں بلکہ یہ تو انسان کے ہر وقت کام آنے والی کتاب ہے چونکہ مجھے اکثر اس کے حوالے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے یہاں رکھی ہے [1]

٭

راوی: غازی عبدالرحمٰن "ہلال" کے نشان کے حق میں نہیں تھے۔

عبدالرحمٰن: کیا "ہلال" کے نشان کے استعمال سے چاند سورج سے سلسلۂ نسب ملانے کی کوشش ظاہر نہیں ہوتی؟

---

[1] روایاتِ اقبال ص ۷۰۔

علامہ۔ نشان "ہلال" کی تاریخ میں اختلاف ہے جہاں تک مجھے علم ہے یہ نشان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں مروج نہ تھا بعض مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ یہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں غالباً صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی۔ کچھ عجیب نہیں کہ صلاح الدین ایوبیؒ کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ صلاح الدین ترک نہ تھے کُرد تھے سنی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصور کرتی ہے ایران کا نشان اور ہے۔ میرے خیال میں اس کا استعمال اتفاقی طور پر شروع ہوا۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور عَلموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کر لیا اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔

تاریخی پہلو سے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس کے نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند سورج سے اپنا سلسلہ نسب ملانے کے خیال سے، مگر تمام امت کا اس پر صدیوں سے اجماع ہو چکا ہے جن اسلامی ملکوں کا نشان اور ہے اور وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئیں۔ حدیث صحیح ہے کہ میری امت کا اجماع ضلالت پر نہ ہوگا اس واسطے اس کو ضلالت تصور کرنا ٹھیک نہیں۔ ؎۱

؎۱ اوراقِ گم گشتہ

راوی۔ جب ایم اسلم اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ لیکر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت چودھری محمد حسین بھی موجود تھے افسانے کی بات چل پڑی۔

ایم اسلم۔ مجھے سب سے زیادہ ڈیوما اور سر والٹر سکاٹ پسند ہیں۔

محمد حسین۔ مغرب والے تو اس فن کے موجد ہیں۔

علامہ۔ (ایک جذبے سے) بالکل غلط ہے ہماری دنیا میں افسانہ الہامی کتابوں سے آیا ہے۔ جن میں قرآن مجید پیش پیش ہے یوں تو توریت اور انجیل میں بھی افسانوں کے ڈھانچے ملتے ہیں، لیکن قرآن حکیم میں واقعات کو پورے افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے احسن القصص کہا ہے پھر حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کا قصہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات الہامی افسانے ہی تو ہیں۔ مغرب والوں نے افسانہ لکھنا الہامی کتابوں ہی سے سیکھا ہے ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی اہل قلم نے افسانے کے فن میں بہت جدت سے کام لیا ہے اور اس کی نوک پلک کو خوب سنوارا ہے۔

۴

راوی۔ ۱۹۳۵ء کی ایک شام کا ذکر ہے کہ اسلامیہ کالج کے چند طلبا وفد کی صورت میں علامہ سے ملنے آئے۔

علامہ۔ کیوں بھئی کیسے آئے؟

ارکانِ وفد۔ ایک مشاعرہ کرانے کا ارادہ ہے جناب والا اگر آپ اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی زیادہ جمع ہوسکیں گے۔

علامہ۔ میں کسی مجلس یا جلسے کا صدر بننا پسند نہیں کرتا البتہ شعر بازی سے تمہیں روکتا ہوں۔ اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو شعر بازی کی ضرورت نہیں اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے۔

لوگ شعر بازی کی طرف اس لئے جلد متوجہ ہوجاتے ہیں کہ بغیر کاوش مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامن گیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو۔

آپ نوجوان ہیں آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہیئے ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں، رسالے لکھیں اور تراجم کریں اپنی قوم کو اور خود اپنے کو بہتر بنائیں

۴

راوی۔ مارچ اپریل ۱۹۳۶ء میں علامہ شیش محل بھوپال میں علاج کیلئے مقیم تھے۔ اس زمانے میں بھوپال کے ادیب اور شاعر علامہ کی خدمت میں استفادہ کیلئے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ حکیم قمر الحسن بھی حاضر خدمت تھے حکیم ولاور حسین نے ان کا

تعارف علامہ سے کرایا۔

علامہ (قمرالحسن سے) کیا لکھتے ہو ؟

قمرالحسن۔ افسانے اور انشائے لطیف کا شوق ہے۔

علامہ۔ انشائے لطیف بے مقصد چیز ہے نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ کوئی صحت مند تعمیری ادب پیش کریں۔ طلبہ کو چاہیئے کہ پہلے علم حاصل کریں اس لئے کہ بغیر اچھے علم کے اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔

☆

راوی۔ ایم اسلم نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ میں گورنمنٹ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شاعری کا شوق بھی رکھتا تھا۔ ایک بار حاضر ہوا تو حضرت گرامی بھی تشریف فرما تھے۔ ان کے اصرار سے میں نے دو ایک شعر سنائے ایک شعر یہ تھا

قیس اُڑائے نہ جنوں سے جو کبھی گرد و غبار
سرمہ پھر وہ چشم غزالاں نہ رہے

جب دوسرا شعر پڑھا۔
تو علامہ یوں گویا ہوئے

علامہ پھر پڑھیئے۔

ایم اسلم
جس طرح بنے گزارہ کر
اب زمانہ نہیں شکایت کا

علامہ۔ اسلم شعر گوئی چھوڑ دو، نثر لکھا کرو۔

ایم اسلم۔ آپ نے مجھے نثر لکھنے کی ہدایت فرمائی ہے میں زیادہ سے زیادہ افسانہ ہی لکھ سکوں گا

علامہ۔ افسانہ ہی لکھو لیکن جو کچھ بھی لکھو قومی نقطہ نگاہ سے لکھو۔

٭

راوی۔ جون ۱۹۳۷ء میں احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید سالکؔ اور مولانا چراغ حسن حسرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں مولانا ظفر علی خان کا ذکر آگیا۔ عبدالمجید سالکؔ نے کہا

سالکؔ۔ مولانا کا ارادہ ہے کہ زمیندار میں مختصر افسانوں کا ایک سلسلہ شروع کریں۔

علامہ۔ افسانوں کے نفسیاتی پہلو کی لذت کا میں بھی معترف ہوں لیکن اگر ان کی جگہ کوئی ایسی چیز پیش کی جائے جو افسانہ کا افسانہ ہو اور سبق کا سبق تو بہتر رہے گا۔

دیکھئے اسلام کے اولوالعزم فرزند ایسی ایسی مہمیں سر کر کے گئے ہیں ایسے معرکے طے کر چکے ہیں جن کا تذکرہ بہترین سے بہترین افسانوں سے بہتر رہے گا۔

میری تو مدت سے یہ خواہش ہے کہ کسی باہمت ادیب یا مورخ سے کہوں وہ مختلف تذکروں کا سلسلہ شروع کرے۔ تذکروں کا یہ سلسلہ مسلمانوں کیلئے بیحد مفید رہے گا اور مواد کافی ہے تذکرۂ صوفیائے اسلام، تذکرہ غازیان اسلام، تذکرہ فلسفیان اسلام، تذکرۂ شعرائے اسلام، تذکرۂ مجاہدین اسلام

وغیرہ [1]

٭

راوی۔ افغانستان میں قیام کے دوران علامہ کے اعزاز میں انجمن ادبی کابل نے ایک خصوصی محفل آراستہ کی۔ ایک افغان شاعر عبداللہ خان نے اپنی خیر مقدمی نظم میں کہا کہ علامہ سے طرز مولانائے روم زندہ ہوگئی ہے۔

علامہ نے سپاس نامے کے جواب میں کہا

علامہ۔ میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے اسی بنا پر آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح، شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کرسکتا ہے اور برباد بھی [2]

٭

راوی۔ سید عابد علی عابد کو دسمبر ۱۹۳۷ء کے یوم اقبال کے جلسے میں "اقبال اور فنونِ لطیفہ" کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ اس سلسلہ میں علامہ سے رہ نمائی حاصل کرنے کے لئے سید عابد علی عابد، راجہ حسن اختر کے ساتھ جاوید منزل حاضر ہوئے۔ اس وقت وہاں نذیر نیازی اور م۔ ش بھی موجود تھے

---

[1] حیاتِ اقبال ۲۹۸۔ [2] سرگزشتِ اقبال۔ ۴۵۵

موقعہ پاکر راجہ حسن اختر نے کہا۔

راجہ حسن اختر۔ عابد صاحب اقبال اور فنون لطیفہ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھ رہے ہیں۔

علامہ۔ (عابد علی کو متجسس عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے) میرے کلام کو آرٹ سے کیا تعلق ہے؟ میری شاعری اسلامی تفکر اور فقہ کی تفسیر و تعبیر ہے۔

عابد علی۔ میرا مقصد اس کی وضاحت کرنا ہے کہ آپ کے خیال میں فنونِ لطیفہ کا نصب العین کیا ہے؟

علامہ۔ ہاں اس اعتبار سے مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔

عابد علی۔ آرٹ کے زوال پذیر ہونے کے جو محرکات ہوتے ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ آرٹ کی زوال پذیری دراصل اقوام کی مجموعی زوال پذیری کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک خدا کو کسی قوم سے کچھ کام لینا مقصود ہوتا ہے اور اسے سرداری کے منصب پر فائز رکھنا منظور ہوتا ہے اس وقت آرٹ زندہ اور جان دار رہتا ہے بلکہ سب سے پہلے کسی قوم کی زوال پذیری کی علامت آرٹ کی زوال پذیری کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔

نذیر نیازی۔ ان حالات میں کیا شاعری سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔؟

علامہ۔ ضروری نہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے جب کوئی قوم زوال پر آمادہ ہو جاتی ہے تو ٹھوس چیزوں سے

مغز سے، معنی سے بیگانہ ہو جاتی ہے چھلکے سے شکل سے دلبستگی
بڑھ جاتی ہے یہی آرٹ کی زوال پذیری ہے۔

سیّد عابد علی۔ اردو شاعری میں شاید ناسخ اور اس کے سکول کا
کلام آپ کے ارشاد کی بہترین تفسیر ہے۔

علامہ۔ میں نے ناسخ اور اس کے سکول کا کلام بہت کم پڑھا
ہے میرا اردو ادبیات کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ البتہ یہ کہہ
سکتا ہوں کہ اردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصہ نسبتاً جان دار
نظر آتا ہے۔

نذیر نیازی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دکنی ادبیات کو مذہب
سے نہایت گہرا تعلق ہے۔

علامہ۔ ہاں یوں کہو کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی
اور اساسی ہے۔

سیّد عابد علی۔ رسالہ اردو کے ایک مقالہ نگار نے میر حسن اور ایک پرانے
دکنی ادب کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے
قائم کی تھی کہ دکنی شاعر کا کلام زیادہ جان دار اور پرجوش ہے۔

علامہ۔ میر حسنؔ کے وقت تک اردو شاعروں میں کافی ژولیدہ
بیانی پیدا ہو چکی تھی یا تو کچھ کہنا ہی نہیں چاہتے تھے یا کہنا چاہتے
تھے تو کہہ نہیں سکتے تھے بلکہ جو بزرگوار کچھ کہنا چاہتے تھے ان
کے کلام میں بھی ایک خاص قسم کی ژولیدہ گفتاری ہے۔ جو
ذہنی ژولیدگی اور پریشان فکری کی خبر دیتی ہے۔

سیّد عابد علی۔ اس قسم کی ژولیدہ گفتاری کا معیاری نمونہ غالبؔ کا

ابتدائی کلام سمجھا جائے گا۔

نذیر نیازی۔ جیسے

یہ کہ ساماں عیش و جاتے تدبیر وحشت کی

ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

علامہ۔ (قدرے توقف کے بعد کسی حد تک، لیکن غالب سے کہیں زیادہ مومن ژولیدہ گفتار ہے

(بات بدل کر)

ایک جرمن مصنف کہتا ہے کہ فلسفے کے نظام دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وزنی ان میں مغز زیادہ ہوتا ہے دوسرے ذرا ہلکے جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو ہر ٹھوس چیز سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔

سید عابد علی۔ کیا آرٹ بھی وزنی اور ہلکا ہو سکتا ہے ؟

علامہ۔ ہو سکتا ہے۔ زوال پذیر اقوام میں آرٹ کا رس نچوڑ کر نہیں پیا جاتا بلکہ پھل کی شکل بنا دی جاتی ہے اور اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

سید عابد علی۔ آرٹ کی عظمت کا انحصار کس چیز پر ہے شکل پر یا مغز پر ؟

علامہ۔ یوں تو شکل بھی مغز ہی کا ایک پہلو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرٹ کی عظمت کا معیار مغز کی صحت مندی اور توانائی پر ہوتا ہے۔

ش

راوی۔ اپنے زمانے کے مشہور اخبار پیسہ اخبار کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سماجی کاموں خصوصاً مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں بڑی دل چسپی لیتی تھیں۔ نیک کام تھا لیکن اس کام میں دشواریاں بہت تھیں جب بہت دل برداشتہ ہوجاتیں تو علامہ کے پاس آتیں کہ مشورہ دیں اب کیا کروں، ایک بار فاطمہ بیگم آئیں۔

فاطمہ بیگم۔ میرے راستے میں اس طرح روڑے اٹکائے جارہے ہیں میں کیا کروں۔ اور سب سے زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں مسلمان لڑکیوں میں مذہبی تعلیم کا وہ شغف نہیں پاتی جو ان میں فطری طور پر ہونا چاہیئے تھا۔

علامہ۔ آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں اس مذہب کی خوبیاں چالیس سال کی عمر کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں۔
تمہارا کام تو زمین ہموار کرنا اور اس میں پودا لگانا ہے یہ پودا ایک دن خود بخود تناور درخت بن جائے گا اور پھل لائیگا۔

ٌ

راوی۔ موجودہ زمانے کی ترقیوں کا ذکر تھا سید امجد علی بول اٹھے۔

امجد علی۔ اگرچہ علم اس زمانے میں زیادہ پھیل چکا ہے لیکن تعلیمی نصاب کا معیار دن بدن گرتا جارہا ہے۔

علامہ۔ موجودہ نصابِ تعلیم کے غیر معیاری ہونے کے متعلق تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ لیکن جہاں تک علم کا تعلق

ہے وہ پہلے زمانے میں آج سے کہیں زیادہ تھا ۔[1]

ش

راوی۔ فقیر سید وحید الدین علامہ کی خدمت میں باریاب تھے زمانہ کی قدر ناشناسی کا تذکرہ تھا ۔

فقیر وحید الدین لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے شاعروں، قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے ۔

علامہ۔ تم غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو دنیا کی بند ہوتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے ۔[2]

ش

راوی۔ علامہ کی محفل میں تہذیب و تمدن کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں ۔

یکے از حاضرین۔ تہذیب بتدریج بڑی نمایاں ترقی کر رہی ہے ۔

علامہ۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیے کہ آپ نے تہذیب کو کس پیمانے سے ناپ کے یہ معلوم کیا ہے کہ وہ برابر ترقی کر رہی ہے اگر آپ کے پاس تہذیب کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہے تو

---

[1] حیات اقبال ۲۳۳ ۔ [2] روزگار فقیر ۸۸ ۔

آپ کو ماننا پڑے گا کہ دورِ حاضر میں تہذیب روبہ زوال ہے[1]

٭

راوی۔ ۱۹۲۳ء میں جب علامہ کو سر کا خطاب ملا تو اسلامیہ کالج لاہور کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے کی دعوت دی۔ علامہ کے ساتھ نواب سر ذو الفقار علی خان بھی تھے۔ چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی۔

طلبہ۔ ہم آپ کی تشریف آوری کیلئے آپ کے بیحد ممنون ہیں اب آپ ہماری رہ نمائی کیلئے کچھ ارشاد بھی فرمائیں

علامہ۔ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنیوالی چیزوں میں ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے جسے "فن برائے فن" کہتے ہیں۔

طلبہ۔ براہِ کرم اس نظریے کی کچھ تشریح بھی فرمائیے۔

علامہ۔ اس نظریے سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے۔ اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول مثلاً اخلاقیات یا روحانیت کا کوئی اصول اس فن کی رہبری کا حق دار نہ ہو۔ میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریے کے خلاف جہاد کیا ہے اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا۔ فن جب اخلاقیات اور روحانیات سے علیحدہ

---

[1] روزگارِ فقیر ۱۳۷ - [2] روزگار فقیر

ہوتا ہے تو وہ جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کیلئے جمالیات کے کسی شعبہ کو لوگے تو وہ قوم وملت میں ایک نئی روح پھونکے گا لیکن وہی فن جب ان مقاصد سے بگڑ جائے گا تو قوم وملت کے حق میں زہر قاتل بنے گا۔

ے دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است [۱]

⁂

راوی۔ ۱۹۲۷ء کے شروع میں اسلامیہ کالج کے پروفیسر عبدالحمید کالج کے رسالے کریسنٹ کے مدیر کی حیثیت سے علامہ کے پاس آئے۔

پروفیسر عبدالحمید۔ ڈاکٹر صاحب اس سال کریسنٹ کا پہلا نمبر نکلنا ہے براہ کرم کوئی پیغام یا تحریر طلبہ کیلئے دیجئے تاکہ اسے پہلے ورق پر چھاپا جائے۔

علامہ مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں، البتہ یہ شعر چھاپ لو

ے پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی
کجا عیشِ بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است [۲]

⁂

راوی۔ جرمن مفکر نطشے زیرِ بحث تھا۔ پروفیسر عبدالحمید نے کہا۔

۱۔ اقبال کے چند جواہر ریزے ص ۱۳۱ ۲۔ ایضاً ص ۲۷

عبدالحمید۔ نطشے کے بنیادی خیالات اسلام سے اتنے قریب ہیں کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا قرآن سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے اِسے اپنے فلسفہ میں انکارِ الٰہیت کی تعلیم دینا پڑی

علامہ۔ اِسی لئے تو میں نے کہا ہے

ع۔ قلبِ اُو مومن، دماغش کافر است

⁂

راوی۔ فارسی کے شاعر بیدل کی شاعری پہ باتیں ہو رہی تھیں۔ پروفیسر عبدالحمید نے اظہارِ خیال کیا

عبدالحمید بیدل کی شاعری میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے۔

علامہ۔ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے بیدل نے اپنی خاص اصطلاحات وضع کر رکھی ہیں جنھیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی۔ بیدل اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے۔

⁂

راوی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے اسلامیہ کالج کے پروفیسر عبدالحمید نے دورانِ گفتگو کہا۔

عبدالحمید۔ ایک نامور بزرگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاہور میں تشریف لائے

ہوئے ہیں علم و فضل میں طاق انگریزی زبان و ادب پر بڑی دسترس رکھتے ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ فنِ تقریر کے ماہر ہیں اور غضب کی تقریر کرتے ہیں۔

علامہ۔ ہاں۔ انگریزی فنِ تقریر میں ان کا پایہ مسلّم ہے لیکن یاد رکھو کہ انبیاء اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر جو لوگ بے ضرورت اُٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔

انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں، میں بھی تقریروں کے مشغلے میں کچھ عرصے کیلئے بہت منہمک رہا۔ لیکن بعد میں میں نے اِسے بالکل ترک کر دیا (۱)

٭

راوی۔ حفیظ جالندھری کا بیان ہے کہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ان کی ایک نظم "فرصت کی تلاش" روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی جس پر اودھ پنچ نے سخت اعتراضات کئے۔ انھیں بھی غصہ آیا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے تھے ان ہی دنوں علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اودھ پنچ کا وہ شمارہ سامنے پڑا تھا۔

علامہ۔ حفیظ جی، پڑھا ہے؟

حفیظ جالندھری پڑھا ہے اور میں اس کا منہ توڑ جواب دوں گا۔

---

(۱) اقبال کے چند جواہر ریزے ص ۴۶

علامہ — جواب دینے کی ضرورت نہیں جب کوئی جینئس پیدا ہوتا ہے تو لوگ اس کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے ہیں ۔ ۱؎

ؔ

راوی۔ حفیظ جالندھری ۱۹۲۱ء میں علامہ سے اپنے رسالہ اعجاز کیلئے کچھ لینے حاضر ہوئے ۔ سفارش میں اپنے استاد گرامی کا خط ساتھ لائے تھے پھر یہ گفتگو ہوئی ۔

علامہ ۔ تمہاری تعلیم کیا ہے ؟

حفیظ جالندھری۔ ساتویں جماعت ۔

علامہ ۔ مطالعہ جاری رکھو ، فارسی میں شعر کہتے ہو یا اُردو میں ؟

حفیظ ۔ اُردو میں ۔

علامہ ۔ ایک بات یاد رکھو اپنے اشعار میں رونے دھونے کی تبلیغ سے باز رہنا ، رونا رُلانا بہت ہو چکا ۔ لوگوں کو ہمت و حوصلہ درکار ہے ۔

حفیظ ۔ حضرت ، کچھ رسالہ کیلئے مرحمت ہو ۔

علامہ ۔ لکھو ۔

ع
از خاکِ سمرقند ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ، ہنگامہ چنگیزے

حفیظ ۔ توقع رکھوں ، کہ آپ آئندہ بھی کچھ عنایت فرماتے رہا کریں گے ۔

۱؎ اقبال کے چند جواہر ریزے ص ، ۷۴ ۔

علامہ۔ بڑی بی کیلئے یہ باتیں بالکل نئی تھیں پہلے تو وہ قائل نہ ہوئیں چنانچہ اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو ہوئی میں نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے مثلاً یہ کہ غسلِ جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔

آخر میں میں نے کہا بڑی بی کسی خاص غسل کی تو اب آپ کو ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ طہارت کیلئے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے۔

عبدالحمید۔ پھر وہ کیا بولیں

علامہ۔ میری توجیہات سے بڑی بی بڑی خوش ہوئیں کہنے لگیں کہ ضرور ایسا کرونگی مسلمانوں کے یہ قواعد بڑے پاکیزہ ہیں۔

عبدالحمید وہ بڑی بی قائل ہوگئیں تو بڑا اچھا ہوا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ان باتوں سے آگاہ نہیں۔

علامہ۔ میرا خیال ہے کہ سائنس دانوں اور اہل طب کو اسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں جو کام اہل فلسفہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہیئے۔

ث

راوی۔ خواجہ عبدالوحید علامہ کی وفات سے ایک ہفتہ

پہلے مزاج پرسی کیلئے گئے باہر علی بخش سے علامہ کی کیفیت دریافت کر رہے تھے کہ علامہ نے کمرے میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے پہچان نہ سکے لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ باہر کوئی موجود ہے ملازم سے پوچھا۔ باہر کون کھڑا ہے؟
اس نے بتا دیا کہ خواجہ وحید ہیں۔
فرمایا، انھیں اندر بلاؤ۔

خواجہ اندر حاضر ہوئے

خواجہ وحید۔ اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب کیسے مزاج ہیں؟
علامہ۔ الحمدللہ اچھا ہوں۔
خواجہ وحید۔ آج کل علاج انگریزی ہے یا یونانی؟
علامہ۔ ڈاکٹری علاج میں مجھے کچھ بھروسہ نہیں ہے علاج کی کوئی سائنس نہیں ہو سکتی چونکہ زندگی کی کوئی سائنس نہیں ہے۔ اس چیز کی سائنس کیسے ہو سکتی ہے جس کی حقیقت ہی معلوم نہیں ۱؎

ث

راوی۔ عطیہ فیضی لکھتی ہیں کہ یکم جون ۱۹۰۷ء کو میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر پکنک کیلئے کیمبرج گئی اس پکنک کا انتظام دریا کے کنارے ایک درخت کے نیچے کیا گیا تھا اور اس موقع پر بہت سے نامی فضلاء جمع تھے گفتگو ادھر ادھر کے

۱؎ نقوشِ اقبال ۱۴۳۔

معاملات پر ہوتی رہی اسے فلسفیانہ رنگ دینے کی غرض کا اظہار کیا اور جب بحث نے غیر واضح رنگ اختیار کر لیا تو آرنلڈ نے اقبال کی طرف جو ابھی تک چپ بیٹھے تھے رُخ کیا۔

آرنلڈ۔ مسٹر اقبال! زیرِ بحث مسئلہ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

اقبال۔ زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کی ۱؎

٭

راوی دو قرآن کے مصنّف ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ شریکِ محفل تھے۔ پوچھا

برق۔ عقل کی انتہا کیا ہے؟

علامہ۔ حیرت۔

برق۔ عشق کی انتہا کیا ہے؟

علامہ۔ عشق کی کوئی انتہا نہیں۔

برق۔ تو پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے؟

ع تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

علامہ۔ (مسکرا کر) دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھیئے جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے کہ میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔

٭

۱؎ اقبال از عطیہ بیگم۔

راوی۔ ایک بار رشید احمد صدیقی سے تاریخ اسلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔

رشید صدیقی۔ ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے اسلام عرب کی سرزمین پر کیوں نازل ہوا؟

علامہ۔ عرب کے سفر نصیب و صحرا گرد بدوی کبھی متمدن نہیں ہوئے تمدن و تہذیب بالآخر اُمتوں کے زوال کا باعث ہوتی ہے اس لئے اسلام کی امانت کسی ایسی قوم یا سرزمین کو نہیں سونپی جا سکتی تھی جو تمدن کے لائے ہوئے عیش و عشرت کا شکار ہو سکتی چنانچہ عرب سے باہر مسلمان جب کبھی زوال کی زد میں آئیں گے روشنی حرارت اور حرکت حاصل کرنے کیلئے عرب کے ریگزار اور اس کے سخت جان اور سخت کوش بادیہ پیمائی کی طرف رجوع کریں گے[1]

٭

راوی۔ اعجاز احمد کہتے ہیں کہ علامہ نئی نسل کے روحانی اضطراب کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔

علامہ۔ فرمایا۔ جرمنی کے مایۂ ناز شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر نوجوان طبقہ کے روحانی اضطراب اور دبی بے چینی کو محسوس کر کے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔ (Art Stile has truth)
اس وقت دنیائے اسلام کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمانوں کیلئے وہی ہے

[1] ذکر اقبال ۲۴۷۔

جو گوئٹے نے دیا تھا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے آرٹ
کی جگہ ریلیجن رکھ دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ میں اطمینان
و مسرت ضرور ہے گو قوت نہیں مذہب میں اطمینان اور قوت
دونوں چیزیں ہیں۔ ؎۱

*

راوی۔ مارچ ۱۹۳۸ء کے تیسرے ہفتے میں علامہ کا ایلوپیتھک
(ڈاکٹری) علاج بھی شروع ہو چکا تھا۔ چودھری محمد حسین اور
حکیم محمد حسن قرشی دوا اور دعا دونوں کی اہمیت اور افادیت پر
اظہار خیال کر رہے تھے؛

علامہ۔ طبیب جب نسخہ تجویز کرتا ہے تو سرنامے پر ہوالشافی
ضرور لکھتا ہے ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا۔ بظاہر یہ ایک رسم ہے ایک
معمول یا روایت لیکن اِسے کچھ بھی کہیے یہی مظاہر ہیں کسی تہذیب
کی حقیقی روح، مزاج اور ایمان و یقین کے، یوں ہی پتہ چلتا
ہے کہ کسی قوم کا تصور انسان، کائنات اور خالق کائنات کے
بارے میں کیا ہے یوں ہی اس کی گردش حیات متعین ہوتی اور
جذبات و احساسات ایک مخصوص رنگ اختیار کرتے ہیں یوں ہی
اس کی سیرت و کردار ایک جداگانہ نصب العین پر مرکوز ہو
جاتی ہے۔

اِسے محض رسم معمول یا روایت نہ کہتے ان باتوں

؎۱ روزگار فقیر ۱۸۳۔

کا تعلق زندگی سے بہت گہرا ہے یہی باتیں ہیں جن سے قوموں کے ذوقِ حیات اور تہذیب و ثقافت کی ترجمانی ہوتی ہے جب تک کوئی قوم اپنے نصب العین پر قائم رہتی ہے اپنی روایات کو زندہ رکھتی اور اپنے اصل اصول سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ عوام بے راہ نہیں ہونے پاتے خواص ان کی رہ نمائی کرتے ہیں قوم کے وجودِ ملی کو تقویت پہنچتی ہے اور وہ اپنی ترقی اور کامرانی کی منزلوں میں بامید و اعتماد آگے بڑھتی بلکہ دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچتی ہے افسوس ہے مسلمان اپنے اصل الاصول سے دور ہٹ گئے [1]

ث

راوی۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۸ء کی شام نذیر نیازی حاضر ہوئے دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔

نیازی۔ مزاج کیسا ہے؟

علامہ۔ فوری موسمی تغیرات کا بڑا ناگوار اثر پڑتا ہے۔ دواؤں کا بھی طبیعت کی مناسبت اور عدمِ مناسبت سے بڑا تعلق ہے اس سلسلے میں ہماری طب کی روش، فطرت کے عین مطابق ہے کسی ایک دوا ہی کو لے لیجئے مثلاً خمیرہ گاؤزبان کہ سادہ بھی ہے اور معتدل بھی، جواہر والا اور شاید اسی قسم کا کوئی اور مرکب بھی اور یہ سب اس لئے کہ طبائع مختلف ہیں۔ مزاج کا اختلاف ایک حقیقت ہے مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے [2]

---

[1] نقوشِ اقبال ۱۶ - [2] اقبال کے حضور ۳۹۱

راوی۔ علامہ کی وفات سے کچھ دن پہلے صوفی تبسم خدمت میں حاضر تھے۔

علامہ۔ صوفی، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کیلئے فارسی میں کون سا لفظ ہے۔

صوفی تبسم۔ قبلہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟

علامہ۔ آپ فارسی پڑھاتے ہیں نا!

صوفی تبسم (دو ایک لفظ پیش کرتے ہیں۔

علامہ۔ یہ پہلے سے میرے ذہن میں ہیں میں زیادہ موزوں لفظ چاہتا ہوں ایک ایسے دماغ کیلئے تشبیہہ کی ضرورت ہے جس کا ظاہر عارضی طور پر شگفتہ نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر گندگی بھری ہوتی ہے، ایک رباعی لکھنا چاہتا ہوں اسی لفظ کی تلاش ہے۔

ہماری قوم کے اکثر اصحاب فکر کے دماغوں کی یہی کیفیت ہے۔ [۱]

ﭖ

راوی۔ ایل لڈوگ نے اپنی کتاب نپولین بونا پارٹ میں لکھا ہے کہ نپولین کا ملازم رستم بن رضا اس کے مطالعہ کیلئے روز صبح بہت سی کتابیں لے آتا تھا۔ اور شام کو وہ سب واپس لے جاتا تھا اس واقعہ کا ذکر تھا۔

---

[۱] اقبال کے حضور۔

وحیدالدین۔ حیرت ہے نپولین دن بھر میں اتنی کتابیں کیسے پڑھ لیتا تھا؟

علامہ۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں میں خود تھوڑے سے وقت میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالتا ہوں

اصل بات یہ ہے کہ جب انسان کا مطالعہ بہت وسیع ہو جاتا ہے تو وہ بہت سی باتوں کو جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور جنہیں پڑھنا غیر ضروری ہوتا ہے نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے اور صرف وہی حصے پڑھتا ہے جن میں کوئی نئی بات بیان کی گئی ہو۔۔۔۔ ایسی کتاب تو کہیں صدیوں میں لکھی جاتی ہے جو شروع سے آخر تک اس طرح ـــ بالاستیعاب پڑھنے کے لائق ہو کہ اس کا ایک لفظ بھی چھوٹنے نہ پائے ۱؎

٭

راوی۔ حالی کا ذکر ہو رہا تھا۔

وحیدالدین۔ آپ کے شکوہ سے پہلے مولانا حالی نے بھی تو شکوہ ہی لکھا تھا۔

علامہ۔ ہاں! مسدسِ حالی کو شکوہ ہی کہنا چاہیئے لیکن وہ صرف شکوۂ ہند تھا۔ ۲؎

٭

۱؎ ماہ نو اقبال نمبر ص ۳۶۶۔ ۲؎ روزگار فقیر ص ۱۸

راوی۔ سلطان شہید کا تذکرہ تھا۔ فقیر سید وحید الدین بھی موجود تھے۔

وحید الدین ایک بڑے افسر نے اپنے کتے کا دیدہ و دانستہ نام ٹیپو رکھا ہے اور اس کو اسی نام سے بلاتا ہے۔

علامہ۔ انگریز کو تو اس مردِ مجاہد کا مضحکہ اڑانا ہی ہے سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود بعض مسلمان بھی اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں۔
ٹیپو سلطان کی عظمت کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی وہ مذہب ملت اور آزادی کیلئے آخر دم تک جنگ کرتا رہا یہاں تک کہ اسی نیک مقصد کی راہ میں شہید ہو گیا [1]

☆

راوی۔ کشمیر کی زبوں حالی زیر بحث تھی۔

یکے از حاضرین۔ کشمیر کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کشمیریوں کی غربت اور جہالت ہے۔

علامہ۔ غربت و جہالت، قوت و ایمان حریت کی راہ میں کبھی سدِ راہ نہیں ہو سکے اور نہ ہوں گے۔ ہم تو اُمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں مسلمانوں کیلئے غربت و جہالت کی آڑ لینا اس کی روحانی کمزوری کی دلیل ہے [2]

☆

---

[1] روزگارِ فقیر ص ۶۸ ۔ [2] ماہِ نو اقبال نمبر ص ۲۶۱

راوی۔ نصر اللہ خان کے ایک عزیز دوست دہریہ ہو گئے تھے وہ انھیں لے کے علامہ کے پاس پہنچے۔

نصر اللہ خان۔ میرے یہ دوست خدا کے وجود سے منکر ہیں آپ انھیں سمجھائیں۔

علامہ۔ (مسکرا کر) جسے خدا نہ سمجھا سکا اسے میں کیا سمجھاؤں گا۔

ٌ

راوی۔ ۱۹۳۵ء میں اُردو کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بابائے اُردو مولوی عبد الحق ملاقات کیلئے علامہ کے پاس بھی گئے

مولوی عبد الحق۔ تجویز یہ ہے کہ ہر صوبے ہر علاقے اور دیسی ریاستوں میں اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ سارے ہندوستان میں اردو کی اشاعت کا جال بچھا دوں۔

علامہ۔ صرف ہندوستان میں ؟

ٌ

راوی۔ ۱۹۲۴ سے ۱۹۲۷ء تک اسلامیہ کالج کے پروفیسر عبد الحمید اکثر شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ایک روز یہ گفتگو ہوئی۔

عبد الحمید۔ ڈاکٹر صاحب، انگلستان میں ذبیحہ کا مسئلہ کیسے حل کیا آپ نے ؟

علامہ۔ جب میں انگلستان گیا تو میں نے پروفیسر آرنلڈ سے یہ

یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام کسی ایسے گھر میں کرایا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یوروپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں چنانچہ ایک یہودی گھرانے میں میری رہائش کا انتظام کروا دیا گیا ان لوگوں میں بظاہر بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی شریعت کی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہوجاتا تھا۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لئے بھی پیغمبر ہیں اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں وغیرہ لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل ان لوگوں سے کھٹا ہوگیا۔

عبدالحمید۔ کیوں کوئی خاص بات ہوئی؟

علامہ۔ ہاں مجھے اتفاق سے معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے سے منگاتا تھا یہ لوگ دکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

عبدالحمید۔ یہودیوں کا لالچ اور دولت کا عشق تو ضرب المثل ہے۔

علامہ۔ اس کا مجھے عملی تجربہ ہوا (۱)

☆

راوی۔ اسلامیہ کالج کے پروفیسر عبدالحمید حاضر خدمت تھے ایشیا اور یوروپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا ایشیا

---

(۱) اقبال کے چند جواہر ریزے ص ۱۲۔

اور یوروپ کی عورتوں میں جو فرق ہے اس کی بات چھڑی تو پروفیسر عبدالحمید نے پوچھا۔

عبدالحمید۔ ڈاکٹر صاحب آپ انگلستان اور جرمنی دونوں ملکوں میں رہے ہیں ان دو ملکوں کی عورتوں میں بھی کوئی فرق ہے۔

علامہ۔ جی ہاں، بہت واضح فرق ہے

عبدالحمید کیا؟

علامہ۔ انگریز عورت میں وہ نسائیت اور بے ساختگی نہیں جو جرمن عورت میں ہے جرمن عورت ایشیائی عورت سے ملتی جلتی ہے اس میں محبت کی گرمی ہے انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں۔ انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے۔

عبدالحمید۔ آپ کے اس خیال کی تصدیق مسٹر سٹیڈ کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے۔

علامہ۔ کون سٹیڈ؟ انگریزی رسالے ریویوز کے ایڈیٹر ڈبلیو ٹی سٹیڈ؟

عبدالحمید۔ جی ہاں وہی سیاست دان اور صحافی دانشور۔ انھوں نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ جرمن عورتیں درحقیقت پردے میں ہیں انگریز اور امریکن عورتوں کے مقابلے میں۔

راوی۔ یہ قول پہلی جنگ عظیم کے پہلے کا ہے [۱]

---

[۱] اقبال کے چند جواہر ریزے ص ۳۸۔

راوی۔ ایک بار محفل میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر چل پڑا جن سے مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت بے جگری، اور بے مثال سرفروشی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

یکے از حاضرین۔ اب آپ کچھ فرمائیے

علامہ۔ مسلمان ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کرتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔

وحید الدین۔ **اشدا و علی الکفار**

٭

راوی۔ ۲۵ جون ۱۹۳۵ء سے عبد الرشید طارق، جاوید اقبال کے ٹیوٹر کی حیثیت سے تقریباً روزہی جاوید منزل جاتے تھے جاوید کو پڑھا کر علامہ کی صحبت میں بیٹھتے۔ ایک شام یہ گفتگو ہوئی۔

عبد الرشید۔ ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے کہ حافظ صحیح معنوں میں صوفی نہ تھے آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ خواجہ حافظ حقیقت میں صوفی نہ تھے ثبوت کیلئے مولانا جامی کی کتاب نفحات الانس دیکھنا چاہیئے۔ صوفیوں کی اصطلاح جاننے اور زبان کے استعمال سے کوئی صوفی نہیں بن جائے گا جس طرح گاؤن پہننے سے کوئی پادری نہیں بن جاتا۔

حافظ کی تن آسانی، حجرہ نشینی اور جبر و قدر کے غلط نظریے نے بڑے تباہ کن نتائج پیدا کئے۔ صوفی عمل

کی تلقین کرتا ہے اور یہ خواجہ حافظ کے یہاں مفقود ہے اس کا جو کچھ اثر ہندی مسلمانوں پر ہوا وہ ظاہر ہے۔

طارق۔ ہندی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں آپ کا وجدان کیا کہتا ہے؟

علامہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے نا اُمید نہیں ہوں مجھے یقین ہے کہ عنقریب ان میں کوئی رہبر شخصیت نمودار ہوگی۔

طارق۔ فقر سے آپ کی کیا مراد ہے؟

علامہ۔ فقر سے میری مراد افلاس اور تنگدستی نہیں بلکہ استغنا اور دولت سے لاپرواہی ہے۔ دولت جوہر مردانگی کی موت ہے اس سے جرأت اور بہادری جاتی رہتی ہے۔

راوی ؎ میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری [1]

٭

راوی۔ آبادی کے موضوع پر مشہور ماہر معاشیات مالتھس کے نظریات زیر گفتگو تھے

حکیم قرشی۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان مرض پر غالب آگیا تو کیا اس طرح وہی حالات پیدا نہیں ہو جائیں گے جن کیطرف مالتھس نے اشارہ کیا ہے دکثرتِ آبادی سے کرہ ارض

[1] ملفوظاتِ اقبال۔

کا ناکافی ہو جانا)

علامہ۔ اس صورت میں انسان ستاروں کا رُخ کر سکتا ہے ستاروں میں پہنچنا ناممکن تو نہیں۔

راجہ حسن اختر۔ اس خلائے محض سے انسان کا گذر کیسے ہوگا جو ہماری زمین اور دوسرے سیاروں کے درمیان واقع ہے

علامہ۔ یہ امر مشکل ضرور ہے لیکن فاصلوں کی تسخیر سرے سے ناممکن نہیں اس کا کوئی نہ کوئی ذریعہ دریافت ہو جائیگا ایسا ذریعہ جو ابھی تک ہمارے چشم سے پوشیدہ ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے ایسا ہونا بہر حال ممکن ہے۔

نیازی۔ کیا دوسرے کروں میں آبادی ہے؟ یا ہو سکتی ہے؟

علامہ۔ اگر تمام اجرام سماوی اپنی مادی ترکیب میں یکساں ہیں تو زندگی کی نوعیت بھی یکساں ہو گی۔ لہٰذا اگر کوئی سیارہ آباد ہے تو کیا عجب وہاں ہم انسانوں سے ملتی جلتی کوئی مخلوق بستی ہو۔

جن کیا ہیں یہ جو سورہ جن کی تفسیر میں طرح طرح کی تاویلیں کی گئی ہیں اس میں جن کا اشارہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کی طرف تو نہیں؟ یا جن شاید وہیں سے آئے ہوں [1]

٭

راوی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کی شب حسب معمول چودہری

[1] اقبال کے حضور ۳۰۹

محمد حسین، حکیم محمد حسین قرشی، نذیر نیازی علامہ کی خدمت میں حاضر تھے اور تیمارداری میں مصروف دیوان علی علامہ کی پائینتی بیٹھا بدن دباتا رہا۔ چودھری محمد حسین کے اشارے سے اس نے کوئی کافی چھیڑ دی جس کا موضوع جبر و قدر تھا۔ علامہ محظوظ ہوئے پھر فرمایا۔

علامہ۔ شاعری کی اور بات ہے تصوف کا مقام بھی کچھ اور ہے اور یہ مسئلہ بھی بجائے خود کچھ اور کہ انسان مجبور محض ہے یا اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے لیکن اس قسم کے طرز خیال سے انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے

قوموں کے زوال میں اس قسم کے خیالات کو خوب خوب فروغ ہوتا ہے بلکہ اس قسم کے خیالات ہیں کہ جن کی اشاعت قوموں کے زوال و انحطاط کا سبب بنتی ہے۔

وہ چیز جسے ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے کیا شیطان لیکن مجھے تو یہ گوارا نہیں کہ اپنے گناہوں کی ذمہ داری شیطان پر رکھوں۔ شیطان کے وجود کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم گناہوں سے بچیں ہم پر گناہوں سے بچنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے شیطان بھی گناہوں کی ذمہ داری انسان ہی پر ڈالتا ہے شیطان بھی تو گناہوں سے بیزار رہتا ہے۔

نیازی جیسا کہ جاوید نامہ میں
نالۂ ابلیس ہے

ے اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ کہ از حکم من سر پر شافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوق ابا بیگانۂ
از شرارِ کبریا بیگانۂ

علامہ۔ جی ہاں ۱؎

ٹ

راوی۔ فقیر سید وحید الدین ابھی طالب علم تھے کہ ان کے والد سید نجم الدین انھیں علامہ کے پاس لے گئے۔

نجم الدین اسے تاریخی کتابوں کے مطالعے کا شوق ہے میں نے مشورہ دیا ہے کہ ابن خلدون ضرور پڑھے۔

علامہ۔ پوری کتاب نہیں، صرف "مقدمہ"

ٹ

راوی۔ علامہ کے دوست فقیر سید افتخار الدین کے صاحبزادے فقیر سید سراج الدین پی سی ایس ۱۹۳۰ میں منتخب ہوئے۔

سراج الدین۔ خدا کا شکر ہے کہ میں پی سی ایس میں کامیاب ہو گیا ہوں

علامہ۔ مبارک ہو مجھے یقین ہے تم اپنے فرائض محنت اور

۱؎ اقبال کے حضور ۳۰۹

دیانتداری سے ادا کرو گے۔ صرف محنت اور دیانت ہی
ترقی کی راہیں کھولتی ہے ۱؎

٭

راوی۔ گول میز کانفرنس کے زمانے میں علامہ لندن میں
ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی کے زیر علاج رہے تھے۔ وہ علامہ
کی حتی الوسع تواضع بھی بجالاتے تھے انھوں نے لندن سے
سیّد امجد علی کے توسط سے علامہ کے نام ایک پیغام بھیجا۔

امجد علی۔ لندن سے ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی کا ایک پیغام لایا
ہوں اجازت ہو تو عرض کروں۔

علامہ۔ جی۔

امجد علی۔ رحمت اللہ قریشی کہتے ہیں اگر ماں اولاد پیدا کرے تو
اقبال جیسی۔۔۔۔۔۔ ورنہ ہم جیسے لوگوں کے دنیا میں آنے
کا فائدہ۔

علامہ۔ (مسکرا کر) نہیں، قریشی میں بھی بہت سی خوبیاں
ہیں وہ مہمان نواز ہے جو پیغمبروں کا خاصہ ہے ۲؎

٭

راوی۔ جب علامہ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن
میں تھے تو انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن کے مصری صدر نے

۱؎ اقبال کے حضور ۳۹۶ ۔ ۲؎ روزگار فقیر ص ۸۳

آپ کو دعوت دی آپ نے نوجوانوں سے کہا ۔

علامہ ۔ میں نوجوانوں سے اپیل کروں گا کہ وہ دہریت اور مادیت سے دور رہیں پہلی عالمی جنگ مذہب اور مملکت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کے ظہور کا نتیجہ تھی اور بالشوزم بھی مذہب اور مملکت کی علیحدگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے

مذہب بے حد ضروری چیز ہے مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے ۔

ؐ

راوی ۔ قیامِ لندن کے دوران علامہ ایک کلب میں مدعو تھے ۔

انگریز خواتین ۔ ہمیں خاص پیغام دیجئے ۔

علامہ ۔ انگلستان کی عورتوں کا فرض ہے کہ آئندہ نسل کو دہریت اور مادیت کے چنگل سے بچائیں ۔

ؐ

راوی ۔ ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور کے فلسفہ کے ایک طالب علم محمد محمود دوسرے طلباء کے ساتھ علامہ سے اکتسابِ فیض کیلئے حاضر ہوئے

محمد محمود ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے ہمیں یقین ہے کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے لیکن ہمارا

دعویٰ تو یہ ہے کہ ہمارا نبی انسانیت کیلئے نمونہ ہے لیکن اگر قدرت
کے مظاہر نبی کیلئے مختلف ہوں اور ہمارے لئے مختلف
تو پھر نبیؐ نمونہ تو نہیں بن سکتا۔

علامہ۔ تم بالکل سچ کہتے ہو کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے
تھے بات یہ ہے کہ یہ واقعہ پڑھ کر تمہارا ذہن مختلف راستہ
پر منتقل ہو گیا ہے، تم الجھ کے رہ گئے ہو قدرت کے مظاہر
اور درختوں کے جھکنے میں۔
بھائی یہ واقعہ تو صرف عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ ان کی
آنکھ یہ دیکھتی تھی کہ درخت جھک رہے ہیں اس کا درختوں کے
جھکنے سے کوئی واسطہ نہیں اگر تمہیں حضرت عمرؓ کی آنکھ نصیب
ہو تو تم بھی دیکھو گے کہ دنیا ان کے سامنے جھک رہی ہے۔

راوی۔ عقل انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق [1]

☆

راوی۔ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ چودھری شفیع اور چند
دوسرے نوجوان علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

چودھری شفیع۔ ڈاکٹر صاحب! اب مسلمانوں کا کیا بنے گا؟

علامہ۔ تمہیں کیا فکر ہے، اللہ مالک ہے
آپ لوگوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ زمیندار ایک دفعہ جس

---

[1] سرگزشت اقبال ۳۶۲۔

زمین پر گندم بوتا ہے اس زمین کے ٹکڑے کو خالی چھوڑ دیتا ہے۔ صرف اس لئے کہ آئندہ سال وہ زیادہ فصل پیدا کر سکے، اسی طرح بعض زمینیں مردم خیز بھی ہوتی ہیں کبھی اس میں بڑے بڑے نامور لوگ پیدا ہوتے ہیں اور پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

بھئی یہ قانونِ قدرت ہے عربستان، افغانستان، ایران نے کیسے کیسے شاہ سوار پیدا کئے مگر اب کیوں پیدا نہیں ہو رہے صرف اس لئے کہ منشا ایزدی کے مطابق یہ زمینیں آرام کر رہی ہیں۔ اب "اوڑ " لگی ہوئی ہے دعا کرو کہ اللہ کا کوئی بندہ پیدا ہو اور ہم لوگوں کی نجات کا موجب بنے [1]

☆

راوی۔ میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں کے والد جسٹس میاں شاہ دین سے اقبال کے خاص تعلقات تھے۔ میاں بشیر احمد کو بھی علامہ سے نیاز مندی کا شرف حاصل تھا اکثر حاضرِ خدمت ہوتے رہتے تھے ان ملاقاتوں کا حال میاں صاحب نے اپنے مضمون "اقبال کی یاد" میں لکھا ہے ان ملاقاتوں کے اہم اقتباسات ایک مسلسل گفتگو کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں

میاں بشیر احمد والد مرحوم کی یاد میں ایک رسالہ ہمایوں نکالنے کی تیاری کر رہا ہوں اس کیلئے کوئی نظم لینے حاضر ہوا ہوں۔

[1] روزگارِ فقیر ص ۱۳۵

علامہ۔ تم رسالہ کیا نکالتے ہو، اردو کے رسالے تو نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں تم اردو لٹریچر کیلئے کوئی اور زیادہ مفید کام کرو۔

میاں بشیر احمد۔ مثلاً کیا؟

علامہ۔ تم فرانسیسی زبان سے واقف ہو، گارساں وناسی کی تصانیف کو اُردو میں منتقل کردو۔

میاں بشیر احمد۔ بجا ہے لیکن اس وقت میں ہمایوں کیلئے ....

علامہ۔ کچھ اشعار ہمایوں کے عنوان سے ذہن میں ہیں جب نظم مکمل ہوگئی بھیجدوں گا۔

میاں بشیر احمد۔ شکریہ ڈاکٹر صاحب مجھے یہ گلہ کرنے کی اجازت دیجئے کہ آپ نے فارسی میں کہنا کیوں شروع کر دیا ہے "فارسیاں گھر گالے" آپ نے سنا ہی ہو گا۔

علامہ۔ میری اردو بھی تو نری فارسی ہے۔

میاں بشیر احمد نہیں پھر بھی اردو لکھئے لے دیکھے ایک آپ ہمارے پاس ہیں وہ بھی فارسی میں لکھنے لگے تو نتیجہ کیا ہوگا؟

علامہ۔ شاعر کا خیال جس زبان میں بھی موزوں ہو جاتے وہ اسی میں کہے گا۔

میاں بشیر احمد ڈاکٹر صاحب یہ زمانہ اشتہاریت کا ہے پروپیگنڈے کا ہے، اشتہار، اشتہار ہر طرف اشتہار۔

علامہ۔ خدا کی طرف دیکھو وہ سب سے بڑا پروپیگنڈا کرنیوالا ہے
یہ کائنات ساری کی ساری اس کا پروپیگنڈا نہیں تو اور کیا ہے
ہزاروں لاکھوں بیشمار مظاہر ہیں۔
(مسکرا کر) تم پروپیگنڈا کو اتنا برا نہ سمجھا کرو۔

میاں بشیر احمد۔ ڈاکٹر صاحب! ٹیگور کی ہندوستان میں اور ہندوستان
سے باہر بڑی شہرت ہے۔ ٹیگور کے غیر ملکی دوروں نے ان
کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔
علامہ۔ ٹیگور عملی آدمی ہے اور اس کی شاعری امن و خاموشی
کا پیغام دیتی ہے ادہر میں میری شاعری میں جد و جہد کا ذکر
ہے۔ لیکن میں عملی آدمی نہیں ہوں

میاں بشیر احمد۔ ڈاکٹر صاحب! اس شعر میں کیا اشارہ ہے؟
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی
تین سو سال ہوئے تو جہانگیر کے ہاں میخواری کا دور دورہ
تھا۔
علامہ۔ نہیں، یہ شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی کی طرف
اشارہ ہے۔
(بحوالہ روزگار فقیر ۱۳۵)

میاں بشیر۔ افسوس ہے کہ قوم نے آپ کی پوری قدر نہ کی ورنہ بانگِ درا اور دوسری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بک جاتیں۔

علامہ۔ بکنے کے بارے میں یہ کہ قوم غریب ہے اور قدر کی بات یہ کہ جب کوئی غریب آدمی شہر سے آ کر میری مٹھی چاپی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ساری دنیا میری قدر کر رہی ہے۔

میاں بشیر۔ اپنے سیاسی لیڈروں کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے ان کی حرکتیں، ان کی سازشیں خون کے آنسو رلاتی ہیں۔

علامہ۔ یہ سب لوگ خودغرض ہیں اور ایثار نہیں کر سکتے لیڈر امیروں کی جماعت میں موجود ہی نہیں ہیں مسلمانوں کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہوں گے تم دیکھ لینا ایسا ہو کر رہے گا۔

ث

میاں بشیر۔ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیامِ مشرق کے پس منظر میں کوئی خاص مقصد تو آپ کے ذہن میں ہوگا۔

علامہ۔ ایشیائے قلب پر جمود کی ایک تہہ جمی ہوئی ہے میں اس کو توڑنا چاہتا ہوں۔

راوی۔ ۱۵ فروری ۱۹۳۸ء کی شام کو مسجد شہید گنج کی باتیں

ہو رہی تھیں اگر مسلمان قانون شکنی پر آمادہ ہو جائیں اور ہمارے ارباب سیاست قید و بند کی سختیاں گوارا کر لیں تو کیا اس سے ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کی آنکھیں نہیں کھل جائینگی؟

علامہ۔ کیوں نہیں میری رائے میں قانون شکنی ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے قانون شکنی کے نتائج قوم کیلئے نہایت اچھے ہوں گے لیگ کو بھی اپنی کمزوری کا احساس ہے۔

میں تو جناح کو یہی مشورہ دوں گا کہ قانون شکنی کی تحریک ہی ہماری پاس بیدلی کا واحد علاج ہے بلکہ میری صحت نے اجازت دی تو میں خود بھی اس میں شرکت کروں گا۔

نیازی۔ تحریک خلافت غلط قیادت سے ناکام تو ہوئی لیکن اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں میں ایثار و قربانی کا غیر معمولی جذبہ اور قوت عمل موجود ہے۔

علامہ۔ مسلمان اب بھی مردہ نہیں ان میں علمی اور عملی ہر طرح کی صلاحیتیں موجود ہیں، ضرورت ہے ان سے کام لینے کی۔

نیازی۔ لیکن سردست تو یہ حالت ہے کہ ہم سیاسی لحاظ سے بھی مردہ ہیں اور تہذیب و تمدن میں بھی دوسروں سے دب رہے ہیں ہم میں زندگی پیدا ہوگی تو کیسے؟

عام خیال تو یہی ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں اندلس اور مغلیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے

یہی کچھ آج روس میں ہو رہا ہے جہاں اسلام برائے نام باقی رہ گیا ہے اندیشہ ہے ہندوستان میں بھی یہی کچھ نہ ہو۔

علامہ۔ اندلس اور مغلیہ ہند میں مسلمانوں کی تباہی اُمت کے ایک جز کی تباہی تھی اُمت کا وجود تو بہر حال قائم ہے البتہ یہ ٹھیک ہے کہ قومیں پیدا بھی ہوتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں قرآن پاک کا بھی یہی فیصلہ ہے (الکل امۃ اجل) قومیں پیدا ہوتی اور مر جاتی ہیں۔ یہ ایک آسان سی بات ہے جو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن بعض اُمتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم کی ہستی تو قائم رہتی ہے لیکن بظاہر یوں نظر آتا ہے جیسے اس کا وجود ختم ہو گیا حالانکہ صورت یہ ہوتی ہے کہ بسبب زوال و انحطاط اس کے قوائے علم و عمل مردہ ہو جاتے ہیں قرآن پاک نے اس حالت کو بھی موت سے تعبیر کیا ہے۔

نیازی۔ قرآن مجید میں آیا ہے کیف تحی الموتی اور انی یحیی ھذا اللہ - یہی قوموں کی بعثت ثانیہ ہے ؂۱

علامہ۔ لیکن یہ موت زندگی سے بدل سکتی ہے بشرطیکہ ہم اپنے اندرونِ ذات میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کریں یعنی اس مقام پر واپس آجائیں جس سے ہم چلے تھے۔

یاد رکھو دنیا کی کوئی قوم اپنا اصول قومیت چھوڑ کر زندہ

؂ اقبال کے حضور ۲۰۶۔

نہیں رہ سکتی۔ موت اسی وقت وارد ہوتی ہے جب قومیں اپنے اصولِ زندگی سے منحرف ہو جائیں۔

عالمِ اسلام، اسلام کی بدولت وجود میں آیا اس کی ہستی اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام ہی کی بدولت اس میں پھر زندگی پیدا ہوگی۔

قانونِ قدرت یہ ہے کہ اگر کسی قوم کو زندگی کی آرزو ہے تو اُسے زندگی دی جائے۔ (تھوڑے توقف کے بعد) تمہیں معلوم ہے قرآنِ پاک کی تعلیم اس بارے میں کیا ہے؟

نیازی۔ میرا ذہن بنی اسرائیل کی نشاۃ ثانیہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے بنی اسرائیل کو زندگی ملی، بیت المقدس پھر سے تعمیر ہوا قید کی زندگی آزادی سے بدل گئی۔

علامہ۔ یہ صحیح ہے لیکن بنی اسرائیل کو زندگی ملی تو ان کے اس ایمان کی بدولت کہ ہماری ایک تقدیر ہے۔ کیا اسلام کی بھی کوئی تقدیر ہے؟

نیازی کیوں نہیں؟

علامہ۔ تو پھر سمجھ لو اسلام بھی ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت ہمیشہ قائم رہے گی لہٰذا باوجود زوال و انحطاط عالمِ اسلام ہی پھر زندہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔

☆

راوی۔ ممتاز حسن علامہ کی خدمت میں حاضر تھے ہندو معاشرہ

میں ذات پات کے بندھنوں کا تذکرہ چھڑا ہوا تھا۔

ممتاز حسن۔ ہندو سماج نے اپنے آپ کو کمتری اور برتری کے طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے یہ بڑی فرسودہ روایت ہے۔

علامہ۔ ہوں۔

ممتاز حسن۔ ذات پات اور نوع انسانی کے ارتقاء کا کوئی تعلق ہے۔؟

علامہ۔ اگر غور سے دیکھئے تو ان مختلف ذاتوں کا تدریجی اقتدار ساری نوع انسانی کی تاریخ میں نظر آئے گا۔ ابتدائی دور میں مختلف قوموں اور قبیلوں میں ان لوگوں کی حکومت نظر آتی ہے۔ جو دوسروں سے زیادہ دانش مند اور تجربہ کار تھے سحر و طلسم کا مظاہرہ اور مذہبی رہ نمائی انھیں سے متعلق تھی یہ قوم کے معمر رہنماؤں اور پروہتوں کی حکومت کا دور تھا۔ اسے برھمنوں کی حکومت کا دور کہہ لیجئے۔

اس کے بعد کئی صدیاں نوع انسانی کی تاریخ میں ایسی گزری ہیں جب تلوار چلانے والوں نے اقتدار سنبھالا یہ بادشاہوں کی حکمرانی کا دور ہے جسے کشتریوں (چھتریوں) کی حکومت کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔

اس کے بعد ہمارا اپنا زمانہ ہے اور یہ ہے ویشوں کی حکومت .... تم دیکھو گے کہ آج کل دنیا میں تجارت اور تجارتی منافع کی اہمیت ہے بڑے بڑے ملک التجار سیاسیات عالم پر اتنا اثر رکھتے ہیں کہ امن و جنگ کا انحصار بڑی حد تک

انہی کی مرضی پر ہے۔

ممتاز حسن۔ اگر تاریخ عالم کے متعلق آپ کی اس دل چسپ تشریح کو تسلیم کر لیا جائے تو آئندہ زمانے میں کس طبقے کی حکومت ہونی چاہیئے۔

علامہ۔ کیا آپ کے سوال کا جواب مزدور طبقہ نہیں دے رہا ہے (۱)

ش

راوی۔ ایک روز ممتاز حسن شریک گفتگو تھے میکس پلانک کے نظریہ پر بحث ہو رہی تھی۔

ممتاز حسن جدید سائنس کہتی ہے کہ جب بہت سے برقیے مل کر حرکت کرتے ہیں تو ان کا عمل یکساں ہوتا ہے یعنی اس عمل کے نتائج یکساں ہوتے ہیں۔

لیکن جب ایک برقیہ انفرادی حیثیت میں مصروف عمل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ یکساں حالات میں اور یکساں اسباب کے پیش نظر اس برقیے کا ردِ عمل یکساں ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسباب و نتائج کے جس رشتے کی بنیاد پر سائنس کا سارا کارخانہ قائم ہے خود وہ رشتہ ہی کمزور نظر آتا ہے اور کائنات کی بنیادی ساخت میں کچھ غیر متعین عناصر ایسے ہیں جن کے عمل کے بارے میں کوئی پیشگی اندازہ نہیں۔

---

(۱) روزگار فقیر ۹۹۔

علامہ۔ اب سائنس دانوں پر وہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے جس کو قرآن کریم نے مختصر طور پر یوں بیدار کیا ہے۔

انّ اللہ علیٰ کل شیٔ قدیر

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے

ممتاز حسن۔ عجیب بات ہے اب تک خلا میں روشنی سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی چیز دریافت نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی بجائے خود طبیعاتی نقطہ نظر سے قادرِ مطلق ہے

علامہ۔ کیا تمہیں قرآن کی وہ آیت یاد نہیں

اللہ نور السمٰوٰت والارض

اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے

ث

راوی۔ ایک روز ممتاز حسن علامہ کے ہاں گئے تو وہاں ایک غیر معمولی قسم کے سادھو کو دیکھا سر منڈا ہوا داڑھی مونچھیں صاف گیروا لباس مگر بہت قیمتی کپڑے کا علامہ سے گرمجوشی سے بحث کر رہا تھا اور علامہ کو "گروجی" کہہ کر خطاب کرتا تھا جب یہ شخص اُٹھ کر چند منٹ کیلئے باہر گیا تو ممتاز حسن نے پوچھا

ممتاز حسن۔ یہ کون ہیں ؟

علامہ۔ مشہور سوامی جی ہیں میرے پاس اکثر آتے ہیں بڑے بڑے راجے مہاراجے ان کے چیلوں میں شامل ہیں۔

(سوامی جی واپس آ کر بیٹھ جاتے ہیں)

سوامی۔ کیوں جی کیا کوئی روشنی اور اندھیرا اکٹھے ہو سکتے ہیں؟

علامہ۔ ہاں۔

سوامی۔ وہ کیسے؟

علامہ۔ وقت میں۔ (۱)

÷

راوی۔ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت زیر بحث تھا ممتاز حسن نے کائنات کے صورت و شکل کا سوال اٹھایا۔

علامہ۔ کائنات کی شکل وصورت کا مسئلہ پرانے مسلمان ریاضی دانوں کے بھی پیش نظر تھا اور انھوں نے اس مضمون پر بڑا غور وخوض کیا۔

ممتاز حسن۔ مثلاً

علامہ مثلاً ایک اندلسی مسلمان ریاضی دان الوالعالی جس کی تحقیقات آئن سٹائن کی تحقیق سے مشابہ تھیں آئن سٹائن کا خیال ہے کہ کائنات کی ساخت کم وبیش مدور ہے ہمارے مسلمان ریاضی دان کی تحقیق یہ تھی کہ کائنات مخروطی شکل کی ہے۔

ممتاز حسن آئن سٹائن کا نظریہ زمان یہ ہے کہ وقت کائنات کی چوتھی بعد ہے۔

علامہ۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں یوروپ کے ریاضی دانوں

(۱) روزگار فقیر ۱۰۱۔

میں جس شخص کے نظریات میرے نزدیک سب سے زیادہ دقیق ہیں وہ دائل ہے ۔ ۱

٭

راوی ۔ ایک دن جوتش کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی ۔

ممتاز حسن ۔ جوتش علم النجوم کوئی علم معلوم نہیں ہوتا ویسے بھی انسان کی زندگی کی جزئیات پر ستاروں کی گردش کا اثر قرین قیاس نہیں ۔

علامہ ۔ غالباً عام طور پر یہ صحیح ہے لیکن بڑی بڑی انسانی ہستیوں پر ستاروں کی گردش کا اثر ہوتا ہے اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ جلیل القدر انسانوں کی زندگی ان سے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور قبول کرتی ہے ۔ (۱)

٭

راوی ۔ قوموں کے عروج و زوال پر گفتگو ہو رہی تھی ۔

ممتاز حسن ۔ حاکمیت اور محکومیت کا قوموں کے کردار پر کیا اثر پڑتا ہے ؟

علامہ ۔ خدا جب فرد یا قوم کو حکومت سونپتا ہے تو وہ انھیں موقعہ دیتا ہے کہ اپنی سیرت میں ایک خاص قسم کے تدبر، عدل اور اخلاق کے اوصاف پیدا کریں چونکہ مروّت، علو ہمت، فراخدلی مردم شناسی اور فیض و بخشش کی اعلیٰ خصوصیات کے بغیر ایک

---

۱ روزگار فقیر ۱۰۶ ۔

شخص صحیح طور پر حکمران بن ہی نہیں سکتا اس سے ظاہر ہوا
خدا نے حاکمیت میں تعمیر کردار اور تربیت سیرت کے جو مواقع
رکھے ہیں وہ محکومیت میں نہیں ہیں ۔

ٍ

راوی ۔ ایک روز علامہ معلم کے کردار پر گفتگو کر رہے تھے
ممتاز حسن کو مخاطب کر کے فرمایا ۔

علامہ ۔ ایک بڑے استاد اور معلم کی حیثیت سورج کی سی
ہے جو اپنی روشنی اور حرارت ہر چیز تک بے کم و کاست لے
جاتا ہے لیکن اس کا اثر مختلف چیزوں پر مختلف ہوتا ہے
کسی پر اچھا کسی پر برا ۔ آفتاب کی روشنی اور گرمی سے پودوں
کی نشو و نما ہوتی ہے انسانی جسم قوت و توانائی حاصل کرتا ہے
لیکن بوسیدہ چیزیں پہلے کی نسبت زیادہ بوسیدہ اور فاسد ہو
جاتی ہیں ۔

گویا جس چیز میں اچھی یا بری جو صلاحیت ہوتی ہے
اس کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ منظر عام پر آ جاتی ہے ۔ اس
اصول کے تحت کسی بڑے استاد کے شاگردوں کا یکساں ہونا
ضروری نہیں ہے ایک شخص میں جو صلاحیت ہوگی استاد کی توجہ
اور کشش سے اسی میں ترقی ہوگی ۔

ممتاز حسن ۔ اس وقت کوئی خاص مثال آپ کے ذہن میں ہے ؟

علامہ ۔ مثلاً امام موفق نیشاپوری ان کے تین اکٹھے پڑھے ہوئے

شاگرد زندگی میں بالکل مختلف راہوں پر نکل گئے۔ ان میں ایک عمر خیام، دوسرا حسن بن صباح اور تیسرا نظام الملک طوسی تھا۔[1]

☆

راوی۔ میاں محمد افضل حسین نے بی ایس سی میں علامہ اقبال سے انگریزی پڑھی تھی اس زمانے کی یادداشتیں انھوں نے قلم بند کی ہیں ان میں علامہ سے یہ گفتگو بھی شامل ہے۔

افضل حسین۔ آپ کی ایک مشہور غزل کا مشہور تر شعر یہ ہے

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

علامہ۔ جی۔

افضل حسین۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مغربی تہذیب پر تنقید کرتے وقت خاص طور پر یہ شعر لکھتے وقت آپ کے ذہن میں کوئی خاص واقعہ یا مشاہدہ تھا؟ اس شعر میں یقین کی جو فضا ہے اس کا راز کیا ہے؟

علامہ۔ قیام یورپ کے دوران میں نے وہاں کے عام آدمی کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تہذیب زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔

بعض والدین اپنے بچوں کا بیمہ کرواتے اور انھیں بھوکا مرنے دیتے ہیں تاکہ بیمہ کی رقم وصول کر سکیں یہ انسانیت

---

[1] روزگار فقیر ۱۰۷ - ۱۰۰

کی ذلت و تحقیر کی انتہا ہے۔

(تھوڑے وقفہ کے بعد)

جہاں روپے پیسے کا سوال ہو وہاں انگریز کی ذہنیت اور ہندو کے بنیا پن میں سر مو فرق نہیں رہتا۔ انگریز پیدائشی طور پر جوئے باز اور قمار باز ہے معمولی سے معمولی خدمت کے صلے میں بھی وہ انعام و اکرام کا خواہاں رہتا ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا میں لندن جارہا تھا گاڑی میں کئی مسافر تھے اور میرے سامنے تاش کھیلی جارہی تھی میں نے دیکھا کہ دو پارٹنرز ہیں جو جیتتے ہی جاتے ہیں انھوں نے ہر مسافر کو کھیلنے کی دعوت دی اور کوئی بیس پونڈ تھیا لئے۔ میں انھیں غور سے دیکھنے لگا تو ان کی چالوں کو بھانپ گیا۔ میں نے جوا کبھی نہیں کھیلا مگر جب انھوں نے مجھے بھی دعوت دی تو تیار ہو گیا چنانچہ میں کھیلا اور لندن پہنچتے پہنچتے ان سے بیس کے بیس پونڈ جیت لئے جب میں گاڑی سے اترا تو وہ دونوں قمار باز میرے دائیں بائیں ہو گئے خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں کرنے لگے کہ میں کسی طرح جیتی ہوئی رقم ان کے حوالے کر دوں اپنی غریبی کا دکھڑا روئے اور ہندوستانیوں کی فراخدلی کی تعریفیں کرنے لگے مگر میں نے جب یہ کہا کہ تم کھیل میں دغا اور فریب کاری سے کام لیتے ہو۔ میں پولیس میں تمہاری رپورٹ کروں گا تو وہ فوراً نو دو گیارہ ہو گئے (۱)

---

(۱) ملفوظات اقبال ۳۱۴

راوی۔ جاوید منزل میں ایک بار عبدالرشید طارق علامہ کی خدمت میں حاضر تھے عبدالرشید نے علامہ کا یہ شعر پڑھا۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

علامہ نے نماز کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

علامہ۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں خدا کے حضور سر بسجود ہونے میں ایک کیف اور سرور حاصل ہوتا ہے لیکن بعض مقامات میں اس کا الٹ، میں صبح کی نماز حتی الامکان قضا نہیں ہونے دیتا۔ اور مجھے اس کی ادائیگی میں خاص لطف اور سکون میسر ہوتا ہے لیکن جب تپھلے دنوں افغانستان گیا تو وہاں جب نماز فجر ادا کی تو مجھے قطعاً سرور حاصل نہ ہوا اور اک خلا سا محسوس کیا مجھے سخت حیرانی ہوئی جب اپنے رفیق محترم سید سلیمان ندوی سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی انہی احساسات کی تائید کی اور کہا کہ نماز میں باوجود کامل خضوع کے پہلا سا سرور نہیں ملا۔

ث

راوی۔ اجتہاد، تشکیل فقہ جدید کی ضرورت عمر بھر علامہ کو محسوس ہوتی رہی۔ صوفی غلام مصطفےٰ نے یہ موضوع چھیڑا۔

صوفی تبسم اجتہاد کے بارے میں آپ نے اپنے کسی مضمون کا ذکر کیا تھا

علامہ۔ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا

مگر دورانِ تحریر مجھے اس کا احساس ہوا کہ یہ مضمون بہت تفصیلی بحث چاہتا ہے اب میں انشاءاللہ اسے ایک کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا جس کا عنوان ہوگا۔

(اسلام میرے نقطہ نظر سے)

ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کیلئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکتی۔

صوفی تبسم۔ گویا فقہ کی تشکیل جدید اس وقت سب سے اہم ضرورت ہے۔

علامہ۔ یقیناً۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جیورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔

زمانہ حال کے فقہا یا زمانہ کے میلان طبیعت سے

بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا۔ جو سرے سے احکام قرآن ہی کا منکر ہے ہندوستان میں عام فقی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ امام ابوحنیفہ کی نظیر ناممکن ہے۔

غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا (۱)

ث

راوی۔ گفتگو عالم اسلام کے اخلاقی اور ذہنی انحطاط کی ہو رہی تھی۔

علامہ۔ ہماری روحانی حالت اچھی نہیں مسلمان کیا ہے راکھ کا ڈھیر۔

ے بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

ث

نیازی۔ ہم نے آنکھ کھولی تو لایعنی روایات بدعات اور توہمات

(۱) ملفوظات اقبال ۳۱۸

کا زور تھا لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہابی تحریک پھیل گئی۔ بخاری اور مسلم کی اشاعت ہونے لگی اور صورت حال بہت کچھ بدل گئی اب تو مانہ قرآن مجید کے مطالعہ کا ہے مسلمان نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو خود ہی سمجھ لیں گے کہ ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے اور انھیں اپنی زندگی میں کس نہج پر قدم اٹھانا ہے۔ قوموں میں تبدیلیاں دفعتاً نہیں بلکہ چپ چاپ اور بتدریج رونما ہوا کرتی ہیں یہ ایک عمل ہے جو آپ ہی شروع ہوتا اور آپ ہی آپ جاری رہتا ہے۔

۞

علامہ۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں ایک ایسے زمانے میں جب حکومت اور عملداری کی طرح قوائے علم و عمل بھی ماؤف ہو رہے تھے اور لوگوں کو دلچسپی تو بیشتر چند فرسودہ اور لاحاصل بحثوں سے تھی۔ شاہ صاحب کا سیاست اور معاش پر قلم اٹھانا ایک حیرت انگیز امر ہے وہ صحیح معنوں میں ہماری نشاۃ ثانیہ کے نقیب ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ، منجملہ ان تصنیفات کے ہے جنھوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ کی رہنمائی کی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ شاہ صاحب نے سیاست اور معاش کے باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ان کی ترجمانی دور حاضر کی رعایت سے کی جائے۔

حکیم قریشی۔ حجۃ اللہ البالغہ اور احیاء العلوم یا اس قسم کی دوسری تصنیفات ،
کا مطالعہ تو بڑی بات ہے جن کے متعلق آپ کا ارشاد ہے
کہ اسلامی دل و دماغ کی صورت گر ہیں عام لوگ تو ان کے نام
سے بھی واقف نہیں ۔

علامہ۔ یہ دور علم و حکمت کے زوال کا ہے ۔
احیاء العلوم بڑی چیز ہے اس کی علمی اور فلسفیانہ
قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ابھی تک نہیں کیا گیا غزالی
بہت بڑا انسان تھا ۔

راجہ حسن اختر۔ ہمارے ذہن میں بزرگوں کا تصور کچھ ویسے ہی قائم کر
دیا گیا ہے جیسے عام طور پر علمائے دین کا حالانکہ انھیں علوم و
فنون میں بڑی دسترس حاصل تھی ۔

حکیم قریشی۔ ابن رشد ہی کو دیکھئے وہ طبیب بھی تھا ۔

علامہ۔ ابن رشد ارسطو سے خوب واقف تھا لیکن اس کی
شخصیت عظمت سے خالی ہے غزالی کی شخصیت اس کے مقابلے
میں بڑی عظیم ہے دراصل ابن رشد کی عظمت کا راز ہے اس
کی طبی اور فقہی حیثیت فلسفہ میں ارسطو نے اُسے اُبھرنے
نہیں دیا گو یوروپ اس سے متاثر ہوا پاڈوا ابن رشد کی
تعلیم کا خاص مرکز تھا ۔ ۔ ۔ ۔ احیاء کی تصنیف سے فکرِ
انسانی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے تہافت
کو اس کا مقدمہ کہیے وہ فکرِ انسانی کا اچھوتا مظہر ہے اس میں
کوئی شک نہیں کہ غزالی کے مقاصد مذہبی تھے لیکن فکر کی تنقید

میں انھوں نے جو منہاج وضع کیا اس کیلئے فلسفہ ہمیشہ ان
کا مرہونِ منت رہے گا غزالی کا مذہبی درجہ بھی بڑا بلند ہے
لیکن فلسفیانہ حیثیت سے بھی ان کی ذہانت اور طباعی سے
انکار نہیں کر سکتے (۱)

۵

راوی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر الٰہی بخش علامہ کو دیکھنے آئے
تو مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا پہلے انھوں نے نماز پڑھی پھر
دیکھا اور غذا پر ہدایات دیں۔

علامہ۔ بڑے صالح نوجوان ہیں انگلستان میں رہ کر بھی ان کے
ایمان میں کوئی فرق نہیں آیا بڑی ترقی کریں گے۔ ایک روز
کالج کے پرنسپل ہو جائیں گے تشخیص و تدبیر بھی اچھی ہے مجھے
ان کی باتیں پسند آئیں۔
طب جسم کی شاعری ہے جسم کا بھی ایک حسن ہے
صحت اس حسن کی روح ہے

نیازی۔ اور طب اس روح کی ترجمان!

علامہ۔ مگر یہ ترجمانی علوم کی ترقی پر موقوف ہے اور علم ترقی
نہیں کرتا جب تک مشاہدے اور تجربے سے کام نہ لیا
جائے جب تک تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری نہ رہے۔
ابھی تو ہم یہ بھی نہیں سمجھے کہ انسان ہے کیا؟
علوم کی نظر جسم پر ہے لیکن جسم کو بھی ہم کہاں سمجھے ہیں؟

عالمِ اسلام میں تجربہ و تحقیق کا خاتمہ ہو چکا ہے نہ استعجاب علم ہے نہ علم کیلئے کوئی سعی و کاوش یوروپ کی حالت اس سے کس قدر مختلف ہے وہاں تحقیق ہے تجربہ ہے علم سے دلی شغف شب و روز محنت، شب و روز انہماک حالانکہ ایک زمانہ میں وہاں تجربہ و تحقیق تو درکنار علم کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔

کسے معلوم نہیں کہ گلیلیو نے جب حرکت ارضی پر زور دیا تو پادری خوب ہنسے۔ انھوں نے کہا حرکت ارضی تو مشاہدے میں نہیں آتی ہم کیسے مان لیں کہ زمین حرکت کرتی ہے مگر جب مشاہدے کی نوبت آئی تو دوربین کے استعمال سے انکار کر دیا تاکہ انھیں وہ کچھ نظر نہ آئے جو اس طرح نظر آسکتا تھا۔

طب کی ترقی بھی اس لئے رُک گئی کہ مسلمانوں نے علم و حکمت و مشاہدے اور تجربے سے کنارہ کشی کر لی۔ طب کو فروغ ہو تو کیسے؟ ہم کچھ نہیں کر رہے ہے۔

حکیم قرشی۔ اس میں حالات کو بھی دخل ہے قوم میں دم نہیں اور حکومت بھی طب کے خلاف ہے۔

علامہ۔ حکومت سے کوئی امداد نہیں ملے گی اہل یوروپ بڑے شاطر ہیں انھوں نے دوا فروشی کو بھی دوسرے مصنوعات کی طرح تجارت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ افریشیا کی کتنی دولت ہے جو دواؤں کی درآمد سے یوروپ پہنچتی ہے حکومت طب کی سرپرستی کیوں کرنے لگی۔ اس کی نظر دولت پہ ہے ہماری

ضرورت ہماری تہذیب و ترقی پر نہیں۔

لیکن میں بات کر رہا تھا علمی تجسس کی۔ مسلمانوں میں علمی تجسس کا فقدان ہے عالم اسلام کا ذہنی انحطاط حد درجہ اندوہناک ہے۔ مسلمانوں میں علمی روح باقی ہے نہ علم و حکمت سے کوئی دلی شغف تھوڑی بہت بیداری جو نئی تعلیم اور مغرب کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ علم و حکمت کے بارے میں ان کے ذہن نے کچھ اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ علم و حکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں نہ اس کے ماضی، عہد بہ عہد ارتقا انقلابات اور تغیرات کو نہ اس میں قوموں کے حصے اور ان کے نقطہ نظر کو اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند مستعار لئے ہوئے خیالات کا اعادہ۔

حالانکہ مسلمانوں کو علم و حکمت میں سب سے پیش پیش ہونا چاہیے ان کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابل فخر ہے علم و حکمت کی کون سی شاخ ہے جس پر ان کی ذہانت اور اجتہاد کا نقش ثبت نہیں یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں علمی روح پیدا کی اور علوم و فنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود جسے آجکل سائنس کہتے ہیں۔ انھیں کا مرہون منت ہے۔

ہم کیوں نہیں سوچتے یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں۔ جن پر علم کی ترقی اور نشو و نما کا دار و مدار ہے یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ و معائنہ فکر و نظر محسوس اور مرئی کا احترام تجربہ تحقیق تفتیش حقائق کا اثبات ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل و تعبیر یہ شرائط پوری نہ ہوتیں تو علم کا

راستہ دیر تک رُکا رہتا۔

مسلمانوں کے زوال علم کی ذمہ داری محض سیاسی معاشی حالات پر عائد نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کا علمی زوال تو ان کے دورِ محکومیت سے بھی کہیں زیادہ مقدم ہے۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے زوال ہوا تو کیسے اور کیوں؟

جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے اہلِ جاپان کے یہاں کوئی علمی روایت نہیں تھی۔ وہ ایک طرح سے علم و حکمت میں کورے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس میدان میں اس طرح آگے بڑھے کہ اہلِ یورپ کے مدِمقابل بن گئے۔ مسلمانوں نے بھی تو کبھی اردگرد کی دنیا سے ..... اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ دنیا معرض زوال میں تھی ..... علم و حکمت کا اکتساب کیا تھا مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شان سے آگے بڑھے کہ علم و حکمت کی کائنات ہی بدل دی علم کو صحیح معنوں میں علم کا درجہ عطا کیا۔ مسلمان آج پھر ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ مسلمانوں میں دم کیوں نہیں (۱)

☆

راوی۔ اپریل ۱۹۳۶ء کے آواخر میں خضر تمیمی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ساتھ جاوید منزل میں داخل ہو رہے تھے تو قائدِ اعظم کی کار کوٹھی سے نکل رہی تھی اور علامہ خلافِ معمول ان کی

(۱) اقبال کے حضور ص ۳۰۴

مشائعت کے لئے دروازے تک آئے تھے رسمی مزاج پرسی کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔

خضر تمیمی۔ جاوید نامہ کا ایک مصرعہ ہے

ع آن از ایران بود و ایں ہندی نژاد

اس کی تشریح ارشاد ہو۔

علامہ۔ ثانی والذکر، قادیانیت کے بانی کی شخصیت، نفسیاتی مطالعہ کیلئے بہت موزوں ہے۔

صوفی تبسم۔ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کریگا

علامہ۔ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے کوئی نوجوان اس کام کیلئے اُٹھے تو میں اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔

اسلام نہ صرف دنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں ان کی بھی آخری کڑی ہے قادیانیت کی تعلیم اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے منافی ہے سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ قادیانیت کے ارکان اعلیٰ اسلاف صالحین کی تحریروں کو معرف کر دیتے ہیں۔

خضر تمیمی۔ آپ مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں کچھ فرمائیں

علامہ۔ الیوم اکملت لکم دینکم کی توضیح قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

خضر تمیمی۔ آخر اسلام ہیں اور فرقے بھی تو ہیں صرف قادیانیوں

کی مخالفت کیوں کی جائے۔

علامہ: ان کا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے مختلف گروہ ہائے خیال ہیں جن کے اختلافات فقہ پر مبنی ہیں ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایمان رکھتا ہے لیکن قانون اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلافات رکھتا ہے۔ تعجب ہوتا کہ فقہہ اصحاب خشک ہونے کے باوجود حضور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں ایک صاحب اُٹھتے ہیں کہ نبی کریم نے فلاں کام اس طرح کیا۔ اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن حدیث یا دیگر ماخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور نے یوں سرانجام دیا وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں جس سے مستفسر کو حضور کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق معلومات حاصل ہوجاتی ہیں سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضور کا ذکر آیا ان جذبات سے عاری فقہا کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضور کا اسوۂ حسنہ ہے جس کے ہر پہلو کو اس قدر عزم و احتیاط سے ملحوظ رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اب تم خود اندازہ کرلو کہ ایسی محبوب و مستفسر ہستی کے جملہ اعزازات کے لئے کسی اور کو چن لینا اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام کے مترادف نہ ہوگا۔

راوی۔ خضر تمیمی شاہد ہیں کہ بانی مرزائیت کے کوائف زندگی اور انہی حالات میں حضور کے مبارک افعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اشکبار ہو گئے۔

⁂

راوی۔ علامہ کے میکلوڈ روڈ کے قیام کے زمانے کی بات ہے کہ سعادت علی خان جھنگ سے علامہ عبداللہ یوسف کا کتابچہ اخلاقی تعلیم علامہ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے حاضر ہوئے۔ محفل گرم تھی کشمیر کی جدوجہد زیر بحث تھی سعادت علی خان نے یہ باتیں سنیں۔

یکے از حاضرین۔ کشمیر میں آزادی کی روح صدیوں کے تشدد اور جبر کے بعد اپنا سر اُٹھا رہی ہے اور ریاست اسے ہر طریق سے پھر دبانا چاہتی ہے۔

علامہ۔ یہ ناممکن ہے یہ روح کی چنگاری ہے شعلہ بن کر رہے گی۔

سعادت علی۔ لیکن کشمیریوں کی غربت و جہالت سے جی کڑھتا ہے

علامہ۔ غربت و جہالت قوت ایمان و حریت کی راہ میں نہ کبھی سد راہ ہو سکے ہیں اور نہ ہوں گے۔ ہم تو اُمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں مسلمان کیلئے غربت و جہالت کی آڑ لینا اس کی روحانی کمزوری کی پکی دلیل ہے۔

راوی۔ ان الفاظ نے سامعین پر ایک رقت سی طاری کر دی

اور ایک عجیب بوش کا عالم طاری ہو گیا۔

ش

راوی۔ حکیم قرشی علامہ کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے ان محفلوں میں علامہ سے اپنی گفتگوؤں کا حال انھوں نے "حکیم مشرق" کے عنوان سے لکھا ہے اس کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

حکیم قرشی۔ جب میں آیا تو آپ اتباعِ سنت کے بارے میں کچھ فرما رہے تھے۔

علامہ۔ حضور کا پیکرِ اطہر جسمِ اسلام ہے آپ اسلام اور ایمان کی تفسیر ہیں اور خود حضور کے اسوہ حسنہ دریافت کرتا ہوں تو قرآن مجید کا ہر حرف اس کا اشارہ کرتا ہے۔

ش

حکیم قرشی۔ ڈاکٹر صاحب۔ غالب نے یہ شعر غالباً آپ ہی کے لئے کہا۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

علامہ۔ ہاں اگرچہ جمہور مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن میں خود شاعری کو اپنے افکار پھیلانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں۔

حکیم قرشی۔ ویسے آپ شعر کس طرح کہتے ہیں۔

علامہ۔ سال میں چار پانچ ماہ تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے میں بلا ارادہ شعر کہتا رہتا ہوں اس وقت کے ہوتے ہوئے گھر کے دوسرے کام بھی کرتا رہتا ہوں مگر زیادہ تر طبیعت کا رجحان شعر گوئی کی طرف ہوتا ہے۔ ان دنوں عموماً شعر گوئی کے لئے رات کو بیدار رہنا پڑتا ہے چار پانچ ماہ کے بعد یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو غور و فکر کے بعد کچھ شعر کہے جا سکتے ہیں مگر یہ آورد ہوتی ہے وہ آمد، دونوں طرح کے کہے ہوئے اشعار میں تمیز کی جا سکتی ہے اس حالت کو میں حمل کہتا ہوں اور اس حالت کے اختتام کو وضع حمل۔

حکیم قرشی۔ ایک رات میں آپ نے زیادہ سے زیادہ کتنے شعر کہے ہیں؟

علامہ۔ تین سو۔

۞

راوی۔ ممتاز حسن جو وزارتِ خزانہ کے سیکرٹری، نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر وغیرہ بہت کچھ رہے۔ بڑے علم دوست انسان تھے ان کے والد محمد حسن علامہ کے گورنمنٹ کالج میں کلاس فیلو بھی رہے تھے۔ اس نسبت سے اور اپنے طور پر بھی انہیں علامہ سے خاص تعلق تھا اکثر حاضر ہوتے اور جب

آتے تو کوئی نہ کوئی علمی اور فلسفیانہ سوال ضرور پوچھتے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۲٦ء میں شروع ہوا۔

ممتاز حسن۔ آپ فلسفی ہونے کے باوجود اپنے کلام و مقالات میں خدا کا ذکر غیر فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ کانٹ تو کہتا ہے فلسفے سے خدا کا اثبات ممکن ہے نہ انکار۔

علامہ۔ خدا کے متعلق پوچھتے ہو؟
میں نے اِسے دیکھا ہے انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ لمحے کم نصیب ہوتے ہیں۔

ممتاز حسن۔ کیا ہر شخص کیلئے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے۔

علامہ موت کا کوئی وجود نہیں، اصل حقیقت زندگی ہے موت نہیں۔

ممتاز حسن۔ روح غیر فانی ہے اور جسم فانی۔

علامہ۔ انسانی جسم کیلئے بھی غیر فانی حیثیت اختیار کر لینا ممکن ہے۔ (۱)

راوی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی فلسفے کا ذوق رکھتے تھے مشرق و مغرب کے فلسفہ کا مطالعہ کر چکے تھے کانٹ سے خاص طور سے متاثر تھے۔

سلیم چشتی حکماء کے دلائل تو کانٹ نے باطل ٹھہرا دیئے اب

(۱) روزگار فقیر ۹۲۔

ہم ذات واجب، کا اثبات کریں تو کیسے ؟

علامہ۔ عقلی دلائل کی مدد سے واجب الوجود کا اثبات نہیں ہوسکتا اس کے اثبات کا طریقہ باطنی مشاہدہ یا مذہبی تجربہ ہے۔ خدا شناسی کا ذریعہ خود شناسی نہیں عشق ہے۔ جسے فلسفے کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں (۱)

ث

پروفیسر سلیم۔ کیا قرآن کریم کے مطالعہ سے فلسفے کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں مدد نہیں مل سکتی ؟

علامہ۔ قرآن کریم فلسفے اور الٰہیات کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ قرآن کریم کو اس زاویۂ نگاہ سے مت پڑھو کہ وہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا بلکہ اسے اس زاویۂ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے اور کائنات میں میرا مقام کیا ہے ؟
قرآن اس لئے نازل ہوا کہ وہ انسان میں خدا سے ربط قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیت ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

ث

راوی۔ بقول سر عبد القادر، اسلام تو اقبال کے رگ و پے میں ماں کے دودھ کے ساتھ نفوذ کر گیا تھا دوسرے مذاہب

---

(۱) روزگار فقیر جلد اوّل ص ۱۷۷۔

کا بھی انھوں نے ہمدردی سے گہرا مطالعہ کیا تھا ایک دفعہ ایک پادری ان سے ملنے آیا۔

پادری۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔

علامہ۔ اس سے پہلے کہ میں اس معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کروں آپ بتائیے کہ عیسویت کے نزدیک جناب مسیح علیہ السلام اسی طرح خدا کے بیٹے تھے جس طرح میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں یا آپ کے بیٹے ہیں یا محض استعارہ کے طور پر مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔

پادری۔ نہیں۔ یہ تو صرف استعارہ ہے۔

علامہ۔ تو بس اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔ (۱)

ؒ

راوی۔ علّت و معلول کی بحث تھی۔

نیازی۔ کیا حوادث کی ترتیب میں رد و بدل ممکن ہے کیا دعا اس ترتیب کو روک سکتی ہے؟ کیا حوادث کی کوئی ترتیب بھی ہے؟

علامہ۔ علّت و معلول کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کی ایک ترتیب ہو۔ ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی۔

نیازی۔ پھر دعا؟

علامہ۔ وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے اور ہماری

(۱) گفتارِ اقبال ۱۶۸۔

دنیا سے بے تعلق تو نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اسی سے کہتے ہیں
وہ کہتا ہے مجھ ہی سے دعا کرو تمہاری دعا سنتا اور جواب
دیتا ہوں زندگی کیا ہے؟ ایک مسلسل دعا۔

☆

راوی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کی شام علامہ کی طبیعت
میں قدرے سکون تھا۔

علامہ۔ (کروٹ بدل کر) کائنات اضافہ پذیر ہے۔

☆

راوی۔ موضوع گفتگو تھا تبلیغ اسلام کا بنیادی مقصد کیا
ہے؟

نذیر نیازی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ تبلیغ اسلام سے مقصود
کیا صرف عقائد کی تبلیغ ہے یا اس طرزِ زندگی کی تبلیغ جس
کی اسلام نے نوعِ انسانی کو دعوت دی اور ملّت محمدیہ
خیر اُمتہ قرار پائی لیکن جس کے لئے فرد اور جماعت دونوں
کا ایک مخصوص اور مسلسل جدوجہد سے گزرنا ضروری ہے

علامہ۔ ظاہر ہے کہ اس جدوجہد کی حیثیت انفرادی
نہیں ہوگی بلکہ سیاسی اجتماعی تاکہ ہم ایک دوسرے سے
اپنے روابط، سیرت و کردار اور معاملات کی دنیا میں وہ
تبدیلی پیدا کریں جس کا اسلام خواہش مند ہے اور جس کے

پیش نظر اس میں ریاست کا وجود لازمی ٹھہرا ۔ لہٰذا اگر تبلیغ
اسلام سے مدعا ہے بلحاظ ایک دستور حیات اسلام کی تبلیغ
تو اس کا بیڑا وہی جماعت اُٹھا سکتی ہے جو خود بھی اس پر عمل پیرا
ہو ورنہ ناممکن ہے اس میں کوئی معنی پیدا ہوں

ٍ

راوی۔ ۱۹۲۷ء کی ایک سرمائی رات کو پروفیسر ہیوم ملاقات
کیلئے آئے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تقابل ادیانِ عالم
کے موضوع پر توسیعی لیکچر دیئے تھے ۔

علامہ۔ آپ نے جو لیکچر پنجاب یونیورسٹی میں دیئے ہیں ۔
ان کا خلاصہ اخبار میں شائع ہو گیا ہے میں نے نہایت توجہ
سے ان کا مطالعہ کیا ہے اور مستفید ہوا ہوں ڈاکٹر ہیوم آپ
کا کیا خیال ہے کہ عیسائی مذہب تبلیغی مذہب ہے ۔
میرے خیال میں آج دنیا میں صرف اسلام ہی تبلیغی
مذہب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے ۔ عرصہ ہوا عیسائیت ایک
تبلیغی مذہب ہونے کی حیثیت سے مردہ ہو چکی ہے اور
صرف اسلام ہی اس وقت زندہ مذہب دنیا میں ہے پھر
چونکہ (مذاہب کا تقابلی مطالعہ) آپ کا موضوع ہے ۔ اور
اسی پر لیکچر بھی دیئے ہیں تو آپ نے اس نہج پر سوچا ہو گا کہ
بدھ مذہب جو آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ افراد کا مذہب

ہے وہ بھی اسلام کے مقابلے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا (۱)،

ٹ

راوی۔ ۱۹۳۵ء کی بات ہے رشید احمد صدیقی بھی علامہ کی خدمت میں موجود تھے ایک نوجوان شاعر آئے اور کچھ دیر اپنا فارسی کلام سناتے رہے ان کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا اور گفتگو میں ناقابل برداشت حد تک تعلی تھی علامہ کچھ دیر تک خاموشی سے مگر کسی قدر بیزاری سے سنتے رہے پھر اُٹھ کھڑے ہوئے صحبت ختم ہوگئی صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے اندر سے دیر میں برآمد ہوئے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔

تھوڑی دیر بعد

علامہ۔ (ٹھہر ٹھہر کر کش لینے کے بعد) نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے

ٹ

راوی۔ نطشے کا فلسفہ زیر بحث تھا۔

نطشے کا بنیادی تصور ہے فوق البشر جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر توجہ فرد پر تھی اس نے جماعت کا ذکر بہت کم کیا ہے۔

اقبال کی صحبت میں ص ۲۴۰

علامہ۔ یہ مسئلہ کہ جماعت کے باب میں اس کا مسلک کیا تھا فی الواقعہ مختلف فیصلہ ہے۔ ممکن ہے اس کا خیال ہو کہ فوق البشر ہی رفتہ رفتہ ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیں گے۔

نیازی۔ لیکن فوق البشر کا ظہور تو کبھی کبھی ہوتا ہے اس کی ساری خوبی اس کی انفرادیت اور کمیابی ہے وہ نصب العین ہے باقی سب اس کے پیرو اور منتظر۔

علامہ۔ جب ہی تو اس کے متبعین میں اس باب میں الگ الگ رائیں قائم کی ہیں لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ نطشے کی طبیعت پر انفرادیت پسندی ہی کا غلبہ تھا۔ اس کی ہمشیرہ (الزبتھ) نے بھی تو یہی لکھا ہے کہ اسے ایرانیوں کا یہ عقیدہ کہ ہر صدی میں ایک مجدّد کا ظہور ہوتا ہے بڑا پسند تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو مجدّد ہی سمجھتا ہو۔ (۱)

ﺷ

راوی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی اصطلاحیں "الدین" اور "الاسلام" زیرِ بحث تھیں۔

علامہ۔ مسلمان بڑے سادہ ہیں اس قسم کی تعبیریں قبول کر لیتے ہیں وہ نہیں سوچتے کہ مولانا کہنا کیا چاہتے ہیں کیا یہ کہ اسلام کی اس تعبیر کے پیش نظر جو انھوں نے "الدین" اور "الاسلام" کی شکل میں کی ہے مسلمان سیاست کو مذہب سے

(۱) اقبال کے حضور ۲۴

الگ رکھیں اپنے لئے جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں۔ اس گروہ بندی میں شامل ہو جائیں جس کی اشتراک وطن ہے اور یہ سب قطع نظر اس تصور کے جسے ہندوستانی قومیت کے نام سے اُبھارا جاتا ہے اس لئے کہ ادیان اصلاً سب ایک ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ مولانا کا مافی الضمیر کیا ہے لیکن اگر وہی کچھ ہے جو میں سمجھا ہوں تو ان کے غور و فکر میں ایک تو وہی دلیل کام کر رہی ہے جس کا تعلق لادین سیاست سے ہے اور جس کا تقاضا ہے کہ ریاست اور کلیسا میں تفریق کی جائے دوسری مذہبی اور یہ پہلی سے بھی زیادہ خطرناک کہ ادیان سب ایک ہیں اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ دین فی الحقیقت کوئی اصولِ اجتماع نہیں بلکہ ایک اخلاقی نصب العین ہے جس کی آرزو ہے کہ دنیا میں ہر کہیں خیر و صداقت کو تحریک ہو شرافت اور نیکوکاری کا دور دورہ رہے۔ انسانی روابط کی دنیا یعنی معاشرے کی تاسیس اور نظم امور اس کیلئے ہیں کسی اور ہی اصول کی تلاش ہوگی یہ اصول کیا ہو سکتا ہے یہی کوئی نسلی اور وطنی گروہ بندی۔ جہاں تک تعلق ہے ہندوستانی قومیت کا جسے اگر قبول کر لیا گیا تو مسلمانوں کی حقیقت قوم کی نہیں بلکہ ایک مذہبی گروہ کی رہ جائے گی شریعت کی چند ذاتی اور شخصی قوانین، عقائد اور مراسم تک۔

یہ زندگی ایک وحدت ہے لہٰذا اس میں ایک ہی اصول کارفرما رہتا ہے یہ خیال کہ ایک حیثیت سے ہم کوئی ایک

اور دوسری حیثیت سے کوئی دوسری گروہ بندی اختیار کر سکتے ہیں
غلط ہوگا۔ ان میں باہم تصادم ہوگا اور ضرور ہوگا ان میں ایک کی کوشش
دوسری پر غالب آجائے یوں بھی تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کسی قوم
نے یہ طرزِ فکر اختیار کیا اس کی روح دب گئی تاآں کہ اس کے جداگانہ
تشخص میں فرق آگیا اس قسم کی کوشش پہلے بھی کی گئی لیکن ان سے
بجز ضعف و اضمحلال کے کچھ حاصل نہ ہوا ہم اپنے مرتبہ و مقام اور
نصب العین سے دور ہٹ گئے۔ ہماری دینی جمعیت اور ملی عصبیت
مجروح ہو کر رہ گئی۔ اکبر (داراشکوہ) کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

٭

راوی۔ اسلام میں اجتہادی تحریکوں کا ذکر چل رہا تھا۔

علامہ۔ جب کوئی انسان جسے اللہ تعالیٰ نے دین کا فہم عطا کیا
ہے اور جسے اس کیساتھ ایمان و یقین اور عزم و حوصلے کی
دولت بھی ملی ہے کسی بنیادی مسئلہ کو چھیڑتا اور اُمت کو اصلاح
کی دعوت دیتا ہے تو یہ دعوت کوئی بھی شکل اختیار کرے
رائیگاں نہیں جاتی اس سے کئی ایک اور نتائج بھی مرتب ہوسکتے
ہیں بلکہ ہو جاتے ہیں خواہ کسی دوسرے رنگ میں۔
شاہ ولی اللہ ہی کو دیکھئے کیسے بالغ نظر اور صاحب
بصیرت انسان تھے ان کی ذات جس تحریک کا سبب بنی اور
یہ تحریک جہاں تک بھی کامیاب ہوئی ان کی دُور اندیشی اور
اُمت کیلئے غیرت و حمیت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے ان

کے ارشادات کی قدر و قیمت آج واقع ہو رہی ہے۔ وہابی تحریک ایک چنگاری تھی جس سے عالم اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اُٹھی۔ صدیوں کا جمود ٹوٹا قوائے علم و عمل مضمحل ہو رہے تھے ان میں پھر سے حرکت پیدا ہوئی۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ ہونا چاہیے۔

عالم اسلامی میں شعلہ حیات کبھی افسردہ نہیں ہوا لیکن اٹھارویں صدی میں تو اس نے کئی ایک ممالک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یوں جن تحریکوں کا ظہور ہوا ان میں ایک علاقہ سا قائم ہو گیا حالانکہ اکثر بیشتر ان میں باہم کوئی تعلق نہیں تھا بجز سطحی مشابہت کے۔ مثلاً یہی کہ جہاں کہیں بدعات کے خلاف آواز اُٹھی اُسے بھی وہابیت سے تعبیر کیا گیا حتیٰ کہ حضرت سید احمد کی تحریک جہاد بھی وہابی تحریک ہی سے موسوم ہوئی۔

کوئی بھی تحریک ہو اُسے ناکامی اور کامرانی ہر طرح کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تحریک جہاد کا ایک مرحلہ وہ تھا جو بالاکوٹ میں ختم ہوا دوسرا وہ جب یہ تحریک سرحد میں محدود ہو کر رہ گئی اور گو ۱۸۶۲ء کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیاں سست پڑ گئیں بایں ہمہ حکومت کو ان کی طرف سے کبھی اطمینان نہ ہوا۔ اس تحریک کے بچے کھچے عناصر ہندوستان میں بھی موجود تھے یہی وجہ ہے کہ جب کبھی انگریزوں کے خلاف کوئی تحریک اُٹھی تو اُنھیں بھی موقعہ ملا۔

کہ اپنی دعوتِ جہاد کو از سرِ نو تازہ کریں خواہ کسی رنگ میں (۱)

☆

راوی   مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر محمد شجاع ناموس ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے کہ انہیں علامہ سے نیاز حاصل ہوا علامہ نے نہ صرف ان کی غزلوں کی اصلاح فرمائی بلکہ سائنس کے بعد فارسی، عربی، پشتو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھی آمادہ کیا۔

۱۹۲۱ء میں ایم ایس سی پاس کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو یہ گفتگو ہوئی

محمد شجاع۔   ڈاکٹر صاحب اللہ کا شکر ہے کہ ایم ایس سی میں تو کامیاب ہوگیا اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

علامہ۔   دیکھو جدید دور میں ہمیں فارسی عربی کے دیوانوں کی تصحیح کی ضرورت نہیں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اقوامِ عالم کے سامنے وضاحت کے ساتھ ان علوم کو نمایاں کریں جو ان کے اسلاف نے اپنے سنہری دور میں تحقیق و تخلیق کئے تھے اور جن کی بدولت آج کی دنیا اس عروج تک پہنچ سکی یورپ تو منصوبے بنا کر زرِ کثیر سے اسلام کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے علماء کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عہدِ متوسط کے یورپ کے تمام علوم و فنون

(۱) اقبال کے حضور ۳۲۹۔

کے ماخذ اسلامی علوم ہیں اور اکثر اوقات تو وہ عربی کتابوں کے تراجم ہیں جو یورپ کے عالموں نے اپنے نام سے شائع کر دیے ہیں۔

تم نے سائنسی مضامین تو پڑھ لئے انگریزی بھی سیکھ لی مگر جب تک تم فارسی عربی پر کامل عبور نہیں کرو گے تو اسلاف کے تحقیقی کاموں کی تکمیل کے اہم اسلامی فریضے کو ادا نہیں کر سکو گے اس لئے تم فارسی عربی پڑھو اور اتنی پڑھو کہ تم براہ راست مسلمان علما کی ان کتابوں سے بلا تکلف استفادہ کر سکو جو عربی میں لکھی گئی ہیں۔

ش

راوی۔ عباد علی اسسٹنٹ کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس ۲۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اپنے چند دوستوں کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے سلام وکلام کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔

عباد علی۔ میں ایک ادنےٰ طالب علم ہوں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ خودی کو بلند کرنے کو کہتے ہیں جبکہ صوفیا کرام خودی کو مٹانے کی تلقین کرتے ہیں خودی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

علامہ۔ خودی سے میرا مطلب کچھ اور ہے اسرار خودی میں میں نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک فرد

اپنی اصلاح کرے یعنی قہاری و غفاری قدوسی و جبروت کا مظہر بن جائے اور بعد ازاں جب یہ منزل نصیب ہو جائے تو اپنے تئیں ایک امیر المومنین کے سپرد کر دے جو انہی خواص کا مظہر ہو۔
رموزِ بے خودی کا نکتہ یہی ہے اسی میں دنیا کی خیر ہے

٭

راوی۔ خواجہ عبدالوحید کے علامہ سے خاندانی مراسم تھے کچھ قرابتداری بھی تھی علامہ ۱۹۰۸ سے ۱۹۱۸ء تک ان کے بزرگوں کے گھر للی لاج میں اکثر شام کو کچھ وقت گزارتے تھے وہاں بچپن میں خواجہ صاحب نے علامہ کو ایک عرصے تک قریب سے دیکھا پھر بڑے ہو کر خود بھی علامہ سے فیض اُٹھایا۔ اور علامہ کے ایماء پر ایک علمی ادارے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی بنیاد رکھی اسی ادارے نے سب سے پہلے یومِ اقبال بھی منایا۔

خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ کے دو سالوں میں علامہ سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ اپنی ڈائری میں کیا ہے اس کے اہم مندرجات کو ایک مربوط گفتگو کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

عبدالوحید۔ اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب!

علامہ آؤ بیٹھو جی (کتاب رکھ کر) اچھا کیا حال ہے

تمہارا - ؟

خواجہ وحید۔ شکر ہے آپ سے نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔

علامہ۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کیا خبر ہے ؟

خواجہ وحید۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جامعہ ملیہ دہلی لکھا ہے کہ ہم اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غازی حسین روف بے کا ایک لیکچر لاہور میں کرانا چاہتے ہیں ۔

علامہ۔ یہ بہت اچھا کیا تم نے، غازی روف بے کے لیکچر کا بڑا اچھا اثر پڑے گا ۔

خواجہ وحید۔ صدارت کیلئے آپ ہی کو زحمت دیں گے ۔

علامہ۔ زحمت کیا ، میں تیار ہوں ۔

خواجہ وحید ۔ اب آپ کی صحت کیسی ہے ؟

علامہ۔ قدرے بہتر ہے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اتنی مہلت ملے کہ اپنی زندگی کی سب سے اہم خدمت کر سکوں ۔

خواجہ وحید۔ آپ کا عظیم کلام ، آپ کے انگریزی لیکچر زکچھ کم ہیں ۔

علامہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے اپنے اشعار میں کر دیا ہے لیکن ابھی میرے دل میں اس سے بھی بڑی ایک چیز ہے ۔ جو قرآن کریم کی شرح کی صورت میں ظاہر کرنے کی آرزو رکھتا ہوں

خواجہ وحید۔ ان دنوں سیاست میں آپ کی دلچسپی کچھ کم سی ہے ۔

علامہ۔ ہاں کچھ تو علالت کی وجہ سے کچھ حالات کی وجہ سے میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ (مسلمانانِ ہند) بالکل بیکار ہو گئے ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان میرا خیال ہے کہ اگر کبھی کام آسکتے ہیں تو غریب مزدور پیشہ یا دکان دار لوگ جن کیلئے میرے دل میں محبت اور احترام ہے اور جن سے مل کر مجھے حقیقی خوشی ہوتی ہے لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گروہ کو بالعموم میں التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔

خواجہ وحید۔ یہ کیا بات ہے کہ یوروپ والے جن باتوں کا صدیوں تک تجربہ کرتے رہے اور اب ان سے متنفر ہو چکے ہیں یوروپ کے ایشیائی مقلدین انھیں چیزوں کے پیچھے لگے ہیں۔

علامہ۔ عورتوں کی بے مقصد آزادی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے عورتوں کی قیادت پر کوئی اعتماد نہیں عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں حقیقت یہ ہے کہ عورت کو دماغ کمزور ملا ہے۔ اس لئے کہ اس کی تخلیقی قوت اس کے رحم سے تعلق رکھتی ہے مرد دماغ سے کام لیتا ہے اور عورت رحم سے، جن عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے یعنی جو بچے جنتی ہیں وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں بمقابلہ ان عورتوں کے جنھوں نے کبھی بچہ نہیں جنا۔

خواجہ وحید۔ سیاست اور مسلمان کے بارے میں آپ کچھ فرما

رہے تھے۔

علامہ۔ میں ملکی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے کیلئے شامل نہیں ہوا تھا بلکہ محض اس لئے کہ ہندوستان کے آیندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت واضح اور متعین کر دوں اور یہ ظاہر کر دوں کہ اس ملک کے سیاسی ارتقاء میں حصہ لیتے ہوئے مسلمانوں کو دوسرے قوموں میں مدغم نہ ہو جانا چاہیئے۔

خواجہ وحید۔ جدید تعلیم کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

علامہ۔ مسلمانوں نے دنیا کمانے کیلئے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔

خواجہ وحید۔ ڈاکٹر صاحب، بہت دنوں سے ایک سوال ذہن میں ہے، یہ ادب لطیف کیا ہے؟

علامہ۔ آرٹ کے متعلق دو نظریئے ہیں اوّل یہ کہ آرٹ کا مقصد محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے دوم یہ کہ آرٹ انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کیلئے وقف ہونا چاہیئے اور اس لئے ہر وہ آرٹ جو انسانی زندگی کیلئے مفید ہو جائز ہے اور وہ آرٹ جو زندگی کیلئے مضر ہو، ناجائز ہے بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا ہے چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں ان کی موسیقی کا بڑا حصہ ہے وہ آرٹ جو انسان کی ہمت کو پست اور اس کے جذباتِ عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو

قابلِ نفرت ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیئے

خواجہ وحید۔ ایسا کرنا آپ کے خیال میں کیا حکومت کی ذمہ داری ہے

علامہ۔ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے۔ لیکن اس سب سے بڑے فرض کو جدید دنیا تسلیم نہیں کرتی حکومتیں محض سیاسیات سے تعلق رکھتی ہیں اور افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں۔

خواجہ وحید۔ یہ تو تہذیب حاضر کا خاصہ ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کو افراد کا ذاتی معاملہ سمجھتی ہے

علامہ۔ اسلام تہذیب حاضرہ کی تمام بے اصولی چیزوں کا دشمن ہے اس لئے مسلمانوں کو اس کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیئے کہ نہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنالیا جائے ویسے میرا اپنا احساس ہے کہ دنیا اب اسلام کی طرف آرہی ہے اس لئے اگر آج تہذیبِ مغرب تباہ ہوجائے تو اسلام کا بول بالا ہونے کا امکان ہے جونہی تہذیبِ مغرب کا خاتمہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا علم بلند کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کیلئے مسلمانوں کو اپنے کردار کو مضبوط بنانا چاہیئے کردار ایک قسم کی توانائی ہے جتنا اسے بیکار صرف کیا جائے اتنی ہی یہ کمزور ہوجاتی ہے۔

خواجہ وحید آپ مغربی تہذیب زوال کے بارے میں کچھ فرما رہے تھے مغربی تہذیب اس وقت عبارت ہے سلطنت برطانیہ سے، اور برطانیہ کا ستارہ عروج پر نظر آتا ہے۔

علامہ۔ یاد رکھیے دنیائے اسلام کی فلاح سلطنت برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے۔

خواجہ وحید۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب میں یہ پوچھوں گا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہیئے یا جارحانہ؟

علامہ۔ عام طور پر تو جہاد دفاعی ہوتا ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوم اخلاق میں اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے دنیا میں نسل انسانی کی تباہی کا امکان ہو تو مسلمان حکومتوں کا فرض ہے کہ بزور شمشیر اس بد اخلاقی کو قوت سے روکیں۔ چنانچہ ٹیپو سلطان نے مالابار کے وحشی باشندوں کو حکم دیا کہ بجائے برہنہ رہنے کے کپڑے پہننا شروع کر دیں ورنہ بزور شمشیر انہیں کپڑے پہننے پر مجبور کرے گا۔ اس لئے کہ ان کی برہنگی کا اثر ہمسایہ قوموں کے لوگوں پر ہوگا اور ان میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے طاقت کی حمایت ہونی چاہیئے ورنہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہے اگر امر و نہی کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کے بازوؤں میں طاقت ہونا ضروری ہے۔

☆

راوی۔ اوائل ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر سعید اللہ اور خواجہ عبدالوحید علامہ کی خدمت میں حاضر تھے تو یہ گفتگو ہوئی۔

سعید اللہ۔ آج کل ہندوستان کے نیشنل انتھم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے آپ کی اس مسئلہ کے متعلق کیا رائے ہے؟

علامہ نیشنل انتھم تو اس صورت میں ہو کہ کوئی نیشن ہو جب سرے سے ہی نیشن کا کوئی وجود نہیں ہے تو نیشنل انتھم کہاں ہو سکتا ہے میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی نیشنل انتھم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سعید اللہ بندے ماترم پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی میں ہے دوسرا اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

علامہ۔ (ذرا گرمی سے، آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈھتے ہیں۔

ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالئے کہیں گرمی نظر نہیں آئیگی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے۔ رامائن اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

عبد الوحید۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے قوالی میں بھی موسیقی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

علامہ۔ میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح منشیات سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔

عبد الوحید۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے۔

مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا

ہے وہاں قوالی سے بعض لوگ ایک دم حال میں آجاتے ہیں کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

علامہ۔ ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنالیا ہے یہ کیفیت واقعی ان پر طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔

دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انھیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیا نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔

عبدالوحید۔ نسائیت سے آپ کی مراد کیا ہے؟

علامہ۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور "حال" انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی موجود ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہی نہیں اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انھوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ پچھلی

مرتبہ یوروپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقعہ ملا ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے۔ جن میں قوت اور ہیبت کی ایک شان ایسی تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوت الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوت الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی اور مغرب کا وقت قریب تھا میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کردوں لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کردیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے مسجدِ قرطبہ مہذب دیووں کا مگر الحمرا محض انسانوں کا۔

(قدرے توقف اور ایک تبسم کے ساتھ) میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بہ جا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر

"هو الغالب" لکھا ہوا نظر آتا تھا میں نے دل میں کہا یہاں
تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے کہیں انسان غالب نظر آئے
تو بات ہو۔

حمید احمد۔ ہندوستان کی اسلامی عمارات مثلاً تاج محل کے
بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ مسجد قوت الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی
بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں قوت کے عنصر کو ضعف آگیا ہے
اور در اصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حسن کیلئے توازن قائم کرتا ہے۔

سعید اللہ اور دلی کی جامع مسجد؟

علامہ۔ وہ تو ایک بیگم ہے [۱]۔ (اس فقرے سے سامعین
ہنستے ہیں علامہ بھی ہنسنے میں شریک ہو جاتے ہیں)

ؑ

راوی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اسرار خودی کا درس
علامہ سے لینے کی سعادت حاصل کی۔ ایک روز پوچھا

پروفیسر سلیم آپ کے فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے؟ اور چونکہ
آپ نے فرمایا ہے کہ خودی کا فلسفہ صوفیائے کرام اور قرآن کریم
سے ماخوذ ہے اس لئے میں نے یہ بات پوچھی ہے۔

علامہ۔ ہاں۔ سورہ مائدہ کی یہ آیت استحکام خودی پر دال ہے
یا ایھا الذین اٰمنو علیکم انفسکم لا یضرکم من

[۱] ملفوظاتِ اقبال ۸۶ - ۸۳

ضل اذا اهتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون (۱) (مائدہ ۱۰۵)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر فرض ہے خودی کی محافظت اگر تم ہدایت پر ہو تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دیگا۔

تاکہ ان کے مطابق سزا مل سکے۔

ﭻ

راوی۔ امرتسر کے ایک فاضل بزرگ تھے محمد حسین عرشی، جاوید نامہ اور بال جبریل کے گہرے مطالعہ نے ان کے اندر مثنوی رومی کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا اور مثنوی کے مطالعہ نے فلسفہ تصوف اور قرآن کے اسرار سے آشنا کیا پھر اس سلسلہ میں اُنھیں کسی مرشد کی ضرورت محسوس ہوئی زندہ رود سے بڑھ کر کون رہبر و رہنما ہو سکتا تھا چنانچہ اُنھوں نے مارچ ۱۹۳۵ میں علامہ سے رجوع کیا۔

علامہ نے جواب دیا۔

علامہ۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیئے۔ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی۔ افسوس ہے ہم ایسے زمانے

میں پیدا ہوئے۔

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

بہرحال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھئے مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہیئے۔ اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کرتی ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتے یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے۔

جن کو جاننے والے مسلمانان ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوئے۔

ؔ

راوی۔ ایک دن عرشی صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر تھے۔

عرشی۔ ایک بار آپ نے جمال الدین افغانیؒ اور سر سید احمد خاںؒ کا ذکر فرمایا تھا۔

علامہ۔ افغانی کا مرتبہ علم و فضیلت سیّد سے بدرجہا بلند ہے سیّد کے فرزندِ رشید سیّد محمود کی علمی قابلیت بھی نادرِ روزگار تھی ان کی قانونی استعداد حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مشابہ تھی میں نے سیّد احمد خاں کی وفات پر تاریخ کہی تھی جو ان کی قبر پر کندہ ہے۔ انی توفیک و رافعک الی و مطہرک

عرشی۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں آپ کے مصرعہ

"علم و حکمت از کتب دیں از نظر"

میں نظر سے کیا مراد ہے ؟

علامہ۔ صحبت ۔

عرشی۔ بعض اوقات بعض اہلِ علم و دانش بھی بدیہی طور پر لغو اور باطل و عادی خیالات پر ایمان لے آتے ہیں اس کا کیا سبب ہے ؟

علامہ۔ عقل کی بھی قسمیں ہیں بعض لوگ بعض مخصوص فنون و اعمال میں کافی بصیرت کے مالک ہوتے ہیں لیکن بہت سے دوسرے امور میں قطعًا سادہ اور سریع الاعتقاد ثابت ہوتے ہیں اس کی مثال یوں ہے کہ مجھے ایک مصنف نے انگریزی میں ایک کتاب معدنیات پر تبصرے کیلئے بھیجی۔ میں نے اسے پڑھا تو مجھے اس فن سے ذوق پیدا ہوگیا تھوڑے عرصے میں میں نے جواہرات کے پرکھنے کی مہارت حاصل کرلی جب میں ولایت گیا تو ایک لارڈ صاحب کی لیڈی کو میرے اس ذوق کا علم ہوگیا۔ وہ اپنے جواہرات کا ڈبہ اُٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔ میں ان کے گراں قدر ذخیرے کو دیکھتا رہا اور ان کی مناسب تعریف کرتا رہا آخیر میں انھوں نے کہا میرے پاس ایک نہایت اعلیٰ ہیرا تھا لیکن افسوس میں اُسے جدا کرنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے کہا آپ کیوں مجبور ہوگئیں انھوں نے کہا مجھے بتایا

گیا تھا کہ وہ میری قسمت سے موافق نہیں۔ اس سے اندازہ لگالو کہ وہ عورت بڑی اہل علم و تجربہ ہونے کے باوجود کتنے پست وہم میں گرفتار تھی اسی طرح بعض آدمی قانون میں بڑے ماہر ہوتے ہیں جب وہ کسی مذہبی مدعی کی بزرگی تسلیم کرلیتے ہیں تو عوام کو دھوکا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے قانون دان نے اس بزرگ کو مانا ہے تو ضرور اس میں کوئی بزرگی ہوگی حالانکہ وہ قانون دان مذہب کی حقیقت سے اتنا ہی کورا ہوتا ہے جتنا ایک عام انسان، اسی طرح اکثر لوگ مذہبی کتب پر عبور رکھتے ہوئے بھی صحیح مذہبی حس نہ رکھنے کے باعث فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

عرشی۔ علم جوتش کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ میرے ایک پنڈت دوست نے اپنے دوست سے جو بنارس میں اس فن کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ جاوید کی ولادت پر جنم پتری بنوائی میں اس کا قائل نہیں ہوں اس لیے میں نے اس پر کچھ توجہ نہ دی۔ چند دن گزرے بڑے بھائی صاحب نے وہ پتری نکال کر دیکھی اور مجھے بھی دکھائی اس میں علاوہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ بچہ فلاں سال کی عمر کو پہنچے گا تو اس کا والد لمبی بیماری میں مبتلا ہوجائے گا اور یہ بچہ خود اتنے سال تک معدہ (یا شاید جگر) کے مرض میں مبتلا رہے گا تعجب ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہورہی ہیں۔

عرشی آخر میں، میں یہ عرض کروں گا کہ مسلم کی تعریف میں کچھ فرمایئے۔

علامہ۔ انسان صحیح معنوں میں مسلم اسی وقت ہوتا ہے جب قرآن کے فرمائے ہوئے اوامر و نواہی اس کی اپنی خواہش بن جائیں یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور ذمائم و قبائح نفس سے گریزاں ہوں۔ بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمق روح سے اچھلیں قرآن اس کے حق میں ایک تلخ اور شفائی دوا نہ رہے بلکہ ایک لذیذ اور زندگی بخش غذا بن جائے ۔ منشائے الٰہی اور فطرت انسانی میں مغائرت نہ رہے یہی مطلب ہے فطرت اللہ التی فطرت الناس علیہا الخ

ش

راوی۔ علامہ کا گھر کھلا دربار تھا صلائے عام تھی جس کا جی چاہے آئے اور ملے وہ کسی سے ملنے میں کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ سلام کا جواب دایاں ہاتھ اُٹھا کر دیتے بغیر کسی گرم جوشی کے آؤ جی کہتے اور باتیں شروع ہو جاتیں آنے والوں کی شخصیت سے ڈاکٹر کو چنداں سروکار نہ تھا ہر شخص ان کیلئے چند خیالات کا مجموعہ تھا ہر شخص سے اس کی بساط کے مطابق باتیں کرتے۔ ڈاکٹر سعید اللہ ایم اے پی ایچ ڈی نے اپنے مضمون "اقبال کے ہاں ایک شام میں" علامہ سے اپنی باتیں نقل کی ہیں ان کا اقتباس یہ ہے

سعید اللہ آپ نے وقت کو تلوار کہا ہے اس سے کیا

مراد ہے ؟

ے اے خوش آں وقتے کہ سیف روزگار
باتوانا دستی ـــــ مابود یار

علامہ. وقت تلوار اس لئے ہے کہ انسان پیدا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے بڑھاپا آتا ہے پھر موت، یہ وقت کی تلوار ہے۔ وقت ایک طرح سے رحمت بھی ہے کہ گزر جاتا ہے تکلیف آئی اور گزر گئی۔

سعیداللہ. حدیث ہے دہر کو بُرا مت کہو، دہر خدا ہے اس کا کیا مطلب ؟

علامہ. (حقیقت Reality کا لازمی جزو دہر ہے)
پیرس میں برگساں سے جب ملاقات ہوئی تو اُسے گاوٹ کی شکایت تھی پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا نوکر کرسی کو چلاکر اِدھر سے اُدھر لے جاتا تھا میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اچھل پڑا۔ پوچھا یہ کون کہتا ہے؟ میں نے کہا ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ ... وقت کو ہم (eternal) مانتے ہیں مگر وہ بھی گزر رہا ہے۔ اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم (Now) کہتے ہیں وہ (eternal now) بن ہے۔
(Reality) دو معنوں میں لی جاسکتی ہے (Extensive) اور (Intensive)
مثلاً ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت

کرے اور ہر گردش میں اس کا رنگ بدل جائے وقت کو اسی طرح تصور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کر رکھی ہے ورنہ وقت تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت غالباً ایک خدا کو مانتا تھا مگر ایران میں "یزدان" اور اہرمن "کی ثنویت موجود تھی۔ ایک روشنی (دن) اور دوسرا تاریکی (رات) ان دونوں کا اجتماع (REALITY) ہے قرآن میں بار بار دن اور رات کا ذکر آتا ہے۔ ہندو تو وقت کو مایا کہتا ہے بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے اور اس کے حصّے کئے ہیں وقت کا (ATOMIC) تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔ وقت کا تصور (PERSONLITY) کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان (TRUTH) کا متلاشی تھا ایران BEAUTY کا اور عرب (GOOD NESS) کا اسلام نے تینوں کو (PERSONLITY) میں جمع کر دیا۔

سعید اللہ۔ ڈاکٹر صاحب تصوف کے مالۂ اور ما علیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

علامہ۔ تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے یونانی تصوف ایرانی تصوف ہندوستانی تصوف سب انحطاط قومی کی نشانی ہیں اسلامی تصوف بھی اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ اسلام کے اولین دور کے صوفی زہاد تھے اور تقویٰ ان کا مقصد تھا

بعد کے تصوف میں مابعد الطبیعات نظریات شامل ہو گئے۔
تصوف اب محض زہد نہیں رہا اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے "ہمہ اوست" مذہبی نہیں، یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں وہ اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔

وہ فلسفہ اور مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو بیکار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹیفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ تلاش کرتے ہیں گوشۂ چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط کی علامت ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے۔

شجرِ ممنوعہ میرا خیال ہے تصوف سے مراد ہے خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اناالحق کے معنی یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ انا ہی اصلی چیز ہے بندہ اگر خدا میں گم ہو گیا تو اس نے اپنی ہستی مٹا دی۔

سعیداللہ۔ تصوف کے سلسلہ میں کرامات دست غیب اور بخشش

کا ذکر ہی ہوتا ہے اس باب میں کچھ ارشاد فرمائیے۔

علامہ۔ یہ قصے سمجھ میں تو نہیں آتے مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ممکن ہے کبھی سمجھ میں آجائیں۔

دستِ غیب کے بارے میں مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا ہم تمہیں ایک وظیفہ بتاتے ہیں جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفے کو پڑھنا پانچ روپے تمہیں مل جائیں کریں گے۔ پیر صاحب سے رخصت ہوکر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا انھوں نے کہا گھر میں کچھ نہیں نہ آٹا نہ دال، وظیفہ پڑھا گیا تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ مولانا کا بیان ہے کہ انھوں نے اسی وظیفہ کو پڑھ کر تعلیم حاصل کی جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ بند کر دیا سرسید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی۔

تو مولانا نے سرسید سے کہا آپ نیچری ہیں مگر ہمارے وظیفے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

سعید اللہ۔ اور کرامت؟

علامہ۔ کرامت کے بارے میں، میں نے سنا ہے سرسید کی طرح ان کے باپ کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا کچھ علاج کیجئے سرسید کے والد نے سر آگے

بڑھایا پیر صاحب نے ان کی داڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی ۔

بخشش کے بارے میں بھی میں نے سنا ہے ایک سب انسپکٹر پولیس ہے وہ سانپ کے کاٹے کا دم کرتا ہے اور شفا ہو جاتی ہے کئی سو میل سے بھی دم کا اثر ہو جاتا ہے ۔

ث

راوی ۔ ایک شام علامہ کی خدمت میں الطاف حسین اور ایک پروفیسر حاضر تھے ۔

الطاف ۔ آپ کے خیال میں کون سی تفسیر بہترین ہے اکثر مفسرین قرآن کے مختلف الفاظ کے معانی اور ان کی صرفی و نحوی خوبیوں کے دکھانے میں اپنی تمامتر کوشش صرف کر دیتے ہیں ۔

علامہ ۔ ہاں ۔ مگر ایسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے

(گفتگو میں پروفیسر صاحب بھی شریک ہو جاتے ہیں)

پروفیسر ۔ ڈاکٹر صاحب آج تک کوئی کام یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوئی ۔

علامہ ۔ یہ خیال صحیح نہیں ۔ ممتاز قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اس لئے مسلط کر دیتی ہیں کہ ان میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکے اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے

آپ محض ایک قوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ

نہیں ہو سکتی مگر خیال فرمایئے۔ قرآن تو قیامت کا قائل ہے وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا ساری دنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہو گئی (۱)

ؕ

راوی۔ ایک اور موقعہ پر جب سید الطاف حسین علامہ کے یہاں حاضر ہوئے تو رسمی علیک سلیک کے بعد فرمایا۔

علامہ۔ ابھی تھوڑی دیر تک روسی ترک موسیٰ جاراللہ مجھ سے ملنے کیلئے آرہے ہیں وہ روس سے یہاں تک محض اس لئے آئے ہیں کہ مجھ سے اسلامی نظریہ سیاست و نظام حکومت کے بارے میں استفسار کریں کتنے افسوس کی بات ہے کہ روس سے یہاں تک انھیں ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکا جو ان کی ان امور میں تشفی کر سکتا۔

(موسیٰ جاراللہ کے آنے کے بعد پردے کے متعلق ضمنی بحث چھڑ جاتی ہے۔)

علامہ۔ فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں پردے میں رہے خدا کو دیکھنے بے حجاب نہیں، زندگی کو لیجئے اگرچہ اس کے آثار ہم دیکھ سکتے ہیں مگر بذات خود وہ ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ اس طرح آپ جس چیز کو بھی لیں جو کارِ تخلیق رکھتی ہو آپ دیکھیں گے کہ

(۱) ملفوظاتِ اقبال۔

وہ نقاب پوش ہے۔

موسیٰ جار اللہ۔ ہم لوگ بھی پردے کے قائل تو ضرور ہیں مگر حجاب رُو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ ہی قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی نص قطعی ہے۔

علامہ۔ نہیں۔ قرآن حجاب رُو کا قائل ہے

(بحث کا رخ بدلتا ہے)

موسیٰ جار اللہ۔ اسلام کے نظامِ سیاسی پر کچھ روشنی ڈالیے

علامہ۔ انسان ایک فرد یکتا گوہر یکتا ہے جس کی ترکیب روح اور مادے سے ہوئی ہے لہٰذا ہر وہ نظامِ حکومت جو محض انسان کی جسمی یا مادی ضروریات کو پورا کر سکے انسان کی تشفی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی نوعِ انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہو کر ارتقائی سیادت سے بہرہ در ہو سکتی ہے اسلام دین اور سیاست میں تفریق اسی لئے روا نہیں رکھتا۔ کہ انسان کی ہیئت ترکیبی ان ہر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی ہے اسلام کا نظامِ حکومت نہ تو جمہوریت ہے نہ ملوکیت، نہ ارسٹوکریسی اور نہ تھیاکریسی بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ہے (۱)

☆

راوی۔ ایک اور موقعہ پر سید الطاف حسین اپنے بعض طالب علم

(۱) ملفوظاتِ اقبال۔

دوستوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے تو یہ باتیں ہوئیں۔

الطاف۔ کچھ مسئلہ خیر و شر کے بارے میں ارشاد فرمائیے۔

علامہ۔ اپنے فلسفہ کے پروفیسر سے کیوں نہیں پوچھتے وہ کوئی کتاب بتا دیں گے۔

ایک طالب علم۔ ہم قرآنی اور اسلامی نظریہ خیر و شر کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔

علامہ۔ پہلے اس مسئلہ کی عام بحث سے واقفیت حاصل کرلو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا اور جو چاہے پوچھ لینا۔ ڈکنس نے ایک کتاب لفظ خیر سے مراد (The Meaning of Good) لکھی ہے وہ مفید مطلب رہے گی کتاب آسان ہے اگر کسی نے فلسفہ نہ بھی پڑھا ہو تو وہ بھی بلا دقت اُسے سمجھ سکتا ہے۔

الطاف۔ جنت کی نوعیت کیا ہے؟

علامہ۔ قرآن نے کئی قسم کی جنتیں بیان کی ہیں بعض مادی ہیں اور بعض روحانی، مادی جنتوں کے بیان سے تو آپ واقف ہوئے ہی ہوں گے مگر بعض بعض مقامات پر روحانی جنتوں کا بھی ذکر ہے۔

الطاف۔ قرآن نے روحانی جنت کی تعریف کس طرح کی ہے؟

علامہ "فیہا لغو ولا تاثیم"

یکے از حاضرین۔ قبلہ یہ جو سر، اور خان بہادر قسم کے بڑے بڑے لوگ ہیں یہی ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں اگر یہ نہ ہوں تو ہمیں نسبتاً کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

علامہ — زندگی اس طرح بسر کر دو گویا یوگ پیدا ہی نہیں ہوئے مجھے دیکھو میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا ۔ یہی لوگ میرے پاس کبھی کبھی آجاتے ہیں علیک سلیک ہو جاتی ہے ۔ اللہ اللہ خیر صلا ۔ انہیں محض بڑی بڑی تنخواہوں کا وصول کرنا ہی آتا ہے اس کے علاوہ یہ کچھ نہیں جانتے ۔

(نماز کا ذکر آنے پر)

یکے از حاضرین ۔ — اگر اُردو میں نماز پڑھ لی جائے تو کیا حرج ہے ؟

علامہ ۔ — عربی میں نماز بالکل سیدھی سادی ہے کوئی مشکل الفاظ نہیں لہذا نماز کے اردو ترجمے کا خیال نہیں پیدا ہونا چاہیئے ویسے کوئی اگر مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ اردو میں بھی کوئی حرج نہیں مجھے یاد ہے میری والدہ عربی الفاظ کا تلفظ صحیح نہ کر سکتی تھیں ۔ لہذا میرے والد ماجد انھیں اجازت دیا کرتے تھے کہ وہ بیشک اردو میں ہی نماز پڑھ لیا کریں

(گفتگو کا رُخ بدلنے پر)

الطاف ۔ — فوق البشر کی تعریف کیا ہے ؟

علامہ ۔ — ہر صحیح مومن فوق البشر ہے اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں ۔

الطاف ۔ — ہیرو کی ایک تعریف کارلائل نے بھی کی ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

علامہ ۔ — ہیرو کی تعریف یہ ہے ۔

وہ انسان جس کے اعمال و افعال نوع انسانی کیلئے

چشمہ ہائے زندگی جاری کرنیوالے ہوں۔

الطاف۔ اور ہیرو ورشپ

علامہ۔ شخصیت پرستی ہندو قوم کی امتیازی صفت ہے مگر اسلام اس کے خلاف ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے دلی میں ایک تقریب میں وائسرائے کے علاوہ ہندوستان کی ریاستوں کے فرمانروا اور دیگر اکابر و زعمائے ملک کا ایک جم غفیر رونق افروز تھا۔ گاندھی اس مجمع میں داخل ہوئے تو تقریباً سب لوگ اس کی تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کے سامنے سے گزرتا وہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوتا مگر جب میرے سامنے سے گزرا تو میں بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اس کے بعد وائسرائے نے چند لوگوں کی دعوت کی جن میں میں بھی مدعو تھا دعوت کے بعد وائسرائے نے مجھ سے تنہائی میں کہا۔

میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ میں نے کہا پوچھئے، کہنے لگا کہ تقریب میں مہاتما گاندھی کی تعظیم کیلئے سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ میں نے سر شفیع کو بھی اُٹھتے دیکھا مگر آپ اپنی جگہ بدستور قائم رہے اس کا کیا سبب ہے میں نے کہا غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں کئی مسلمان ہیں جن کے باپ دادا ہندو تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے آبا و اجداد کی صفت سے متصف ہیں الحمد اللہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔

(سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے)

اسوۂ رسول شخصیت پرستی کی مخالفت کا بہترین مظہر ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کی جماعت کے پاس کبھی جاتے تو وہ آپ کو دور سے دیکھ کر تعظیم کیلئے کھڑے ہو جایا کرتے آپ نے ایک دو مرتبہ دیکھا اور تیسری مرتبہ منع فرمایا خیال کیجئے وہ ہستی جس کی خاطر اس کے متبعین اپنے خون کا آخری قطرہ گرا دینا دینی و دنیوی سعادت مندی کا واحد ذریعہ تصور کرتے تھے اسے اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی اس کی خاطر اُٹھ کھڑا ہو۔

ایک اور واقعہ یاد آگیا کہتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، شام کا کھانا کھانے کے بعد صحابہ کرامؓ کے ہمراہ عام طور پر صحرا میں برائے سیر جایا کرتے تھے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ جب آپ مصروف سیر تھے تو چند غزال آکر پاؤں کو چومنے لگے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔

" قبلہ دو عالم، جانوروں کو تو یہ سعادت نصیب ہو مگر ہم اس کیلئے ہمیشہ ترستے رہیں "

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

" اسجدو اللہ اکبر و اخو الکم "

یعنی بزرگوں کی محض واجبی تعظیم کیا کرو سجدے کے لائق صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ بخدا دنیا بھر کی ادبیات میں اس سے بہتر فقرہ مجھے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

راوی۔ اس واقعہ کے شاہد سید الطاف حسین لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی آتے ہی علامہ پر رقت طاری ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد دہراتے ہوئے وہ اشکبار تھے اور ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی (۱)

٭

راوی۔ ممتاز حسن کے علاوہ دوسرے ملاقاتی بھی شریکِ محفل تھے ادب سے بات نکلی تو اخلاق تک پہنچی۔

یکے از حاضرین۔ خدا نے ضرورت سے زیادہ انسان پیدا کر دیئے ہیں جن میں سے اکثر کی زندگی فضول اور بے معنی ہے۔

علامہ۔ (بڑے پُرجوش انداز میں) ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقبل حیثیت رکھتا ہے اور کسی کا وجود بیکار نہیں ہے لیکن اس حقیقت کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ہمیں کسی شخص سے اچھی طرح سابقہ پڑے اور ہم اُسے قریب سے دیکھیں۔

٭

راوی۔ علامہ کے پاس ایک انگریز جنرل اکثر آتا تھا اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات کرتا تھا۔

---

(۱) ملفوظاتِ اقبال ۲۵۰

ایک روز کہنے لگا۔

جرنیل۔ مجھے قرآن بہت پسند ہے اکثر میرے مطالعے میں رہتا ہے۔

علامہ۔ آپ نے قرآن کریم میں ایسی کون سی چیز دیکھی جو آپ کو اس قدر پسند آئی۔؟

جرنیل۔ قرآن میں دلیری اور مردانگی کی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر انسان میں جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

☼

راوی۔ محمد دین فوق علامہ کے دوست اور مداح تھے۔ اہل قلم میں شمار تھا کشمیری برادری کیلئے بہت کچھ کیا ان کے جوان بیٹے کا انتقال ہوا تو علامہ نے تعزیت کی۔

علامہ۔ (رسمی افسوس کے بعد) مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کی خبر موصول ہوئی ایک منٹ تامل کیا پھر طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " ما بہ رضائے او راضی ہستیم بیا یدکہ کار خود بکنیم (ہم اس کی رضا سے راضی ہیں آؤ کہ ہم اپنا کام کریں) یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خداتعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔

راوی۔ میکلوڈ روڈ کی کوٹھی کے قیام کا ذکر ہے کہ سیّد امجد علی کے بھائی کی شادی میں علامہ مدعو تو تھے لیکن جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا علامہ حسبِ معمول دھوتی بنیان میں ملبوس مزے سے کش لے رہے تھے کہ سید وحید الدین پہنچے۔

علامہ۔ کیوں بھئی کیسے آنا ہوا؟

وحید الدین۔ شادی کی تقریب میں آپ کے نہ پہنچنے کا سب کو ملال ہے میں وعدہ کر کے آیا ہوں کہ آپ کو اپنے ہمراہ ضرور لاؤں گا۔

علامہ۔ وعدہ کر کے آئے ہو۔؟

وحید الدین۔ آپ کی شفقت پر کچھ ایسا اعتماد تھا کہ وعدہ کر بیٹھا ہوں۔

علامہ۔ وعدہ کا پاس کرنا ضروری ہے چلو میں چلتا ہوں۔

راوی۔ اس تقریب میں علامہ اور دوسرے بزرگ جس کمرہ میں تشریف فرما تھے اس میں ریچھ کی کھال پڑی ہوئی تھی سیّد واجد علی شاہ نے جگہ کو کشادہ کرنے کیلئے اسے کمرہ کے ایک خالی کونے میں اُٹھا کر پھینک دیا۔

علامہ۔ پہلے اِسے جان سے مارا پھر اِسے ذلیل کرنے کے در پے ہو۔

⁂

راوی۔ ۱۹۰۸ء میں ولایت سے آنے کے بعد علامہ گورنمنٹ

کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے تھے ناظم تعلیمات کے ایماء پر
ان کے مقدمے ان کے کالج سے آنے کے بعد سنے جاتے
تھے دو ڈھائی سال کے بعد انھوں نے یکایک ملازمت چھوڑ
دی۔ دوست احباب کا خیال تھا کہ انھوں نے اس بندھی
ٹکی معقول آمدنی کو ٹھکرا کر غلطی کی ہے یہ روپے وہ گھر
بھیج دیا کرتے تھے وکالت سے گھر کا کام چلتا تھا۔ اب سارا
بوجھ وکالت پر پڑتا تھا اور تنگی کا اندیشہ تھا اس خیال سے
علی بخش کو تشویش ہوئی اس لئے اس نے پوچھا۔

علی بخش۔ شیخ صاحب! آپ نے سرکاری نوکری کیوں چھوڑ
دی۔ اچھی آمدنی کی صورت تھی۔

علامہ۔ علی بخش! آمدنی کی بات نہیں انگریز کی ملازمت
میں بڑی مشکلیں ہیں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے
دل میں کچھ باتیں ہیں جنھیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں
مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں
بالکل آزاد ہوں جو چاہوں کہوں شاید یہ پھانس جو مدت سے
میرے دل میں کھٹکتی ہے اب نکل جائے۔

٭

راوی۔ علامہ کے گلے میں تکلیف تھی ایک ڈاکٹر دیکھنے آیا
چند دوائیں تجویز کیں۔

ڈاکٹر۔ اس مرض میں پرہیز بہت ضروری ہے . . .

پرہیز کیجئے۔

علامہ۔ لیکن اگر میں آپ کی ہدایات پر عمل نہ کروں تو ؟

ڈاکٹر۔ تو خدانخواستہ آپ کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی۔

علامہ۔ کیا انسان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا ہے جو موت کے خطرہ سے خالی ہے۔

ڈاکٹر۔ (حیران ہوکر) آپ کی سی طبیعت کا مریض میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

ؒ

راوی۔ ایک مقامی ہندو کالج کے چند طلبہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

طلبہ۔ آپ سب کچھ مسلمانوں ہی کیلئے لکھتے ہیں ہمارے لئے کچھ نہیں لکھتے۔

علامہ۔ تم نے میری کون سی کتاب پڑھی ہے۔

طلبہ۔ بانگِ درا۔

علامہ۔ (بانگِ درا منگا کر) اس میں سے ان نظموں کو گنو جنھیں تم خالص اسلامی کہتے ہو

طلبہ۔ یہ تو کچھ زیادہ نہیں۔

علامہ۔ اب تم اپنے ظرف کا اندازہ لگاؤ۔۔۔۔ یہ تو محض تمہارے سوال کا جواب تھا اب حقیقت سنو۔ ایک شخص کی اپنی ماں سخت بیمار ہے جان بہ لب ہے کیا اس حالت میں تم اس

سے توقع رکھتے ہو کہ وہ اُسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی تیمار داری میں مصروف ہو جائے۔

طلبہ۔ ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔

علامہ۔ میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے میں اِسے اِس حالت میں چھوڑ دوں تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کے مترادف نہ ہوگا۔

☆

راوی۔ ایک روز علامہ دردِ گردہ میں مبتلا تھے اور بلند آواز سے بیدل کی غزل سکون حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہے تھے اور بار بار یہ مصرعہ دہراتے تھے۔

علامہ۔ ع حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
حرص قانع نیست بیدل ....

منشی طاہر الدین (اندر آتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب اب طبیعت کیسی ہے؟

علامہ۔ حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں ...

☆

راوی۔ پروفیسر عبد الحمید حاضرِ خدمت تھے۔ دورانِ گفتگو کہنے لگے۔

عبد الحمید۔ یوروپین زبانوں میں آپ کا کلام ترجمے کی صورت

میں شائع ہوجائے تو نہ صرف خود یوروپ کے حق میں مفید ہوگا۔ بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہل یوروپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ بھی بہت حد تک دور ہوجائیں گی۔

آپ ترجمے کی اجازت ضرور دیں۔

علامہ۔ میرا کلام باقی رہے گا۔ ترا جسم آہستہ آہستہ ہوجائیں گے۔

ختم شد